سُورۂ فاتحہ مکّی ہے[1]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اللہ نہایت رحمت والے بے حد رحم فرمانے والے کے نام سے شروع

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١ الرَّحْمٰنِ

سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو پرورش فرمانے والا ہے سب جہانوں کا نہایت رحمت والا

الرَّحِيْمِ ۝٢ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٣ اِيَّاكَ

بے حد رحم فرمانے والا ہے مالک روزِ جزا کا ہے (اے اللہ ہمیں توفیق

نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝٤ اِهْدِنَا

دے کہ) ہم تیری ہی بندگی کریں اور تجھی سے مدد چاہیں ہے (ہمیشہ) ہمیں

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝٥ صِرَاطَ

سیدھی راہ چلا ہے اُن لوگوں کی

الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ

راہ جن پر تُو نے انعام فرمایا ہے نہ اُن کی جن پر (تیرا)

عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝٦

غضب ہُوا اور نہ گمراہوں کی ہے

---

[1] یہ سُورت مکّی ہے اور بعض کے نزدیک مکّی بھی ہے اور مَدَنی بھی اِس قول کے مطابق یہ سُورت نماز فرض ہونے کے وقت مکّہ میں نازل ہُوئی اور تحویلِ قبلہ کے مَوقع پر مدینہ میں بھی اُس کا نزول ہُوا بعض کُتبِ تفاسیر میں اِس سُورت کے حسبِ ذیل ستائیس نام وارد ہیں: ۱۔ الفاتحہ ۲۔ فاتحۃ الکتاب

۳۔ فاتحۃ القرآن ۴۔ اُمّ القرآن ۵۔ القرآن العظیم ۶۔ اُمّ الکتاب ۷۔ الکنز ۸۔ الوافیہ ۹۔ الکافیہ ۱۰۔ الاساس ۱۱۔ الحمد ۱۲۔ الشکر ۱۳۔ الدُعا ۱۴۔ المناجات ۱۵۔ السوال ۱۶۔ تعلیم المسئلہ ۱۷۔ التفویض ۱۸۔ الرُقیہ ۱۹۔ الشفاء ۲۰۔ الشافیہ ۲۱۔ الصلوٰۃ ۲۲۔ النُور ۲۳۔ السبع المثانی ۲۴۔ البسملہ ۲۵۔ علم الیقین ۲۶۔ عین الیقین ۲۷۔ حق الیقین۔ ان تمام ناموں کے معانی کا اِس سُورت میں پایا جانا وجہِ تسمیہ ہے۔

سُورتِ فاتحہ میں بالاتفاق سات آیتیں ہیں۔ جن عُلماء کے نزدیک بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سُورتِ فاتحہ کی مستقل آیت ہے اُن کے نزدیک اَنعَمتَ عَلَیہِم پر آیت نہیں اور جو عُلماء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو سُورتِ فاتحہ کا جُزو یا اسے مستقل آیت تسلیم نہیں کرتے اُن کے نزدیک اَنعَمتَ عَلَیہِم پر آیت ہے۔

۲۔ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ۔ بالاتفاق جُزو قرآن ہے لیکن وُہ کسی سُورت کی ابتداء میں جُزوِ سُورت نہیں بلکہ ایک جُداگانہ آیت ہے۔ سُورۃ النمل میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جُزوِ آیت ہے۔ پُوری آیت نہیں۔ سُورتِ برأت کے سوا ہر سُورت کی ابتداء میں بسم اللہ لکھی جاتی ہے جس سے حُصولِ برکت کے علاوہ دو سورتوں کے درمیان فصل کی علامت بھی قائم ہو جاتی ہے۔ ہر اچھے اور اہم کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنا مُوجبِ خیر و برکت ہے۔ احناف کے نزدیک وضُو سے پہلے اور نماز کی ہر رکعت میں سُورت فاتحہ سے قبل بسم اللہ پڑھنا سُنت ہے۔

اِمام شعبی اور امام اعمش سے مَروی ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے پہل خطوں کے سرنامے پر باسمِکَ اللّٰھُمَّ لکھوایا کرتے تھے۔ جب سُورتِ ہُود میں بسم اللہ مجرٰھا کا نزُول ہوا تو بسم اللہ تحریر فرمانا شروع کیا۔ پھر جب قُلِ ادعُوا اللہَ اَوِ ادعُوا الرحمٰن نازل ہوئی تو بسم اللہِ الرحمٰن سے شروع فرماتے۔ اِس کے بعد جب سُورتِ نمل میں اِنّہٗ بسم اللہِ الرحمٰن الرحیم نازل ہوئی تو بسم اللہِ الرحمٰنِ الرحیم کا لکھنا شروع ہو گیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعُود رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ جو شخص اُن فرشتوں کی گرفت سے بچنا چاہے جنہیں زبانیہ کہتے ہیں، وُہ بسم اللہ بکثرت پڑھے۔ بسم اللہِ الرحمٰنِ الرحیم کے

اُنّیس حُروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر حرف کو دوزخ کے فرشتے کی گرفت سے بچنے کے لیے ڈھال بنا دیتا ہے[1] بسم اللہ الرحمن الرحیم کا جو حرف اللہ تعالیٰ کے اسمائے حُسنیٰ میں سے کسی اسمِ پاک کی ابتدا میں پایا جاتا ہے۔ وہ حرف اُس اسمِ الٰہی کے لیے مفتاح ہے، جیسے میم اللہ تعالیٰ کے اسمِ مَلِک اور مَالِک کی اور الف اللہ تعالیٰ کے اسم اللہ کی کُنجی ہے۔ خُلاصہ یہ ہے کہ جن اسمائے الٰہیہ کا پہلا حرف بسم اللہ کے حروف میں پایا جاتا ہے اُن کے وُہ تمام خزانے بسم اللہ کے حروف سے عارفِ کامل پر کُھل جاتے ہیں۔ جن کے لئے حروفِ بسم اللہ مفتاح ہیں[2]

افعال کی اصل اسماء ہیں اور اسماء کی اصل صفات اور صفات کی اصل ذات ہے۔ اِس حقیقت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ذات و صفات اور اسماء و افعالِ الٰہیہ کی مَعرفت کا خزانہ بسم اللہِ الرحمٰنِ الرحیم ہے اور نُورِ مَعرفت سے دیکھنے والا خالق کے حُسن و جمال اور اُس کی مخلوق کا مُشاہدہ بسم اللہِ الرحمٰنِ الرحیم کے اُنّیس حروف میں کرتا ہے۔ عارفین کا کہنا ہے کہ سُورۃِ فاتحہ کے مضامین کا مجمُوعہ بسم اللہِ الرحمٰنِ الرحیم ہے اور پُوری بسم اللہ کا خُلاصہ بائے بسم اللہ میں مُضمَر اور "با" کی حقیقت اُس کے نقطے میں پائی جاتی ہے[3]۔ اور اَللّٰہ کی قُدرت کے آگے یہ کوئی دُشوار نہیں۔ دیکھئے عالمِ کبیر ایک اِنسان میں شامل ہے۔ اسی لئے اُسے عالمِ صغیر کہا جاتا ہے[4]۔ اور انسان کی حقیقت ایک نفسِ انسانی میں مندرج ہے۔ ایک عظیم الشان درخت کی پُوری حقیقت اگر ایک تخم میں پائی جا سکتی ہے تو ان تمام حقائق کا ایک نقطے میں پایا جانا کیوں ممکن نہیں، نیز مُرغی کے انڈے کے ایک قلیل حصّے میں پُورے مُرغ کی حقیقت مَوجُود ہوتی ہے۔ درحقیقت بائے بسم اللہ کا یہی ایک نقطہ ہے جس سے 'الف' ظاہر ہُوا اور اس کے بعد 'ی' تک تمام حروفِ ہجا اِسی الف کی مختلف شکلوں سے نمودار ہُوئے اور ان حروفِ ہجا سے ہر کلام وجُود میں آیا۔ لفظ اللہ اسمِ ذات ہے، جس کے معنیٰ ہیں ذات واجب الوجُود، جو مجمع ہو جمیعِ صفاتِ کمالیہ کا[5]۔ اس کا اِطلاق جاہلیت یا اسلام میں معبُودِ حق ذات واجب الوجُود کے سوا کسی پر نہیں ہُوا[6]۔ اِسی لئے

یہ تثنیہ اور جمع سے بھی پاک ہے، بخلاف لفظ اِلٰہ کے، کہ اسلام میں اس کا مصداق معبودِ حق کے سوا کوئی نہیں لیکن مشرکین نے اپنے باطل معبودوں کو الٰہ سے تعبیر کیا، جس کی تردید اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں "وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰه" (آلِ عمران آیۃ ۶۲) کے ساتھ فرمائی۔

لفظ رَحْمٰن۔ رَحْمَةٌ سے مبالغہ کا صیغہ ہے، جس کے معنیٰ ہیں ایسی بے پایاں رحمت والا جس سے زائد کا تصور ممکن نہیں، جو دُنیا و آخرت دونوں کو محیط ہے اسی لئے رَحْمٰن باوجود وصف ہونے کے عَلَم کی طرح ہے اور اس کا اِطلاق اللہ کے سوا کسی پر جائز نہیں۔ لفظ رَحِیْم بھی مبالغہ ہے، مگر اس سے مُراد عالمِ آخرت میں بے پایاں رحمت فرمانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دُنیا کو دار العمل اور آخرت کو دار الجزا بنایا۔ دار العمل کی سب نعمتوں میں ایمان اور عملِ صالح کی توفیق سب سے بڑی نعمت ہے اور دار الجزا میں سب سے عظیم ترین نعمت نیکی پر دائمی اجر و ثواب ہے۔ رَحِیْم کی رحمت ان سب نعمتوں کو محیط ہے۔

۳ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی تعلیم کے لئے اس سُورت کو نازل فرمایا کہ ہماری بارگاہ میں یُوں عرض کرو کہ سب تعریفیں تمام جہانوں کے پروردگار ہی کے لئے ہیں، جو رحمٰن و رحیم ہے اور قیامت کے دِن کا مالک۔ حَمْد: اختیاری خُوبی پر تعریف و ثناء کو کہتے ہیں۔ یہاں اختیار سے مُراد اِستقلال ذاتی ہے یعنی اللہ تعالےٰ جمیع صفاتِ کمالیہ اور تمام خُوبیوں سے مُستقلاً بالذات مُتصف ہے۔ غیر اللہ میں مُستقلاً کسی خُوبی کا پایا جانا ممکن نہیں بلکہ عالمِ امکان میں جو خُوبی جس میں پائی جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہُوئی ہے۔ لہٰذا کائنات میں جس کی جس خُوبی کی تعریف کی جائے گی وہ اللہ تعالیٰ ہی کی تعریف ہوگی۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ ہر خُوبی اور کمال باوجُودیکہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے لیکن اللہ تعالےٰ کی عطا سے مخلُوقات میں کسی حُسن و خُوبی کا پایا جانا شرک نہیں بلکہ وُہ حُسنِ خداوندی اور کمالِ الٰہی کا ظہُور ہے، جسے اللہ تعالیٰ کے حُسن کی دلیل کہا جائے گا۔ شرک اُسی وقت ہوگا جب کسی

خوبی اور کمال کو ذاتی اور استقلالی طور پر غیر اللہ کے لئے تسلیم کیا جائے۔

۴۔ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لفظ رَبّ، مصدر بمعنیٰ مُرَبّی ہے۔ اَلْعٰلَمِیْن عالَم کی جمع ہے۔ 'ال' استغراق کے لئے ہے۔ عالَم، عَلَم سے ماخوذ ہے، جس کے معنیٰ ہیں نشانی۔ اللہ کے سوا جو کچھ ہے ہر چیز اُس کی نشانی ہے۔ سب کا خالق، مُوجِد اور صانع اَللّٰہ ہی ہے۔ ہر مصنُوع اور مخلُوق اپنے صانع اور خالق کی نشانی ہے۔ اِس لئے ماسوی اللہ کا ہر فرد عالم قرار پایا اور اُسے جمع کے صیغہ سے تعبیر فرمانا اُس کے اصناف و انواع کے اعتبار سے ہے، اِسی بنا پر بعض نے اٹھارہ ہزار، بعض نے اَسّی ہزار اور بعض نے ایک ہزار عالَم شمار کئے مگر مناسب یہی ہے کہ اسے علم الٰہی کی طرف مفوّض کر دیا جائے۔

اَحناف کے نزدیک سُورۃِ فاتحہ کی یہ پہلی آیت ہے اور اسی سے اپنے مالکِ حقیقی کے حضُور بندے کی دُعا کا آغاز ہوتا ہے۔ دُعا کی ابتدا کے لئے یہ کلمات کس قدر موزوں اور مُناسب ہیں، فِطرتِ سلیمہ گواہی دیتی ہے کہ ان سے بہتر کلمات بندے کی دُعا کے لئے تصوّر میں نہیں آسکتے۔ اپنے معبُود کی حمد و ستائش اُس کی ذات و صفات کا ذکرِ جمیل اس دُعا کے حُسن و جمال کا چمکتا ہُوا آئینہ ہے۔ دیگر مذاہب میں مَعبُود کا تصوّر ان تمام مَحاسِن سے خالی ہے۔ اقوامِ عالَم نے رَبّ العٰلمین کی بجائے اپنے ذاتی اور قومی معبُودوں کو رب کہا، لیکن قُرآن نے رب العٰلمین فرما کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ عبادت اور دُعا کے لائق وہی رب ہے جو کِسی فرد یا قوم کا محض تسلیم کیا ہُوا رب نہ ہو بلکہ اُس کی رُبوبیت فی الواقع کائنات کے ہر ذرّے کو اپنے دامنِ ربوبیت میں لئے ہُوئے ہو اور اُسی کی بارگاہ ہے جس کی طرف متوجہ ہو کر موجودات کے ہر فرد کو جُھکنا اور اپنی حاجات کو طلب کرنا ہے۔

تربیت کرنے والے کو مُرَبّی کہتے ہیں اور تربیت کے معنیٰ ہیں ہر چیز کو اُس کی اِستعداد کے مُطابق جو اللہ تعالیٰ نے اُس کے لئے اَزل میں مُقدّر فرما دی ہے، آہستہ آہستہ اُس کے درجۂ کمال تک پہنچا دینا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس کی تربیت اور رُبوبیت تمام عالمِ اکوان

کے ہر ذرّے کو مساوی طور پر محیط ہے اور یہ حقیقت بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ ہر نوعِ مخلوق کی استعداد یکساں نہیں، مثلاً حیوانِ محض کی استعداد انسان کی استعداد سے مختلف ہے۔ اسی طرح حیوانوں کے مختلف انواع و اصناف میں ہر ایک کی استعداد کا تفاوت اظہر من الشمس ہے۔ یہی حال تمام جمادات و نباتات، اجسام و عناصر اور جواہر و اعراض کا ہے۔ کہ ان میں سے ہر جنس و نوع اور صنف کی استعداد دوسرے سے مختلف ہے۔ ایسی صورت میں نظامِ ربوبیت کا تقاضا یہ ہوگا کہ ہر چیز کو اس کے اسی درجۂ کمال تک پہنچا دیا جائے جو اس کی استعداد کے مطابق اللہ تعالیٰ کے ازلی علم و حکمت اور مشیت میں ہے۔ تشفیہ بعض لوگوں نے نظامِ ربوبیت کے حسین پردہ میں سوشلزم کو چھپانے کی سعی ناکام کی، لیکن کتاب و سنت کی روشنی میں نظامِ ربوبیت وہ فطری نظام ہے جس کے تحت رب العلمین نے بحر و بر کے تمام جانداروں کی ہر نوع کے تمام افراد کا رزق پھیلا دیا۔ اور ان کی جملہ ضروریاتِ معاش ان کی طبیعتِ نوعیہ کے تقاضوں کے مطابق مساوی طور پر پیدا کر دیں اور ہر فرد کی فطرت میں اس کے لوازماتِ حیات اور رزق حاصل کرنے کی ایک قوت و استعداد اور صلاحیت رکھ دی اور اسے بروئے کار لانے کیلئے اسباب بھی بلا امتیاز مہیا فرما دیئے۔ بس یوں کہئے کہ رب العلمین نے کمال عدل کے ساتھ ہر ایک کے لئے رزق پیدا کیا اور اسے اپنا رزق حاصل کرنے کی قوت و صلاحیت بھی عطا فرمائی۔ ربوبیت کا یہ نظام تمام انواع کائنات کے افراد میں کارفرما ہے۔ جس میں کسی کے حق میں ذرہ بھر کمی بیشی یا ناانصافی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہی مساوات ہے اور اسی کا نام ہے نظامِ ربوبیت۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ موجوداتِ عالم میں ہر نوع کے افراد کے طبعی تقاضے بھی دوسری نوع کے افراد کے طبعی تقاضوں سے جداگانہ ہیں۔ اسی طرح ان کی قوت و استعداد اور ان کے احوال و ضروریاتِ زندگی اور رزق میں بھی تفاوت ہے۔ دیکھئے پرندوں کے لئے فضا پیدا کی اور انہیں ہوا میں اڑنے کے لئے قوتِ پرواز عطا فرمائی اور اسے بروئے کار لانے کے لئے انہیں بازو اور پر عطا فرمائے۔ دانہ چگنے کے لئے انہیں مناسب چونچ دی تاکہ اس کے ذریعے وہ زمین

پر پھیلا ہُوا اپنا رزق حاصل کر سکیں۔ بعض پرندے شکاری ہیں، اُنہیں شکار کے لائق پنجے عطا فرمائے جن کے ذریعے وُہ آسانی کے ساتھ شکار کر کے اپنا رزق حاصل کر سکتے ہیں۔ گھاس کھانے والے جانوروں کو زمین پر چلنے کے لئے چار پاؤں دیئے اور اُن میں ایسی قوت و استعداد رکھی کہ زمین پر چل کر صرف مُنہ کے ذریعے اپنا رزق بسہولت حاصل کر لیں۔ درندوں کی غذا گوشت ہے۔ جیسے وہ جنگلوں، پہاڑوں میں پائے جانے والے جانوروں کو شکار کر کے حاصل کرتے ہیں۔ رب العلمین نے ان درندوں میں ایسی قوت پیدا فرمائی جو شکار کرنے کے لئے ضروری ہے پھر اُسے بروئے کار لانے کے لئے درندگی کے جسمانی آلات اُن میں پیدا فرمائے، جن کے ذریعے نہایت آسانی سے شکار کر کے وہ اپنا رزق حاصل کر سکیں۔ بلّی پر نظر ڈالئے، اُس کے پاؤں میں گوشت کی نرم گدیاں پیدا فرما دیں تاکہ جب وُہ اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے حشرات الارض وغیرہ میں سے کسی جاندار کی طرف چلے تو اُس کے چلنے کی آواز پیدا نہ ہو، جسے سُن کر وہ جاندار بھاگ جائے۔ اور بلّی اپنے رزق سے محروم ہو جائے۔ اِس کے برخلاف گھوڑے کو سُم عطا فرمائے تاکہ وُہ اپنی ٹاپ کی آواز ہر ایک کو دُور سے سُنا دے اور سُننے والے اُس کی پامالی سے محفوظ رہ سکیں اور رزق کی تلاش میں دوڑ بھاگ کے لئے وُہ سُم اس کے مُعین و مددگار بھی ثابت ہوں مچھلیوں کے لئے پانی بنایا۔ پانی میں رہنے کے لئے اُنہیں صلاحیتیں عطا فرمائیں، اُن کے جسم کی ساخت ایسی بنائی کہ وہ نہ خشکی میں رہ سکیں نہ ہوا میں پرواز کر سکیں بس پانی ہی اُن کا مُستقر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کا جسم پانی ہی کے مُناسب پیدا فرمایا۔ ہاتھ پاؤں اور بازوؤں کی بجائے اُن کے جسم میں ایسے اعضا بنائے جو چھوٹے چھوٹے پروں کے مُشابہ ہیں جو صرف پانی میں تیرنے کے لئے ہیں۔ مچھلیاں اُن کے ذریعے ایسی تیزی سے پانی میں تیرتی ہیں کہ اُنہیں تیرتے ہوئے پکڑنا آسان نہیں۔ اُسی پانی میں ان کا مخصوص رزق پیدا کیا اور اُسے حاصل کرنے کے لئے خاص قسم کی قوت و استعداد اُنہیں عطا فرمائی جو دیگر انواعِ حیوانات سے بالکل مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پانی کے جانور پانی سے الگ خشکی یا ہوا میں زندگی نہیں گذار سکتے اور اِسی

طرح ہوا اور خشکی کے جانور پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے کیونکہ ہر ایک کی طبیعت نوعیہ دوسرے سے مختلف ہے۔ اِسی لیئے طبعی رزق بھی سب کا جداگانہ ہے اور اُسی بنا پر ہر نوع کے افراد کی قوت و استعداد اور اُسے بروئے کار لانے کی صلاحیتیں بھی قطعاً مختلف ہیں۔

حیوانات کے علاوہ نباتات کو بھی اِسی نظامِ ربوبیت کے ساتھ آپ مربوط پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی گھاس وغیرہ کے اندر اُن کی غذا حاصل کرنے کی قوت و استعداد پیدا فرمائی جس کے ذریعے وہ اپنی غذا حاصل کر کے سرسبز و شاداب نظر آتے ہیں۔ مثلاً پودوں اور درختوں کی جڑیں زمین میں پھیلا دیں، جن کے ذریعے وہ اپنی غذا زمین سے حاصل کرتے ہیں۔ پانی، مٹی، کھاد وغیرہ جو کچھ اُن کی غذا ہے اِنہی جڑوں کے ذریعے اُنہیں پہنچتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ عمل ایک خاص قوت و استعداد کے ذریعے پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ جس کی صلاحیت ان درختوں اور پودوں میں قدرت نے رکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوت و استعداد انواعِ حیوانات سے بالکل مختلف ہے۔ نباتات کے علاوہ جمادات، عناصر، جواہر و اعراض بلکہ جملہ موجودات ارضی و سماوی سب نظامِ ربوبیت کے تحت ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ صرف بعض کا رب نہیں بلکہ وہ رب العلمین ہے اور اُس کی ربوبیت ماسوی اللہ کے ہر ذرہ کو محیط ہے۔ ان تمام مخلوقات کی بقا اور تربیت کے لیئے جو اسباب رب العلمین نے مخلوق فرمائے ہیں وہ ہر ایک کو اُس کے حسبِ حال پہنچ رہے ہیں اور ہر ذرہ میں اُنہیں حاصل کرنے کی قوت و استعداد موجود ہے جس کے ذریعے اُسے اپنا مقررہ حصہ حاصل کرنے کی طرف راہ ملتی ہے۔ اِسی حقیقت کو اس آیت میں بیان فرمایا: وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ط (فرقان، آیت ۲) اور اُس نے ہر چیز پیدا کی پھر ہر ایک کے لیئے (اس کے حسبِ حال) ایک خاص اندازہ مقرر فرمایا۔ اسی اندازہ میں اس کے اسبابِ بقا شامل ہیں جنہیں حاصل کرنے کے لیئے ہر چیز میں فطری استعداد رکھ دی اور اسی کو ہدایت سے تعبیر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہوا: رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ط (طٰہٰ، آیت ۵۰) "ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کی ساخت عطا فرمائی پھر

اُس پر (اسبابِ معیشت کے حصُول کی) راہ کھول دی۔"

عقلِ سلیم کی رَوشنی میں ذرا غور و فکر سے کام لیں تو آپ یقیناً آگ، پانی، ہَوا، مٹّی اور جمیع کائناتِ ارضی و سماوی کو مخصُوص خلقت، مقرّرہ اندازے اور فطری رہنمائی کے اسی قانُونِ رُبوبیت میں مَربُوط اور منسلِک پائیں گے۔ اِنسان جو اشرف المخلُوقات اور جامع حقائقِ کائنات ہے۔ اسی نظامِ رُبوبیت میں شامِل ہے۔ صِرف یہی نہیں بلکہ انسان کے گرد و پیش تمام کائنات اور مَوجُوداتِ ارضی و سماوی کے نظام کا مُنتہا نوعِ انسان ہی ہے۔ اسی لِئے فرمایا: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۔ (سُورۃ بقرہ، آیۃ ۲۹) "وہی ہے جس نے تمہارے لِئے پیدا کیا، وُہ سب کچھ جو زمین میں ہے۔" وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ ۔ (سورۃ ابراہیم، آیۃ ۳۳) "اور تمہارے لِئے سُورج اور چاند مُسخّر کیے جو برابر گردش کر رہے ہیں۔" اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۔ (سورۃ لقمان، آیۃ ۲۰) "کیا تُم نے نہ دیکھا کہ اللہ نے تمہارے لِئے مُسخّر کر دیا اُن سب چیزوں کو جو آسمانوں میں اور جو زمینوں میں ہیں۔" اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ ۔ (سُورۃ جاثیہ، آیۃ ۱۲) "اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لِئے مُسخّر کر دیا سمندر کو، تاکہ اُس کے حُکم سے اُس میں کشتیاں چلیں۔" وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا ۔ (سورۃ النحل، آیۃ ۱۴) "اور وہی ہے جس نے تمہارے لِئے دریا کو مُسخّر کر دیا تاکہ تُم اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ۔" وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۔ (سورۃ النحل، آیۃ ۱۲) "اور اُس نے تمہارے لِئے مُسخّر کیے رات اور دن اور سُورج اور چاند اور (تمام) ستارے مُسخّر ہیں اُس کے حُکم کے ساتھ۔" ان کے عِلاوہ بیشمار آیاتِ قُرآنیہ میں یہ مضمُون وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چوپائے اور ہر قسم کی مخلُوقات اِنسان کے نفع کے لِئے پیدا فرمائی اور ساری کائنات کا نظام اِنسان ہی کے لِئے وجُود میں آیا۔ اِسی لِئے اِنسان کی فطرت میں وُہ قوت و استعداد پیدا کی گئی کہ زمین اور آسمان کی ہر چیز سے

نفع اُٹھا سکے. علم و عقل، تفکر و تدبر کے ساتھ عملی قوتیں اور صلاحیتیں اِنسان کو عطا کی گئیں اور نظام ربُوبیت کی ہر کڑی کو اِنسان کی ذات کے ساتھ مِلا دیا گیا جس کا پُورا نقشہ ہر انسان کے سامنے ہے بلکہ نابینا بھی اِس کا اِنکار نہیں کر سکتا کیُونکہ اپنی قُوتِ حاسّہ اور وجدان و علم و خرد کی رَوشنی میں وُہ بھی اِس نظام کا اذعان و یقین رکھتا ہے۔

صِرف یہی نہیں بلکہ اس سے آگے علم و عقل اور تفکر و تدبر کی رَوشنی میں بڑھیں تو فطرتِ سلیمہ اس کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے گی کہ یہ نظام اَجسام کی حدُود سے نکل کر اَرواح تک پہنچتا ہے۔ جس طرح اَجسام کی ضروریات ہیں، اسی طرح ارواح بھی ضروریات سے مستثنیٰ نہیں بلکہ اَرواح کی ضروریات اجسام کی ضروریات سے کہیں زیادہ وسیع اور اہم ہیں کیُونکہ اَجسام فانی ہیں اور ارواح باقی۔ اِس لِئے ارواح کی ضروریات اجسام سے بہت زیادہ اور بے حد اہمیت کی حامل ہیں۔ رُوح کی بُنیادی ضرورت اپنے خالق اور مَعبُود کی مُحبت اور معرفت کی راہوں کا اِنکشاف ہے، جن پر گامزن ہو کر رُوح کو اَبدی سعادت اور نجات نصیب ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عالمِ قدس سے ملائکہ کرام کو اس خِدمت پر مامُور فرمایا اور انسانوں میں ایسے باکمال افراد پیدا فرمائے جن کا باطن عالمِ قُدس کی پاکیزگی اور لطافت سے مزیّن اور عالمِ انوار سے مُنوّر رہے۔ وحیِ ربانی اور کلامِ الٰہی کا سلسلہ ملائکہ کے ذریعے ان مقدس اور مُنوّر انسانوں تک پہنچا، بلکہ فیاضِ مطلق رب العٰلمین نے بلا واسطہ بھی اُن سے کلام فرمایا اور اُنہیں اپنے فیضِ خاص سے نوازا۔ اِسی سلسلۂ عالیہ کو نبوّت و رسالت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہی مُقدسین جو بنی نوعِ اِنسان کے لِئے اس فیضِ خاص کا واسطہ ہیں اُنہیں رُسل و انبیاء کرام کہا جاتا ہے۔ اور نُبوّت نہیں بلکہ فیضانِ نبوّت کو جاری رکھنے کے لِئے اُن کے مُتبعینِ خاص اولیائے کرام کو وسیلہ بنایا۔ وسائط و وسائل سے منسلک اِس جامع نظامِ ربُوبیت کے ہر شعبے کو اللہ تعالیٰ نے قُرآن مجید میں مُتعدد مقامات پر اپنی ہستی، اپنی توحید اور اپنی معبُودیت و الوہیت کے ثبوت میں بطور بُرہان ذکر فرمایا اور سُورۂ فاتحہ میں رب العٰلمین فرما کر اپنے بندوں کو اس نظامِ ربُوبیت

میں غور و فکر اور تدبّر و تعقل کی دعوت دی تاکہ بندہ سمجھے کہ ایسا حکیمانہ مربُوط و منضبط نظام ایسے مُربّی کے بغیر وجُود میں نہیں آسکتا جس کا علم و قُدرت کامل ہو اور وہ تمام صفاتِ کمالیہ کا مجمع ہو۔ فطرتِ سلیمہ کا وجدان غور و فکر کے بعد یقیناً بیدار ہوگا اور وُہ شکُوک و اَوہام کی تاریکیوں سے نکل کر ایقان و اذعان کی روشنی میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبُور ہو جائے گی کہ یہ سارا نظام خُود بخُود برپا نہیں ہُوا۔ ضرور ایک ایسی ہستی اس نظام کو قائم کرنے والی ہے جو اپنی ذات میں سب سے مستغنی ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے اُسی کا محتاج اور مقدور و محکُوم ہے۔ اُسی نے اپنی قدرتِ کاملہ سے یہ عجیب و غریب حکیمانہ نظام برپا کیا ہے، رب العٰلمین وہی ہے۔ لہٰذا اُلوہیت اور عبادت کا مستحق اُس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

مُختصر یہ کہ قُرآن کریم میں جا بجا نظامِ ربُوبیت کا جو ذکر فرمایا گیا ہے اُس کا اصل مقصد یہی ہے کہ بندے اُس میں غور و فکر سے کام لے کر اللہ تعالیٰ کی ہستی، اُس کی توحید اور اُسی کی اُلوہیت اور مَعبُودیت پر ایمان لائیں۔ مگر افسوس کہ ظُلمت و ضلالت کے اِس دَور میں نظامِ ربُوبیت کے اُس بنیادی مقصد کو بعض لوگوں نے مسخ کرنے کی کوشش کی اور قرآنی تعلیمات کے برعکس اسے اشتراکیت کی دلیل بنا ڈالا اور کہا گیا کہ نظامِ ربُوبیت کا مقصد یہ ہے کہ ضروریاتِ زندگی کی کسی چیز کا شخصی طور پر کوئی مالک نہ ہو اور ہر چیز میں ہر شخص کی ملکیت مساوی طور پر ہو تاکہ ہر چیز سے ہر شخص مساوی طور پر فائدہ اُٹھا سکے۔ اسبابِ معیشت میں تفاوت، رزق میں کمی بیشی، امیر و غریب کا فرق سراسر ظلم ہے۔ نظامِ ربوبیت میں اس ظلم کا تصور نہیں ہو سکتا۔ قدرت کا نظام ظالمانہ نہیں عادلانہ ہے"۔ بظاہر یہ بات بڑی دلکش معلوم ہوتی ہے مگر علم و عقل کی روشنی میں خُود نظامِ ربُوبیت اس کی تکذیب کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ روشنی ہَوا، پانی، آگ، زمین اور اس میں پائی جانے والی ہر چیز اور اُس سے اُگنے والا سبزہ، پھل، غلّہ، ترکاریاں، سب چیزیں نظامِ ربُوبیت کے تحت ہر شخص کے لیے مساوی طور پر قُدرت کی طرف سے پیدا ہُوئیں اور اُن چیزوں سے نفع اُٹھانے کی قوت و صلاحیت بھی سب کو مساوی طور پر عطا کی گئی لیکن اپنے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی ضروریاتِ زندگی کو حاصل کرنے کے لیے قدرت کی عطا کی ہُوئی استعداد اور قوت

سے کام لینا اور فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے سعی کرنا بھی تو نظامِ ربوبیت ہی کا قانون ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو علمی و عملی قوتیں عطا فرمائیں، سوچنے سمجھنے کے لئے عقل عطا فرمائی کام کاج کرنے، چلنے پھرنے کو ہاتھ پاؤں دیئے۔ سننے کے لئے کان عطا فرمائے دیکھنے کے لئے آنکھیں اور بولنے کے لئے زبان اور دو ہونٹ بنائے۔ کامیابی اور ناکامی کی دونوں راہیں دکھا دیں، فرمایا: "اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ" (سورۃ البلد، آیۃ ۸، ۹، ۱۰) "کیا ہم نے اُسے دو آنکھیں اور زبان اور دو ہونٹ عطا نہیں فرمائے اور (نیکی بدی کی) دونوں واضح راہیں اُسے دکھا دیں"۔ گویا واضح طور پر بتا دیا کہ دین و دُنیا کی فلاح اور اپنی ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کے معاملات میں ہر شخص ذمہ دار ہے۔ اب اگر وُہ اپنا بوجھ دُوسرے پر ڈالے اور خُود اپنی ذمہ داری سے دستبردار ہو جائے تو یہ قانونِ قدرت اور نظامِ ربوبیت کے قطعاً منافی ہے۔ دین ہو یا دُنیا، ہر معاملہ میں عمل کی ذمہ داری اِنسان پر عائد کی گئی ہے۔ قُرآن مجید میں ہے: "وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ" (سورۃ بقرہ، آیۃ ۱۳۹)۔ "اور وُہ رب ہے ہمارا اور رب ہے تمہارا اور ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال"۔ یعنی وہ رب تو سب کا ہے لیکن اُس کے نظامِ ربوبیت سے ہر شخص کو اُس کے عمل کے مطابق حصہ ملے گا۔ اِسی لئے فرمایا: "وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى" (سورۃ النجم، آیۃ ۳۹) "اور انسان کے لئے وہی کچھ ہے جو اُس نے اپنے لئے سعی کی"۔ خلقی اور فطری استعداد اور قوت و صلاحیت میں مساوات کے باوجود خارجی وجوہ کی بنا پر ہر شخص کی سعی اور عمل یکساں نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى" (سورۃ اللیل، آیۃ ۴) "بیشک تُمہاری سعی مُختلف ہے"۔

اِنسانی افراد کی کارکردگی اُن کی سعی اور عمل کا تفاوت بدیہی ہے۔ محتاجِ دلیل نہیں۔ ایسی صُورت میں رزق کی کمی بیشی اور ضروریاتِ زندگی کا تفاوت قانونِ قُدرت اور نظامِ ربوبیت ہی کی ایک کڑی ہے، اُسے ظُلم کہنا درحقیقت رب العٰلمین کو ظالم قرار دینا ہے۔ العیاذ باللہ۔

نظامِ ربوبیت کا کمال ہے کہ رب العلمین نے ہمیں پیدا کرنے سے پہلے ہی ہمارا رزق اور ہماری تمام ضروریاتِ زندگی ہمارے گردوپیش مہیا فرمادیں۔ زمین و آسمان، چاند، سورج۔ اُن کی روشنی، ہوا، پانی، آگ، جمادات و نباتات اور حیوانات کا لامتناہی سلسلہ ہمارے لئے ہماری پیدائش سے پہلے ہی موجود تھا اور ہم میں سے کوئی شخص ان چیزوں میں سے کسی چیز کا مالک بن کر ماں کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوا۔ ان سب چیزوں سے نفع اُٹھانے کے لئے اختیاری و غیر اختیاری اسباب اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرت سے پیدا فرمادیئے۔ مثلاً بچہ پیدا ہونے سے پہلے اُس کی ماں کی چھاتی میں دُودھ پیدا کر دیا اور اُسے چوسنے کی قوت و استعداد بھی بچہ میں پیدا فرمادی۔ چوسنا اختیاری سبب ہے مگر ماں کی چھاتی کا بچے کے مُنہ میں پہنچنا بچے کے اختیار میں نہیں۔ یہ اختیار ماں کو حاصل ہے کہ وہ اپنی چھاتی بچے کے مُنہ تک پہنچائے یا نہ پہنچائے۔ فرض کیجئے کسی وجہ سے کسی بچے کے مُنہ میں اُس کی ماں کی چھاتی نہ پہنچ سکی تو وہ بچہ یقیناً دُودھ پینے سے محروم رہے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ماں کی چھاتی جو بچے کے مُنہ میں نہ پہنچ سکی اُس کا باعث کیا ہے؟ اگر کسی ظالم نے ظلماً بچے کو ماں کی چھاتی سے محروم رکھا تو یقیناً وہ ظالم ہے۔ اور نظامِ ربوبیت کے خلاف اس نے بغاوت کی اور اگر کسی نے ظلماً ایسا نہیں کیا بلکہ اتفاقی طور پر بچہ ماں کی چھاتی سے محروم رہا۔ مثلاً بچہ تنہائی میں پیدا ہوا اور پیدائش کے بعد ماں فوت ہو گئی تو ایسی صورت میں بچے کی محرومی اور اُس کے نتائج کا ظہور یقینی ہے۔ لیکن اس کا ذمہ دار کسی کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بھی نظامِ ربوبیت کا قانون قرار پائے گا۔ کہ اختیاری یا غیر اختیاری طور پر حصولِ معاش کا سبب منتفی ہو جائے تو معاش سے محرومی ہو جاتی ہے۔ اور ایسی صورت میں ہم یہی کہیں گے کہ اس بچے کا منتہائے کمال رب العلمین کے علم و حکمت کے مطابق وہی تھا جہاں پہنچ کر اُس کے اسبابِ زندگی اُس سے منقطع ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا رب ہے۔ کائنات میں جاندار، بے جان، علم والے، بے علم، مختار اور مجبور، انسان و حیوان سب ہی شامل ہیں اور نظامِ ربوبیت میں مساوی طور پر حصہ دار ہیں۔ سب کی ضروریات اور اسبابِ معاش اسی نظام کے تحت رب العلمین نے پیدا فرمائے اور

ہر ایک کو اُس کے حال کے مُطابق اپنی ضروریات حاصل کرنے کی قوت و استعداد اور صلاحیت عطا فرمائی، اس کے باوجُود صرف اِنسانوں میں نہیں بلکہ حیوانات و جمادات اور نباتات میں بھی ضروریات کا حصُول متفاوت ہے اور یہ تفاوت بھی نظامِ رُبوبیت ہی کی ایک کڑی ہے۔ دیکھئے زمین کا کوئی حصّہ سرسبز و شاداب ہے، کوئی بنجر بے آب، کوئی درخت ہرا بھرا ہے کوئی خُشک بالکل سُوکھا ہُوا۔ کوئی جانور فربہ ہے، کوئی نحیف، کہیں سرسبز گھاس نظر آتی ہے کہیں سُوکھی ہُوئی۔ جس کی وجہ صرف یہی ہے کہ جہاں بربنائے حکمت حصُولِ معاش کے اسباب کا فقدان ہے وہاں ضروریاتِ مَعاش بھی مفقود ہیں۔ اِنسانوں کو اپنی حکمتوں سے روشناس کرانے کے لئے قُدرت کا قانُون ایسا ہی ہے۔ البتہ مخلُوق میں جسے قُدرت و اختیار دیا گیا ہے، اگر وُہ اسے کام میں نہ لائے اور اپنی صلاحیتوں سے جان بُوجھ کر فائدہ نہ اُٹھائے تو اُپنی بدحالی کا ذمّہ دار وُہ خُود ہے، کسی دُوسرے پر اُس کی ذمّہ داری عائد نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کوئی شخص اپنی قوت و استعداد اور خُداداد صلاحیتوں سے کام لینا چاہتا ہے لیکن اُس کی راہ میں کسی ظالم نے رکاوٹ پیدا کر دی تو یقیناً وہ ظالم نظامِ رُبوبیت کا باغی ہے، اِسی طرح جو کسی کا حق غصب کر کے اُس کے حق سے اُسے محروم کر دے، وُہ بھی ظالم اور باغی ہے۔ معاشرہ میں ایسے ظالموں کا وجُود لعنت ہے اِس لعنت سے معاشرے کو پاک کرنا پُورے معاشرے کا فرض ہے، جس شخص نے قانُونِ قُدرت کے مُطابق سعی کی اور اپنی استعداد اور صلاحیت سے کام لے کر معاش حاصل کیا وُہ اسی کا حق ہے، اُس میں خواہ مخواہ کسی دُوسرے کا شریک بننا یقیناً ظُلم ہے۔ محض اس بنا پر کسی کی کمائی پر قبضہ جمانا کہ ہر چیز میں سب کا حق ہے، جائز نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص کا حق اُسی چیز میں ہے جو اُس نے اپنی جائز سعی کے ذریعے حاصل کی یا کسی نے اپنی خُوشی سے اُسے دے دی۔

فطرت اور عقلِ سلیم کی روشنی میں عمل اور سعی کا نتیجہ یقیناً مِلک ہے۔ ایک شخص محنت و مشقت اُٹھا کر کئی میل مُسافت طے کر کے دریا میں پانی سے اپنی مشک بھر کر لایا تو اس میں دُوسرے شخص کو کوئی حق حاصل نہیں۔ کسی نے اپنی جائز سعی سے اپنے مکان میں روشنی اور ہوا

حاصل کی، دُوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ اُس میں شریک ہونے کا دعوےٰ کرے۔ کسی نے اپنی جائز کمائی سے زمین خریدی یا مکان بنایا اُس میں دُوسرے کا زبردستی شریک بننا ظلم ہے۔ کسی نے اپنی جائز سعی کے نتیجہ میں غلہ حاصل کیا، سبزی خریدی، کپڑا مول لیا، دُوسرا شخص جو اُس سعی میں شریک نہیں اگر اپنا حق جتانے لگے تو یہ سراسر زیادتی ہے۔ اِسی حکمت کی بنا پر اِنسان کو ملکیت کا اہل قرار دیا گیا تاکہ کوئی شخص کسی کے اسبابِ معیشت میں ناجائز طور پر دخل انداز نہ ہو۔ اور انسانی معاشرہ ناجائز دخل اندازی کی وجہ سے فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن کر نہ رہ جائے۔ مختصر یہ کہ فطری استعداد اور عملی قُوت اور صلاحیت کا بروئے کار آنا حصُولِ معاش کا قدرتی سبب ہے اور اس کا فقدان خواہ اختیاری طور پر ہو یا غیر اختیاری طور پر، قانونِ قدرت کے مُطابق حصولِ معاش سے محرومی کا سبب ہے اور ان صلاحیتوں کے بروئے کار آنے میں جو تفاوت ہوگا وہ حصُولِ معاش میں تفاوت کا سبب قرار پائے گا اور ایسا ہونا عین عدل و مساوات ہے۔ جتنی کارکردگی ہوگی اُس کے مُطابق صِلہ کا حق ہوگا۔ یہ کہاں کا عدل ہے کہ کارکردگی میں کمی بیشی ہو اور اُجرت ہر ایک کو برابر ملے۔ چُونکہ ہر ایک کی استعداد اور قوت کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی طرح ان کا بروئے کار آنا بھی تخلیقِ ایزدی کے ماتحت ہے۔ یعنی حصُولِ معاش کے تمام اسباب خواہ قریبی ہوں یا بعیدی، سب خلقِ خداوندی سے وابستہ ہیں اِسی لیے اُس نے رزق اور معیشت کو اپنی طرف منسُوب فرمایا اور معیشت کی تقسیم کو اپنا کام قرار دیا، نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ط (سورۂ زخرف، آیۃ ۳۲) "ہم نے اُن میں اُن کی زیست کا سامان دُنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا۔" اور وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ط (سُورۂ ہُود، آیۃ ۶) "اور کوئی جاندار زمین میں نہیں جس کا رزق اللہ پر نہ ہو۔" اس کے علاوہ قُرآن مجید میں بے شمار مقامات پر فرمایا کہ ہم ہی رزق ہیں، ہر ایک کا رزق ہمارے ہی دستِ قدرت میں ہے۔ اسبابِ رزق کا نزول آسمان سے ہوتا ہے۔ دیکھئے آسمان سے مینہ برستا ہے، چاند سُورج کی روشنی آسمان سے آتی ہے۔ یہ سب اسبابِ رزق ہیں اِسی لیے فرمایا، وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ

وَمَا تُوْعَدُوْنَ (الذّٰریات آیت ۲۳) "اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے"۔ اس میں شک نہیں کہ رزق کی کمی بیشی منجانب اللہ ہے جو عدل و مساوات کے عین مطابق ہے۔ معاش کا یہ تفاوت قانونِ قدرت ہے۔ اس تفاوت کو مٹانے کی کوشش کرنا قانونِ قدرت سے بغاوت کے مترادف ہے۔

رزق کے علاوہ دیگر امور میں تفاوت بھی ہمارے مشاہدہ میں ہے۔ سب کا خالق اللہ ہے مگر کوئی ماں کے پیٹ سے اندھا پیدا ہوتا ہے، کوئی گونگا بہرا، کوئی لنگڑا، کوئی خوبصورت، کوئی بدشکل، کوئی بیمار، کوئی تندرست۔ کیا یہ تفاوت نظام ربوبیت سے باہر ہے؟ یہ اختیاری اور غیر اختیاری تفاوت صرف جسمانیات میں نہیں بلکہ روحانیات میں بھی پایا جاتا ہے۔ دیکھئے ایمان اعمالِ صالحہ، تقویٰ، طہارت، عبادت، باوجود امورِ اختیاریہ ہونے کے تفاوت سے خالی نہیں۔ کسی کا ایمان ضعیف ہے، کسی کا قوی اور کسی کا اقویٰ، کسی کی نیکیاں کم ہیں، کسی کی زیادہ بہت سے وہ لوگ بھی ہیں جو ایمان اور نیکیوں سے یکسر محروم ہیں۔ غیر اختیاری تفاوت بھی قرآن پاک میں روزِ روشن کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس طرح بدصورت کے مقابل خوبصورت ہونا غیر اختیاری ہے اسی طرح غیر نبی کے بالمقابل نبی اور رسول ہونا بھی غیر اختیاری ہے۔ کیونکہ نبوت اور رسالت وہ حسن اور خوبی ہے جو کسی کے اختیار میں نہیں۔ اللہ نے جس کو اپنے علم و حکمت کے مطابق نبوت اور رسالت دینا چاہی وہی نبی اور رسول ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (سورۃ الانعام، آیۃ ۱۲۴) "اللہ اپنی رسالت رکھنے کی جگہ کو خوب جانتا ہے" یعنی نبوت و رسالت کا حصول امر اختیاری نہیں۔ جس نبی اور رسول کو یہ شرف حاصل ہوا محض عطائے الٰہی اور موہبت ربانی سے اس کو یہ شرف ملا۔ ثابت ہوا کہ یہ اختیاری اور غیر اختیاری تفاوت نظامِ ربوبیت کا وہ قانون ہے جو منافعِ جسمانی تک محدود نہیں بلکہ روحانی منافع بھی نظامِ ربوبیت کے اسی قانون کے ماتحت ہیں، اب اس تفاوت کو اٹھانا کس کے لئے ممکن ہے؟ اس کمی بیشی اور تفاوت کو نظامِ ربوبیت اور قانونِ قدرت کے خلاف نہیں کہا جا سکتا

بلکہ یہ عین نظامِ ربوبیت اور قانونِ قدرت ہے۔ اسی طرح رزق اور معاش کی کمی بیشی بھی عین نظامِ ربوبیت کا تقاضا ہے۔ اس حکیمانہ فطری تفاوت کو عدل و مساوات کے خلاف سمجھنے والے ملحدین اور منکرین کے لیے اللہ تعالیٰ نے دلائلِ آفاقی اور دلائلِ انفسی بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (سورۃ حٰمٓ السجدۃ، آیۃ ۵۳) "عنقریب ہم انہیں اپنی قدرت و معرفت کی نشانیاں آفاقِ عالم میں دکھائیں گے۔ اور ان کی اپنی جانوں میں"۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و معرفت کے جو تفصیلی دلائل آفاق عالم میں رکھے ہیں ان سب کا اجمال نفسِ انسانی میں رکھ دیا۔ ان دلائل کے ضمن میں نظامِ ربوبیت کے اس حکیمانہ تفاوت کا بھی مکمل نقشہ قائم فرمادیا، چشمِ بصیرت کھولیے اور دیکھیے خلقتِ انسانی میں تفاوت کس قدر نمایاں نظر آتا ہے۔ جسم انسانی میں تمام اجزاء و اعضاء انسان ہی کے ہیں لیکن ان میں کوئی اعلیٰ ہے کوئی ادنیٰ۔ انسان کا سر اس کے قدم سے اعلیٰ ہے اور قدم ادنیٰ۔ اعضائے رئیسہ میں قلب کا مرتبہ سب سے اونچا ہے۔ جسم انسانی کا کوئی حصہ محل طہارت ہے کوئی محل نجاست۔ لعاب پاک ہے اور پیشاب ناپاک، دونوں کا محل جسم انسانی ہے۔ کوئی عقلمند اس تفاوت کو عدل و مساوات کے منافی نہیں کہہ سکتا نہ ہی اسے ظلم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس کی تفصیل آفاقِ عالم میں دیکھ لیجیے اچھا اور برا، پاک اور ناپاک، مفید اور مضر سب مخلوقاتِ آفاقِ عالم میں اپنے تفاوت کے ساتھ اسی نظامِ ربوبیت کی سلک میں منسلک ہیں، تعجب ہے معترض مالکِ مجازی ہو کر اپنی مملوکہ اشیاء میں اپنی صوابدید کے مطابق جو تصرف کرے وہ صحیح ہو، مثلاً وہ اپنے گھوڑے کو اچھی غذا کھلاتا ہے۔ اس کی فربہی و صحت کو برقرار رکھنے کے لیے تدابیر عمل میں لاتا ہے اور اس کی حفاظت میں فروگذاشت نہیں کرتا۔ مگر اپنی مرضی سے اپنی گائے، بکری اور مرغی کو بیدردی سے ذبح کر ڈالتا ہے۔ اور اپنے تصرف کے اس تفاوت کو ظلم نہیں سمجھتا نہ اسے عدل و انصاف اور مساوات کے

منافی قرار دیتا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ مالکِ حقیقی اگر کسی کو صحیح سالم تندرست اور خوبصورت بنا کر پیدا فرمائے اور کسی کو حکمت کی بنا پر اندھا، لنگڑا، لولا، بدصورت پیدا فرما دے تو اس حکیمانہ تفاوت کو معترض کس منہ سے عدل و مساوات کے منافی کہتا ہے؟

اس تفاوت میں حصولِ عبرت، خوف و خشیت، شکرِ نعمت، محرومِ القسمت لوگوں کی امداد و اعانت، قدرتِ ایزدی کے گوناگوں کارناموں سے اس کی معرفت جیسی بے شمار چمکتی ہوئی حکمتیں نظر آتی ہیں مثلاً ایک مادر زاد اندھے یا گونگے بہرے کو دیکھ کر آنکھوں والے اور زبان اور کان رکھنے والے عبرت حاصل کریں اور اللہ سے ڈریں اور سوچیں کہ جس قادرِ مطلق نے ان کو بینائی، شنوائی، گویائی سے محروم کر کے پیدا کیا وہ ہمیں بھی اسی طرح پیدا کر سکتا تھا بلکہ وہ چاہے تو اب بھی یہ نعمتیں ہم سے سلب کرنے پر قادر ہے۔ اس لئے ہمیں عبرت حاصل کر کے اللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈرنا چاہیئے اور اس کی ان دی ہوئی نعمتوں پر اس کا شکر بجالانا چاہیئے۔ اسی طرح حصولِ رزق کے اسباب نہ ہونے کی وجہ سے جو رزق سے محروم ہو گیا یا ان اسباب میں کوتاہی کے باعث رزق میں کمی ہو گئی ان سے بھی اسی طرح عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ اس کے علاوہ ایسے کمزور اور محروم القسمت لوگوں کی امداد و اعانت اور ان سے ہمدردی اختیار کر کے ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا چاہیئے۔ ان سب حکمتوں کی طرف قرآن مجید میں واضح اشارات بلکہ تصریحات موجود ہیں۔ اس کے باوجود رزق اور معاش کی کمی بیشی کو دور کرنے کی سعی کرنا محض سعی لاحاصل ہے۔

اگر آپ نظامِ ربوبیت کے اس تفاوت کو دور کر سکتے ہیں تو دنیا کے تمام مادر زاد اندھوں، گونگوں، بہروں، لولے لنگڑوں کو درست کر دیجئے، حیوانات میں بھی اس قسم کے تفاوت کا ازالہ فرما دیجئے، تمام درختوں کو ایک جیسا سرسبز کر دیجئے۔ امیر و غریب کا فرق مٹانے سے پہلے تندرست اور بیمار کا فرق دور کر دیجئے، عقلمند اور بے وقوف کو یکساں بنا دیجئے، ہر مجنون اور پاگل کو صاحب فہم و فراست کر دیجئے، بدشکل کو خوبصورت بنا دیجئے، یہ اختلاف

کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ کوئی کثیر الاولاد ہے کوئی قلیل الاولاد، کوئی ایسا بھی ہے جو اولاد کی نعمت سے بالکل محروم ہے۔ کہیں گرمی ہے، کہیں سردی، کہیں روشنی ہے کہیں اندھیرا، کہیں رنج ہے، کہیں راحت۔ بنی نوعِ انسان کے حالات اور نظامِ کائنات میں اس تفاوت کو ختم کر دینا محال ہے کیونکہ یہ سب کچھ قانونِ قدرت اور نظامِ ربوبیت کے تحت ہو رہا ہے۔ البتہ اس کی حکمتوں کو سمجھ کر انہیں بروئے کار لانا اس اختلاف اور تفاوت کے تقاضوں کو پورا کرنا قانونِ قدرت اور نظامِ ربوبیت کا تقاضا ہے کیونکہ یہ وہ اختلاف اور تفاوت ہے جو بعینہٖ قانونِ قدرت اور نظامِ ربوبیت ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور تفاوت بھی ہمارے معاشرے میں پایا جاتا ہے جو طبقاتی کشمکش کا موجب ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں نے نظامِ ربوبیت سے بغاوت کر کے دھوکہ دہی، سرقہ، رہزنی، سود، رشوت اور ظلم و جور کے ذریعے اپنے گرد و پیش دولت کے انبار لگا رکھے ہیں اور حقداروں، یتیموں، بیواؤں، کمزوروں، مزدوروں، محنت کشوں، کسانوں کے جائز حقوق تلف کر کے ناجائز دولت جمع کر رکھی ہے یا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال سے نہ اللہ تعالیٰ کا حق ادا کیا نہ بندوں کا۔ ایسے لوگ یقیناً مستوجب سزا ہیں ان کے شر اور ظلم و ستم سے معاشرہ کو پاک کرنے کے لئے بھرپور کوشش ہونی چاہیئے۔ اور ایسی کوشش یقیناً جہاد فی سبیل اللہ ہوگی۔ بہرنوع نظامِ ربوبیت کے تحت جو تفاوت پایا جاتا ہے وہ ظلم ہے نہ جور بلکہ عین عدل و مساوات پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرما دیا: وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ط (سورۃ ہود، آیۃ ۱۰۱)۔ "اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ اپنی جانوں پر خود ظلم کرتے تھے"۔ جن لوگوں نے قدرت کی دی ہوئی استعداد اور ایمان و عمل کی صلاحیت کو غلط کاریوں سے ضائع کر دیا، انہیں کے متعلق ارشاد فرمایا: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ط (البقرہ، آیت ۷)۔ انسان اگر چاہے کہ میرے جرائم کا بوجھ کسی دوسرے کے سر پر رکھ دیا جائے اور کسی کو اس کی نیکیوں سے محروم

کرکے میں خود اُن سے فائدہ اُٹھالوں تو عدل و انصاف کی روشنی میں یہ ناممکن ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ط (انعام، آیت ۱۶۴)۔ "کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا۔" اِس کی واضح دلیل ہے۔ جو لوگ اپنی بداعمالیوں کے انجام اور نتائج کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے زعم باطل کا رد قرآن مجید میں اس طرح فرمایا: مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ ط (شوریٰ، آیت ۳۰) "(اے غلط کارو) تمہاری مصیبت تمہاری غلط کاری ہی کا نتیجہ ہے" اللہ پر اس کا الزام نہ لگاؤ۔ پھر چونکہ غلط کاری کی سزا بھی قانونِ قدرت کے عین مطابق اور اذنِ الٰہی سے وابستہ ہے اِس لئے فرمایا، مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (تغابن: آیت ۱۱) "کوئی بھی مصیبت ہو، اذنِ الٰہی کے بغیر تمہیں نہیں پہنچ سکتی"۔

ہمارے اس مفصل بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ رزق، معاش، ضروریاتِ زندگی، اسبابِ راحت کا فقدان یا ان میں کمی بیشی ایسے اسباب کی بنا پر ہوگی جو بندہ کے اختیاری ہیں یا ایسے اسباب کی بنا پر جو بندہ کے اختیار میں نہیں، ظاہر ہے کہ مسبب کا وجود سبب سے وابستہ ہوتا ہے۔ اِس لئے سبب کے پائے جانے سے مسبب کا وجود معرضِ ظہور میں آتا ہے لیکن پہلی صورت میں اس کا ذمہ دار یقیناً انسان ہوگا، دوسری صورت میں انسان پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کیونکہ اس کا تعلق براہِ راست قادر قیوم اور حکیم مطلق سے ہے لیکن جو بندہ خدا کی ذات و صفات پر ایمان رکھتا ہے اُسے یقین کرنا ہوگا کہ یہ تفاوت ظلم سے پاک بلکہ حکمتِ الٰہیہ پر مبنی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خالقِ حقیقی اور سارے جہانوں کا مالک ہونے کی بنا پر اپنی مخلوق اپنے ہر مقدور اور ہر مملوک پر مطلقاً تصرف کا اختیار رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ جو کچھ بھی کرے گا ظلم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ظلم کے معنی ہیں، وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَوْضِعِهٖ (مفردات: ص ۳۱۰ ج ۱۱)۔ "کسی چیز کو اُس کے غیر محل میں رکھنا" جب ہر چیز کا موجد اور مالک وہی ہے تو اُسے اختیار ہے کہ جس شئی کو جس محل کے لئے چاہے اُسی کے ساتھ مختص کر دے اور جس محل کو جس شئی کے لئے چاہے خاص فرما دے۔ ایسی صورت میں ظلم متصور ہی نہیں۔ لَا يُسْئَلُ عَمَّا

يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (انبیاء، آیت ۲۳)۔ "اللہ سے اُس کے کام کے بارے میں سوال نہیں کیا جا سکتا (ہاں) لوگوں سے سوال کیا جائے گا۔" ہاں اِس میں شک نہیں کہ وُہ خالق و مالک اور قادر ہونے کے ساتھ حکیم بھی ہے۔ اِس لئے جو کچھ کرتا ہے حکمت کے مُطابق کرتا ہے ضروری نہیں کہ اُس کی ہر حکمت کو ہر شخص جان لے مگر اُس کی ذات و صفات کی تصدیق کرنے والے کو اس کی حکمت کو ہر صورت میں ماننا پڑے گا۔ لوگوں کے رزق سے محروم رہنے یا اس کی کمی بیشی اور اسی طرح اللہ کی مخلوق میں کسی کے کسی نعمت سے محروم ہونے اور کسی کے محروم نہ ہونے میں بے شمار حکمتیں ہیں، مثلاً ابتلاء اور آزمائش، عبرت و نصیحت، صبر و شکر۔ جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں، اِن حکمتوں کے ساتھ یہ تفاوت اور کمی بیشی یقیناً نظامِ ربوبیت ہی کی ایک کڑی نظر آئے گی جس کا انکار نظامِ ربوبیت اور قانونِ قدرت کا اِنکار ہوگا۔ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ

۵۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اللہ تعالیٰ کے یہ دونوں مُبارک نام اُس کی صفت رحمت پر کمال مبالغہ کے ساتھ دلالت کرتے ہیں اور دُعا کرنے والے کو یہ تصور دیتے ہیں کہ جس معبُود کی بارگاہ میں حاضر ہو کر تُم یہ دُعا مانگ رہے ہو وُہ ایسا جبّار و قہّار نہیں جیسا کہ دُوسرے مذاہب میں یہ تصور پیش کیا گیا ہے، جس کا نتیجہ بندے کے حق میں خوف و ہراس اور نا اُمیدی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ قُرآن نے بتایا کہ خشوع و خضوع کے ساتھ تُم جس معبُود سے دُعا مانگ رہے ہو وہ ایسا رحمٰن و رحیم ہے کہ اُس کی رحمت سے دُنیا و آخرت کا کوئی فرد محروم نہیں اور اس کی شان یہ ہے کہ سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ غَضَبِيْ (مُسلم ص ۳۵۶ ج ۲)۔ اور ایک روایت میں ہے: غَلَبَتْ اَوْ قَالَ سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ غَضَبِيْ (بخاری: ص ۱۱۲۷ ج ۲)۔ "میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی"۔ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے بعد رَحْمٰنِ و رَحِيْمِ کا ذکر فرمانا اِس حقیقت پر مبنی ہے کہ ربوبیت رحمت کے بغیر متصور نہیں اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کے دل میں اُس کے چھوٹے بچوں کے لئے رحمت کا ایک خاص جذبہ رکھا ہے جس کے تحت وہ اپنے بچوں کی تربیت کرتے ہیں، چُونکہ اُس کی صفتِ ربوبیت عام ہے لہٰذا اُس کی صفتِ رحمت کا

عام ہونا بھی ضروری ہے۔ یہاں الرحمٰنِ الرحیم فرمانے کی یہ ایک بڑی حکمت ہے۔

تشنیہ رحمٰن و رحیم میں مُبالغہ کی وجہ سے جو زیادتی پائی جاتی ہے وہ کبھی کمیّت یعنی مقدار کے اعتبار سے ہوتی ہے اور کبھی کیفیت کے اعتبار سے۔ کمیّت و کیفیت یعنی کتنی اور کیسی دو جُدا جُدا معنیٰ ہیں، اگر الرحمٰن زیادۃ فی الکمیّۃ پر محمول ہو تو الرحیم کا حمل زیادۃ فی الکیفیۃ کے معنیٰ پر ہو گا۔ اور اگر الرحیم کو زیادۃ فی الکمیّۃ پر محمول کیا جائے تو الرحمٰن کا حمل زیادۃ فی الکیفیۃ پر ہو گا۔ رحمٰن و رحیم دونوں الگ الگ معنیٰ پر محمول ہیں۔ اس مقام پر ایک معاصر نے لکھا کہ

"اِنسان کا خاصہ ہے کہ جب کوئی چیز اس کی نگاہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے تو وُہ مُبالغہ کے صیغوں میں اُس کو بیان کرتا ہے اور اگر ایک مُبالغہ کا لفظ بول کر وہ محسُوس کرتا ہے کہ اس شئی کی فراوانی کا حق ادا نہیں ہُوا تو پھر وُہ اسی معنیٰ کا ایک اور لفظ بولتا ہے تاکہ وُہ کمی پُوری ہو جائے جو اُس کے نزدیک مُبالغہ میں رہ گئی ہے۔ اللہ کی تعریف میں رحمٰن کا لفظ اِستعمال کرنے کے بعد پھر رحیم کا اضافہ کرنے میں یہی نکتہ پوشیدہ ہے"۔ آگے چل کر اس کی مثال دیتے ہُوئے لکھا، "رنگ کی تعریف میں جب "گورے" کو کافی نہیں پاتے تو اس پر "چٹے" کا لفظ بڑھا دیتے ہیں، درازیٔ قد کے ذکر میں جب "لمبا" کہنے سے تسلی نہیں ہوتی تو اس کے لبد "تڑنگا" بھی کہتے ہیں"۔ اھ

قرآن مجید کسی اِنسان کا کلام نہیں بلکہ کلامِ الٰہی ہے۔ اللہ کی ذات کا اِنسانی خاصہ سے کیا تعلق؟ اگر وُہ اللہ کے لئے ثابت نہیں تو اِنسانی خاصہ کیسے رہا؟۔ ایک لفظ بول کر تسلی نہ ہونا اور کمی محسوس کرنا لوازماتِ عجز اور علاماتِ حدوث سے ہے۔ تعالیٰ اللہ عن ذٰلک عُلُوًّا کبیرًا۔ پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ کمی بیشی کے احساس بلکہ مُطلقاً حس سے بھی پاک ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ الرحمٰن کے بعد الرحیم اُسی معنیٰ میں استعمال نہیں ہُوا جس معنیٰ میں الرحمٰن اِستعمال ہُوا تھا۔ دونوں میں سے ایک زیادۃ فی الکمیّۃ کے معنیٰ میں ہے اور دُوسرا زیادۃ فی الکیفیۃ کے معنیٰ میں۔

الرحمٰن الرحیم کے استعمال کی مثال میں "گورے" کے بعد "چٹے" اور "کالے" کے بعد "ترنگا" کی مثالیں پیش کرنا انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ان مثالوں میں کوئی ایک لفظ بھی مبالغہ کا صیغہ نہیں۔ قرآنی استعمالات کے مقابلے میں اس قسم کی بے معنی ڈھونڈی مثالیں پیش کرنا کلام الٰہی کے ساتھ مذاق نہیں تو کیا ہے۔

۶ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کا ذکر آچکا ہے جس کا تقاضا فضل و احسان ہے۔ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ میں اللہ تعالیٰ کی ایک اور صفت بیان ہوئی اور وہ ہے بدلے کے دن کا مالک ہونا، بدلے کے دن کا مالک وہی ہو سکتا ہے جو ہر کام کا بدلہ عدل و انصاف کے ساتھ دے، ظلم اور جور سے پاک ہو، ساتھ ہی بدلہ دینے میں ان لوگوں کے ساتھ فضل و احسان بھی کرے جو اس کے نزدیک اس کے اہل ہوں۔ یہاں دو قرائتیں متواتر ہیں: مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ اور مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔

۷ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اللہ تعالیٰ کی حمد ہے۔ الرحمٰن الرحیم ثنا ہے اور مٰلِکِ یوم الدین تمجید ہے۔ حمد و ثنا اور تمجید کے بعد اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ سے دعا کا آغاز ہوتا ہے۔ علامہ علاؤ الدین علی خازن اپنی تفسیر "لباب التاویل" (ص ۱۲۱ ج ۱) میں فرماتے ہیں: وَھِیَ قَوْلُہٗ اِیَّاکَ نَعْبُدُ دُعَاءٌ۔ یعنی بندوں کا اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہنا ان کی دعا ہے کہ اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کریں اور تجھی سے مدد چاہیں۔ عبادت کے معنیٰ ہیں اپنی انتہائی عاجزی اور کمزوری کے اعتقاد کے ساتھ کسی کو اس کے ذاتی استحقاق کی بنا پر معظم ماننا۔ مفسرین نے اسی مفہوم کو اقصیٰ غایۃ الذل اور اقصیٰ غایۃ الخشوع سے تعبیر فرمایا ہے۔ عبادت کی تفسیر توحید کے ساتھ بھی کی گئی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو شریک سے پاک ماننا۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو مستعانِ حقیقی سمجھ کر اس سے مدد طلب کرنا قطعاً ناجائز ہے۔ ہاں اگر اللہ کے کسی نیک بندے کو غیر مستقل سمجھتے ہوئے محض واسطۂ رحمت الٰہی جان کر اس سے ظاہری استعانت

کرے تو یہ ہرگز شرک نہیں بلکہ جائز ہے اِس لئے کہ یہ استعانت درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔ اگر ایسی استعانت کو شرک یا ناجائز قرار دے دیا جائے تو نہ دین کا نظام قائم رہ سکتا ہے نہ دُنیا کا۔

۸۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ ہمیں اپنے عشق و محبت کی راہ پر چلا اور قربِ معرفت کے درجات عطا فرما۔ جس منزلِ عروج تک تُو نے ہمیں پہنچایا، اُس پر ہمیں ثابت قدم رکھ۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے قدم پھسل جائیں اور ہم صراطِ مستقیم سے دُور جا پڑیں۔ بعض لوگ اس مقام پر یہ شُبہ وارد کرتے ہیں کہ دُعا کرنے والے کو صراطِ مستقیم ملی یا نہیں؟ اگر مل گئی تو بار بار طلب کرنا تحصیلِ حاصل ہے اور اگر نہیں ملی تو دمِ آخر تک صراطِ مستقیم سے محرومی رہی۔ اِس کا ازالہ یہ ہے کہ قُربِ معرفتِ الٰہیہ کے درجات لامتناہی ہیں، بندہ جب بھی "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" کہہ کر دُعا کرتا ہے اُس کا مقصُود قربِ معرفت کا اگلا درجہ ہوتا ہے۔ اِس لئے تحصیل حاصل لازم آتی ہے نہ محرومی۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی تفسیر اسلام اور قرآن کے ساتھ کی گئی ہے یعنی ہمیں دینِ اسلام اور احکامِ قرآن پر چلا۔ "اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اسمِ مُبارک بھی ہے۔

۹۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ بدل ہے اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ سے، یعنی صراطِ مستقیم وہی ہے جس پر اللہ کے انعام کئے ہُوئے مقدس بندے چلتے رہے، جو چار گروہوں میں منحصر ہیں۔ سُورۂ نساء میں اُنہیں اَلنَّبِیّٖن، اَلصِّدِّیْقِیْن، اَلشُّھَدَاء، الصالحین سے تعبیر فرما کر بہترین رفیق قرار دیا گیا۔ معلُوم ہُوا کہ انبیاء، صِدّیقین، شہداء اور صالحین ہی کا راستہ صراطِ مستقیم ہے اور اسی پر چل کر دارین کی فلاح و نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

۱۰۔ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ، اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ سے بدل ہے۔ یعنی جن پر اللہ کا اِنعام ہُوا، وُہ لوگ وہی ہیں جو غضب اور ضلال سے سالم ہیں۔ غضب کے معنیٰ ہیں "شِدّت" جو ہیجانِ نفس کے

ساتھ کبھی بارادۂ انتقام ہوتا ہے اور کبھی بصورتِ غُصّہ، جو غضب ارادۂ انتقام کے بغیر ہو اُسے لفظ عتاب سے تعبیر کر سکتے ہیں مگر یہ عتاب ملامت اور مذمت کے لیے ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بلکہ کسی نبی کو کبھی ایسا عتاب نہیں ہُوا۔ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ نبوت عطا فرما کر اپنے نبی کو ملامت یا مذمت کا ہدف بنائے البتہ بظاہر خلافِ اَولیٰ کام پر انبیاء علیہم السلام کی طرف صُورتاً عتاب متوجہ ہُوا مگر حقیقت میں وہ محبت بھرا خطاب ہے، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا غضب نفسِ عقوبت و ارادۂ انتقام ہی میں منحصر ہے۔ تفسیر قرطبیؒ میں ہے: اَلْغَضَبُ فِی اللُّغَۃِ اَلشِّدَّۃُ وَ مَعْنَی الْغَضَبِ فِیْ صِفَۃِ اللّٰہِ تَعَالٰی اِرَادَۃُ الْعُقُوْبَۃِ۔ اور کشافؒ میں ہے: ھُوَ اِرَادَۃُ الْاِنْتِقَامِ۔ آیۂ کریمہ میں مَغضُوب علیہم کا مِصداق وہی لوگ ہیں جن پر اللہ کا غضب ہُوا، یعنی جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنا ارادۂ انتقام متعلق فرمایا۔ ایک مُعاصِر نے "غیر المغضوب علیہم" کا ترجمہ کرتے ہُوئے لکھا، "جو معتوب نہیں ہُوئے"۔ یہاں "مغضوب" کا ترجمہ "معتوب" صحیح نہیں، عہدِ رسالت سے لے کر آج تک کسی نے یہ ترجمہ نہیں کیا۔ بلکہ ادنیٰ تأمل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غضب سے عِتاب مُراد لینا مُرادِ الٰہی کے قطعاً خلاف ہے اِس لیے کہ اللہ کا غضب اُنہی لوگوں کے ساتھ خاص ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے اِرادۂ انتقام متعلق فرمایا۔ رہا "عتاب"، تو فی الجُملہ وہ رسُولوں کی طرف بھی متوجہ ہُوا۔ صحیحین کی مُتفق علیہ حدیث میں ہے: "عَتَبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ"۔ اللہ تعالیٰ نے مُوسیٰ علیہ السلام کو عتاب فرمایا۔" بلکہ سُورۂ عَبَسَ وَ تَوَلّٰی کی تفسیر میں یہ حدیث وارد ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عبداللہ ابنِ اُمِّ مکتُوم کی آمد پر فرمایا: "مَرْحَبًا بِمَنْ عَاتَبَنِیْ فِیْہِ رَبِّیْ"۔ جس سے ظاہر ہُوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف بھی عتاب متوجہ ہُوا۔ اگر "مغضوب" کا ترجمہ "معتوب" صحیح مان لیا جائے تو معاذ اللہ حبیب و کلیم علیہما الصلوٰۃ والتسلیم بھی "مغضُوب علیہم" میں شامل ہو جائیں گے۔ واضح رہے کہ غضب جو اللہ کی صفت ہے اس کی بُنیاد صِرف عقوبت اور ارادۂ انتقام ہے، اور اِس عتاب کا

مبنی مَوَدّت و محبت ہے۔ اہلِ لغت نے عتاب کے معنے مُخاطبۃً اِدلال لکھے ہیں یعنی محبوب کی لاپروائی یا بے توجہی پر محبت بھری خفگی کا اِظہار۔ صاحب لسان العرب اور صاحب تاج العروس نے اس معنیٰ پر بطور شاہد یہ شعر نقل کیے:

أُعَاتِبُ ذَا الْمَوَدَّةِ مِنْ صَدِيقٍ ۔۔۔ إِذَا مَارَا بَنِي مِنْهُ اجْتِنَابُ

إِذَا ذَهَبَ الْعِتَابُ فَلَيْسَ وُدٌّ ۔۔۔ وَيَبْقَى الْوُدُّ مَا بَقِيَ الْعِتَابُ

"محبت والے دوست کے ساتھ میں عتاب سے پیش آتا ہوں، جب مجھے اس کی کنارہ کشی کا اندیشہ ہو۔ جب عتاب گیا تو محبت بھی نہ رہی کہ محبت اُسی وقت تک رہتی ہے جب تک عتاب باقی رہے۔" یعنی عتاب سے پیش آنا محبت کی نشانی ہے۔ اگر کہا جائے کہ اُردو لُغت کی کتابوں میں "غضب" کے معنیٰ عتاب اور "عتاب" کے معنیٰ غضب اور "مغضوب" کے معنیٰ "زیرِ عتاب" لکھے ہیں تو عرض کروں گا کہ ہر زبان کے عُلماءِ لغت کی طرح اُردو لُغت دانوں نے بھی اپنی اُردو زبان کے استعمالات و محاورات کو اُردو لُغت کی کتابوں میں جمع کر دیا ہے۔ مگر قرآن مجید "اُردو" میں نہیں بلکہ "عربی" زبان میں نازل ہُوا ہے۔ ہر زبان کے محاورات و اِستعمالات اُس کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں اِس لئے اُردو استعمالات پر عربی استعمالات کا قیاس دُرست نہیں۔ بالخصوص قُرآنی استعمالات میں غضبُ اللہ سے عتاب مُراد لینا یا مغضُوب کا ترجمہ معتوب کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔ ہم ابھی ثابت کر چکے ہیں کہ "اللہ کا غضب" اِرادۂ عقوبت و انتقام میں منحصر ہے۔ اور لُغتِ عرب میں لفظ "عتاب" ارادۂ انتقام کے لئے وضع نہیں کیا گیا۔ اِسی لئے کُفار کا مغضُوب ہونا تو قرآن و حدیث میں بکثرت وارد ہے۔ مگر اُن کا معتوب ہونا کسی آیت یا حدیث میں وارد نہیں، لہٰذا کفار کو معتوب کہنا صحیح نہیں بلکہ وہ مغضُوب ہیں۔ کیونکہ ارادۂ انتقام کے معنیٰ لفظ "عتاب" سے نہیں بلکہ لفظِ "غضب" ہی سے مفہوم ہوتے ہیں۔

پُورے قُرآن میں لفظِ "عتاب" کہیں وارد نہیں ہُوا، البتہ احادیث میں وارد ہے

لیکن "ارادۂ انتقام" کے معنیٰ میں اس کا استعمال کسی حدیث میں نہیں ہوا بلکہ اہلِ عرب سے بھی کہیں منقول نہیں کہ اُن میں سے کسی نے ارادۂ انتقام کے معنیٰ میں لفظ عتاب کبھی استعمال کیا ہو۔ قرآن مجید کا ترجمہ اُردو لغت کی کتابوں سے نہیں بلکہ قرآن و حدیث اور لغتِ عرب کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ اُردو لغت کو ترجمۃ القرآن کا معیار قرار دینے والوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اُردو لغت کی کتابوں میں لفظ "غضب" کے معنیٰ "عتاب" ہی نہیں لکھے بلکہ عظیم، بہت بڑا، نہایت خوبصورت، نہایت حسین، ظالم، لٹیرا، وغیرہ بکثرت متضاد معانی بھی لکھے ہیں جنہیں لفظِ غضب کے قرآنی استعمالات میں کسی ایک جگہ بھی مراد نہیں لیا جاسکتا اور انہیں پڑھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اُردو لغت والوں نے صرف اُردو زبان کے استعمالات و محاورات کو جمع کیا ہے۔ اہلِ عرب بالخصوص قرآنی استعمالات سے ان کا کوئی تعلق نہیں، مزید برآں یہ کہ اُردو، فارسی لغت کی کتابوں میں لفظ "عتاب" کے معنیٰ "ناز کرنا" بھی لکھے ہیں، اور انہی کتابوں میں "ناز" کے معنیٰ لاڈ پیار، اخلاص، محبت، پیار کی بات، پیار کی ادا، بھی مرقوم ہیں اسی مفہوم میں 'ذوقؔ' کا حسب ذیل شعر بھی منقول ہے ؎

سُنتے ہیں اُس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم
کس مزے سے عتاب کی باتیں

اس شعر کو پڑھنے کے بعد ذوقِ سلیم شہادت دیتا ہے کہ اُردو محاورات میں بھی لفظ عتاب "محبت بھری خفگی" ظاہر کرنے کے معنیٰ میں مستعمل ہوتا ہے۔ اب یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ "مغضوب" کا ترجمہ "معتوب" کسی طرح صحیح نہیں۔ یہاں "ضلال" سے مراد ہے "راہِ حق سے بھٹکنا"۔ بعض مفسرین نے "مغضوب علیہم" کا مصداق یہود کو اور "ضآلین" کا مصداق نصاریٰ کو قرار دیا۔ قرآن و حدیث کے شواہد کی روشنی میں یہ قول صحیح ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہود کے سوا کوئی "مغضوب علیہ" نہیں اور نصاریٰ کے سوا کوئی "ضال" نہیں۔ عمومِ لفظ کے اعتبار سے ہر کافر اور دشمنِ اسلام مغضوب بھی ہے اور ضال بھی۔

'اٰمین۔ نماز میں سورۂ فاتحہ کے اختتام پر 'اٰمین کہنا سُنت ہے اور یہ کلمہ قرآن میں شامل نہیں یہ اسم فعل ہے جس کے معنیٰ ہیں "دُعا قبول فرما" حنفیہ کے نزدیک 'اٰمین آہستہ کہے حضرت علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا مذہب بھی یہی ہے۔ عبداللہ بن مغفل اور انس رضی اللہ عنہما نے 'اٰمین کا آہستہ کہنا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت کیا۔ جن روایات میں 'اٰمین بالجہر وارد ہے وُہ تعلیم پر محمُول ہیں۔

فضائل فاتحہ جامع ترمذیؒ میں حضرت ابُوہُریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اِرشاد فرمایا: "میرے رب کی قسم سُورۂ فاتحہ کی مثل اللہ تعالیٰ نے کوئی سُورت تورات، انجیل اور زبُور میں نہیں اُتاری نہ قرآن میں اُس کی مثل کوئی سُورت ہے۔ وُہ سبع مثانی ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی، وُہ سات آیتوں پر مشتمل ہے جو ہر نماز میں مکرر پڑھی جاتی ہے"۔ صحیح مُسلمؒ میں حضرت ابُوہُریرہ سے مروی ہے' رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے "الصلوٰۃ" یعنی سُورتِ فاتحہ کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان برابر تقسیم کر دیا۔ اس کا نصف میرے لئے اور نصف میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وُہ سب کُچھ ہے جو اُس نے مانگا۔ حضُور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا، بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی اور بندہ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثنا کی، بندہ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ بندہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لئے وُہ سب کُچھ ہے جو اُس نے مانگا۔ بندہ کہتا ہے اِہْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ، صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ سب کُچھ ہے جو اُس نے مانگا"۔ اِس حدیث سے ثابت ہُوا کہ سُورتِ فاتحہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے شُروع ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس کا جُزو نہیں۔ صحیح بخاریؒ میں حضرت ابُوسعید بن مُعلّٰی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سُورۃ فاتحہ کو اَعْظَمُ سُوْرَۃٍ فِی الْقُرْاٰن فرمایا، یعنی سب سے زیادہ عظمت والی سُورت فاتحہ ہے۔ سُورۃِ فاتحہ کی عظمت و شان کی دلیل حدیثؐ لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتٰبِ بھی ہے۔ جس کا مفاد یہ ہے کہ سُورۃ فاتحہ کے سوا کسی سُورت کا بعینہا نماز میں پڑھنا واجب نہیں۔

اَحکام و مسائل نوافل اور وِتر کی ہر رکعت میں اور فرض نماز میں جمہُور احناف کے نزدیک صِرف پہلی دو رکعتوں میں سُورت فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے۔ یہاں ایک حاشیہ میں لکھا ہے کہ "نماز کی ہر رکعت میں اس کا پڑھنا واجب ہے"۔ جمہُور احناف کے نزدیک صحیح نہیں۔

قِراءۃ خلف الامام رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نماز میں سُورت فاتحہ پڑھنے کا جو حُکم دیا ہے اُس کا مفہُوم نصِ قرآنی اور دیگر احادیثِ مرفوعہ و آثارِ صحابہ کی روشنی میں یہی ہے کہ امام اور منفرد خود قرارت کرے اور مقتدی کا امام قرارت کرے۔ مقتدی خُود خاموش رہے۔ امام کی قرارت مقتدی کی قرأت ہے۔ قُرآن مجید میں ارشاد فرمایا، وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا۔ (اعراف۔ آیت ۲۰۴) "جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔ روایاتِ کثیرہ سے یہ بات ثابت ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہُوئی، جیسا کہ عبداللہ بن مسعُود، ابُوہریرہ، ابن عباس، سعید بن المسیبؒ، مُجاہدؒ، زہری، بیہقی و ابن جریر سے روایات منقُول ہیں۔ صحیح مُسلمؒ میں حضرت ابُوموسیٰ اشعری سے روایت ہے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا۔ "امام جب قرارت کرے تو خاموش رہو"۔ نسائی اور ابن ماجہؒ میں حضرت ابُوہریرہ رضی اللہ عنہ سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے یہی الفاظ مروی ہیں: اِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا۔ صحیح مُسلمؒ میں ہے امام مُسلم سے حضرت ابُوہُریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا گیا تو

انہوں نے فرمایا: هُوَ عِنْدِیْ صَحِیْحٌ۔ "یہ حدیث میرے نزدیک صحیح ہے"۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَنْ کَانَ لَہٗ اِمَامٌ فَقِرَاءَۃُ لَہٗ قِرَاءَۃٌ۔ "جس کا امام ہو تو امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے"

حضرت عطا بن یسار نے حضرت زید بن ثابت سے امام کی معیت میں قرأت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا: امام کے ساتھ کسی شئی میں قرأت نہیں۔ جب امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے تو یہ کہنا صحیح نہیں کہ مقتدی نے قرأت نہیں کی۔ امام کی قرأت حقیقتاً ہے اور مقتدی کی حکماً۔ اس کی ایک اور واضح دلیل یہ ہے کہ جو شخص امام کو رکوع میں پائے اس نے رکعت کو پالیا۔ ظاہر ہے کہ امام کو رکوع میں پانے والا حقیقتاً قرأت نہیں کرتا، اگر کوئی یہ کہے کہ امام کو رکوع میں پاکر مقتدی سورت فاتحہ پڑھ سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ رکوع و سجود کی حالت میں قرآن کی قرأت ممنوع ہے۔

نماز جنازہ میں قرأت قرآن نہیں۔ جن روایات میں سورتِ فاتحہ کا پڑھنا وارد ہے وہ دعاء اور ثنا پر محمول ہیں جو ہمارے نزدیک بھی جائز ہے۔

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ میں حرف ضاد کو اس کے اصل مخرج سے ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ بعض لوگ ضاد کی بجائے ظا پڑھتے ہیں، یہ جائز نہیں۔ ایسی صورت میں فقہاء نے "فساد صلوٰۃ" کا قول کیا ہے۔ خاص عربی النسل حضرات جنہیں اَلنَّاطِقِیْنَ بِالضَّاد کہا جاتا ہے، بلا تکلف اس حرف کو صحیح طور پر ادا کرتے ہیں اور عام اہلِ عرب بھی ضاد کو ظا نہیں پڑھتے۔

علوم فاتحہ: سورت فاتحہ کے ستائیس اسمائے مبارکہ منقولہ ان علوم کی نشاندہی کرتے ہیں جن پر یہ سورت مشتمل ہے۔ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ سورت فاتحہ سے دس ہزار مسائل مستنبط ہو سکتے ہیں۔ علامہ شیخ محمد نووی الجاوی اپنی تفسیر "مراح لبید" میں فرماتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ چار انواعِ علوم پر مشتمل ہے۔ نوع اول، علم الاصول

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۔ "ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو ہر شئی کا بیانِ واضح ہے"۔ ظاہر ہے کہ اُمّ الکتاب علومِ کتاب کو حاوی ہے لیکن اس سے علوم کا استخراج ہر شخص کے لئے ممکن نہیں۔ یہ انہی لوگوں کا کام ہے جو آیت کریمہ، اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۔ کا مصداق ہیں۔ یعنی "جس کا سینہ اللہ نے اِسلام کے لئے کھول دیا وہ اپنے رب کی طرف سے نُورِ عظیم پر ہے" اور جن کے حق میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ ۔ یعنی "مُؤمن کی فراست سے ڈرو، اِس لئے کہ وہ اللہ کے نُور سے دیکھتا ہے"۔ اس نُورِ عظیم اور نُورِ فراست کے حاملین، اتم اور اکمل طور پر علماءِ ربانیین (عارفین) ہی ہیں جو اُمّ الکتاب کے آئینے میں علومِ کتاب اور حقائقِ کائنات کا مُشاہدہ کرتے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ جب ربانیین پر سُورتِ فاتحہ سے یہ تمام علوم منکشف ہیں تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر اس سُورت سے کتنے علوم کا انکشاف ہُوا ہوگا۔ ع قیاس کُن زگلستانِ من بہارِ مرا

سُورۃ بقرہ مدنی ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ نہایت رحمت والے بے حد رحم فرمانے والے کے نام سے

الٓمّٓ ۱

۱ اس سُورت کا نام سُورۃُ البَقَرَۃ ہے، اِس لئے کہ اس میں گائے ذبح کرنے کا ذکر ہے۔ ہر سُورت کے نام میں مضمونِ سُورت کے کسی حصّہ کے ساتھ مناسبت ضرور پائی جاتی ہے۔ سُورۃ الفاتحہ کے ساتھ اس سُورت کا ربط یہ ہے کہ سُورتِ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور دُعا کی تعلیم تھی، اس سُورت میں اصل مقصود "ایمان" کی طرف رہنمائی فرمائی گئی جس کا ماخذ کتاب اللہ ہے۔

۲ مقاصدِ عظیمہ سے کچھ اسرار و رموز بھی متعلق ہوتے ہیں، یہاں الٓمّٓ میں انہی کی طرف اشارہ فرمایا گیا۔ قرآن مجید کی انتیس سُورتوں کے اوائل میں اسی طرح کے حُروفِ مقطعات پائے جاتے ہیں، یہ سب از قبیل متشابہات ہیں جو رموز و اشارات کے طور پر نازل ہوئے اور اللہ اور اس کے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان (عامۃُ الناس سے پوشیدہ) سربستہ راز و اسرار ہیں۔ حضرات خلفاءِ اربعہ رضی اللہ عنہم اور صدرِ اوّل سے لے کر آج تک جمہور مفسرین کا یہی مسلک رہا ہے۔

عقلِ سلیم کی روشنی میں یہ قول دُرست نہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو ان حُروف کے معانی معلُوم نہ تھے۔ اِس لِئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حُروف کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو خطاب فرمایا اور ایسا خطاب جسے مخاطب نہ سمجھ سکے خلافِ حکمت ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں۔ چُونکہ عَامّۃُ النّاس کو حروفِ مُقطّعات کا سمجھانا مقصُود نہ تھا، اس حکمت کے پیشِ نظر مفسّرین نے لکھ دیا: اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ۔ یعنی "اللہ ہی اپنی مُراد کو خُوب جانتا ہے"۔ اِس سے عَامّۃُ النّاس کے علم کی نفی مُراد ہے۔ خواص کے علم کی نفی مُراد نہیں۔ چُونکہ یہ حروف (اصل مقصُود اسرارِ الٰہیہ کے عِلاوہ) دیگر لطائف و معارف کی طرف بھی اشارات پر مشتمل ہیں۔ اس لِئے اُن کا اِستنباط بعض صحابۂ کرام اور تابعین نے کیا، جن کے اَقوال کُتُبِ تفسیر میں منقول ہیں مگر وہ یقینی نہیں بلکہ سب تخمینی وظنّی ہیں۔

مخفی نہ رہے کہ یہ حُروف ترکیبِ کلام کے لِئے ہیں۔ لُغت میں کلماتِ مَوضُوعہ کی طرح کِسی متعیّن معنیٰ کے لِئے وضع نہیں کیے گئے، البتہ بطورِ اشارات ان کا استعمال زمانۂ جاہلیت میں بھی ہوتا رہا ہے اور اَوائلِ سُوَرِ قُرآنیہ میں بھی اَسرارِ الٰہیہ کی طرف بطورِ اشارات ہی یہ حُروف نازل ہُوئے ہیں۔ طنطاوی نے اپنی تفسیر میں لکھا کہ عیسائی بعض اعتقادیات میں بطور اشارات ان حُروف کو استعمال کرتے تھے اور یہُود سے بھی بحساب جمل ان حُروف کو قوموں کی مُدّتوں اور میعادوں کی طرف اشارات کے لِئے اِستعمال کرنا ثابت ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے الٓمٓ سُن کر یہُود نے کہا ہم ایسے دین کو کیسے قبُول کریں جس کی مُدّت صِرف اکہتّر سال ہے۔ یہُود کی کج فہمی پر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم مُسکرائے۔ تاہم اس واقعہ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہُود بطور اشارات ان حُروف کو استعمال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کِسی مخالف نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر یہ اعتراض نہیں کیا کہ یہ بے معنیٰ حروف کیسے بولے گئے اور اسی بنا پر صحابۂ کرام نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے ان حُروف کے معانی دریافت نہیں کئے۔ رسُول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے وہ جانتے تھے کہ یہ حروف مُقطّعات اللہ اور اُس کے رسُول کے درمیان اسرار ہیں اور بطورِ اشارات نازل ہُوئے ہیں۔

ایک مُعاصِر مترجم نے ان حروف پر اظہارِ خیال کرتے ہُوئے ایک نیا انداز اِختیار کیا جس کا خُلاصہ یہ ہے کہ نزولِ قُرآن مجید کے دَور میں یہ حروف عام فہم تھے۔ سامعین جانتے تھے کہ بولنے والے کی مُراد ان سے کیا ہے؟ اپنے اس قول کی تائید میں مترجم مَوصُوف نے تین باتیں لکھیں۔ ایک یہ کہ اگر سامعین ان کی مُراد نہ جانتے تو کُفّار اعتراض کرتے کہ یہ بے معنیٰ الفاظ کیسے ہیں؟۔ دُوسری یہ کہ صحابہ کرام رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ان کے معانی دریافت کرتے، لیکن نہ کُفّار نے اعتراض کیا نہ صحابہ کرام نے ان کے معانی دریافت کیے۔ معلُوم ہُوا کہ سب جانتے تھے کہ ان سے مُراد کیا ہے؟ تیسری یہ بات کہی کہ ان حُروفِ مُقطّعات کے اِستعمالِ عام کی مثالیں ہمیں کلامِ جاہلیت کے محفُوظ نمونوں میں مِلتی ہیں۔ پہلی دو باتوں کا جواب تو ہم دے چُکے ہیں، تیسری بات کا جواب یہ ہے کہ کلامِ جاہلیت کا کوئی ایسا نمُونہ پیش نہیں کیا جا سکتا جس میں اوائلِ سُوَرِ قُرآنیہ کی طرح صدرِ کلام میں یہ حُروف مُقطّعات اِستعمال کیے گئے ہوں اور سامعین جانتے ہوں کہ بولنے والے کی مُراد ان سے کیا ہے۔ شاعر کے قول: ع قُلْتُ لَهَا قِفِيْ فَقَالَتْ لِيْ قٓ۔ اور اس جیسے اقوال کو قُرآنی استعمالات کا نمُونہ سمجھنا کج فہمی پر مبنی ہوگا۔ یہاں لفظ قِفِي واضح قرینہ ہے کہ قَالَتْ لِيْ قٓ۔ میں لفظ 'قٓ' وَقَفْتُ کی طرف اشارہ ہے۔

نزولِ قُرآن مجید کے دَور میں ان حُروفِ مقطّعات کا عام فہم ہونا اس امر کا مقتضی تھا کہ مفسّرین ان کے معانی متعیّن کر دیتے مگر ایسا نہیں ہُوا۔ مترجم مَوصُوف نے اس بنا پر یہ کہا کہ بعد میں ان حُروف کا استعمال کلامِ عرب میں متروک ہوتا چلا گیا۔ اِس لئے مفسّرین کے لئے ان کے معانی متعیّن کرنا مُشکل ہو گیا۔ مترجم مَوصُوف کی یہ بات سُخن سازی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ مفسّرین نے صِرف عربی زبان کی رَوشنی میں کلماتِ قرآنیہ

کے معانی متعین نہیں کیے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ "صلوٰۃ و زکوٰۃ" کے وہی معنی متعین کرتے جو عربی زبان میں پائے جاتے ہیں مگر ایسا نہیں ہوا۔ جس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر تعلیماتِ نبویہ، اقوالِ صحابہ و تابعین کے مطابق کی ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، خلفاءِ راشدین و سلف صالحین کا مسلک یہی تھا کہ یہ حروف مقطعات اللہ اور اس کے رسول کے درمیان سربستہ راز و اسرار ہیں جنہیں عامۃ الناس کو سمجھانا مقصود نہیں۔ مفسرین کرام نے بھی یہی مسلک اختیار کیا اور یہی حق ہے۔ پھر یہ کہ بعد میں اگر ان حروف کا استعمال عربی زبان میں متروک بھی ہو گیا تو اس سے صحابہ کرام کے علم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر صحابہ کے علم میں ان حروف کے عام فہم معانی ہوتے تو وہ ضرور انہیں عام طور پر بیان فرما دیتے اور مفسرین بھی انہیں ضرور نقل کرتے۔ ثابت ہوا کہ مفسرین نے جو موقف اختیار کیا صحابہ کرام کا نزولِ قرآن کے دور میں وہی موقف تھا۔

مترجم موصوف نے ان حروف کے بارے میں یہ کہہ کر کہ "قرآن مجید کے نزول کے زمانے میں ہر شخص سمجھتا تھا کہ بولنے والے کی ان سے مراد کیا ہے"۔ انہیں محکماتِ قرآن میں شامل کر دیا۔ ایسی صورت میں عہدِ رسالت سے لیکر آج تک امت مسلمہ کا ان کے معانی سے بے خبر رہنا ایسی بات نہ تھی جسے مسلمان کا ذہن آسانی سے قبول کر لے۔ لہٰذا اسے بآسانی ذہن نشین کرانے کے لئے لکھا:

"لیکن یہ ظاہر ہے کہ نہ تو ان حروف کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا انحصار ہے اور نہ یہی بات ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے معنیٰ نہ جانے گا تو اس کے راہِ راست پانے میں کوئی نقص رہ جائے گا لہٰذا ایک عام ناظر کے لیے کچھ ضروری نہیں کہ وہ ان کی تحقیق میں سرگرداں ہو"

اگر ان حروف کو مسلکِ سلفِ صالحین کے مطابق 'متشابہات' سے مان لیا جاتا تو یہ بات قابل قبول ہو سکتی تھی۔ لیکن نزول قرآن کے دور میں ان حروف کو عام فہم قرار

دے کر یہ بات کہنا کہ ان کے معانی سمجھنے پر ہدایت کا انحصار نہیں کسی مسلمان کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ کیسے ممکن ہے کہ عہدِ رسالت کے بعد سے لیکر آج تک اُمتِ مسلمہ ان حروف کے معانی سے لاعلم رہے جنہیں نزولِ قرآن کے وقت ہر شخص سمجھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بار بار تدبّر فی القرآن کی دعوت دی اور یہ دعوت صرف مسلمانوں کے لئے خاص نہیں، کافروں کے لئے بھی عام ہے۔ ارشاد ہوا: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ "کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا اُن کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں"۔ یہ دعوتِ تدبّر قیامت تک کے لئے عام ہے اور متشابہات کے علاوہ قرآن کے ہر لفظ میں تدبّر کا مطالبہ ہے۔ جن الفاظ کے معنیٰ نزولِ قرآن کے وقت ہر مؤمن و کافر نے سمجھے، نزولِ قرآن کے بعد چودہ صدیوں کے طویل زمانہ میں اُمتِ مسلمہ کا ان سے لاعلم ہونا اور اس لاعلمی کی بنا پر ان میں تدبّر سے عاجز و قاصر رہ جانا کسی ذی فہم کے نزدیک قابلِ قبول نہیں سب جانتے ہیں کہ قرآن کا ہر لفظ منبعِ نور و ہدیٰ ہے۔ اس لئے کہ ہدیٰ پوری کتاب کا وصف ہے۔ متشابہات سے ہدایت کا حصول اس طرح ہے کہ ان کے معنیٰ سمجھے بغیر ان پر ایمان بالغیب لاکر کمال طاعت و انقیاد کی سعادت حاصل کی جائے۔ متشابہات کے علاوہ پورا قرآن مفہوم المعنیٰ ہے اور جو الفاظ مفہوم المعنیٰ ہوں ان سے ہدایت کا حصول فہمِ معنیٰ کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر ایک لفظ کے معنیٰ بھی نہ سمجھے گئے تو اس لفظ میں مضمر ہدایت اور نور سے محرومی لازم آئے گی۔ تعجب ہے کہ عہدِ رسالت میں جن حروف مقطعات کے معانی ہر مؤمن و کافر جانتا تھا، آج ان کے معنیٰ سمجھنے کو غیر ضروری قرار دے دیا گیا۔ یہ ایسی جسارت ہے جو کسی ذی علم سے متصور نہیں۔ بعض علماء سے منقول ہے کہ یہ حروفِ مقطعات اللہ تعالیٰ کے نام ہیں، بعض کے نزدیک اسمائے قرآن ہیں اور بعض علماء نے کہا، یہ سورتوں کے نام ہیں[۲]۔ قدوۃ المفسرین ابو طاہر السجاوندی المتوفی سنہ ۶۰۰ھ یا ۶۰۷ھ کا قول حروفِ مقطعات کے بارے میں منقول ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے

درمیان راز ہیں۔ کبھی دو محرم راز ہستیوں کے درمیان مخفی کلمات کے ساتھ باہمی اسرار کی طرف اشارے ہوتے ہیں۔ قاضی بیضاوی، علامہ ابوطاہر السجاوندی و دیگر مفسرین کے مطابق صاحب تفسیر مظہری نے بھی اپنا مسلک بیان کرتے ہوئے فرمایا: وَالْحَقُّ عِنْدِیْ اَنَّهَا مِنَ الْمُتَشَابِهَاتِ وَهِیَ اَسْرَارٌ بَیْنَ اللّٰهِ تَعَالٰی وَبَیْنَ رَسُوْلِهٖ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَمْ یُقْصَدْ بِهَا اِفْهَامُ الْعَامَّةِ بَلْ اِفْهَامُ الرَّسُوْلِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ شَاءَ اِفْهَامَهٗ مِنْ کَمُلِ اَتْبَاعِهٖ۔ یعنی "میرے نزدیک حق یہی ہے کہ یہ حروف مقطعات متشابہات سے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان اسرار ہیں جنہیں عامۃ الناس کو سمجھانا مقصود نہیں بلکہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھانا مقصود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُن متبعین کاملین کو جنہیں اللہ سمجھانا چاہے"۔ اور علامہ سید محمود الوسی نے فرمایا: فَلَا یَعْرِفُهٗ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِلَّا الْاَوْلِیَاءُ الْوَرَثَةُ فَهُمْ یَعْرِفُوْنَهٗ مِنْ تِلْکَ الْحَضْرَةِ وَقَدْ تَنْطِقُ لَهُمُ الْحُرُوْفُ عَمَّا فِیْهَا کَمَا کَانَتْ تَنْطِقُ لِمَنْ سَبَّحَ بِکَفِّهِ الْحَصٰی وَکَلَّمَهُ الضَّبُّ وَالظَّبْیُ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَمَا صَحَّ ذٰلِکَ مِنْ رِّوَایَةِ اَجْدَادِنَا اَهْلِ الْبَیْتِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ۔ یعنی "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان حروف کا علم کسی کو نہیں بجز اولیاء کرام وارثانِ علوم نبوت کے۔ وہ اُن کے معانی جانتے ہیں اور اُنہیں یہ علم بارگاہِ نبوت سے حاصل ہوتا ہے، کبھی یہ حروف خود ناطق ہو کر اولیائے کرام کو اپنے معانی بتا دیتے ہیں جیسا کہ اُس ذاتِ مقدسہ کے حضور ناطق ہو جاتے تھے جن کے دستِ مبارک میں سنگریزوں نے تسبیح کی اور جن سے گوہ اور ہرن نے کلام کیا۔ یہ واقعات ہمارے اجدادِ کرام اہلِ بیت کی روایت سے درجہ صحت کو پہنچ چکے ہیں"۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ

یہ عالی شان کتاب ہے

۳؎ "کتاب" مصدر بمعنیٰ مفعول ہے اور اس سے مُراد قُرآنِ مجید ہے جو تمام کُتب سماویہ کی بُنیادی تعلیمات کا جامع اور سب سے اکمل و افضل ہے۔ بعض لوگوں نے دیگر کُتبِ سماویہ کو قُرآن مجید کے مقابلے میں ناقص کہا، یہ صحیح نہیں۔ ذٰلِكَ اسم اشارہ بعید کے لئے ہے۔ الکتاب اگرچہ صُورۃً قریب ہے لیکن عُلوِّ شان اور بلندی رُتبہ کے اعتبار سے مَعنیً بعید ہے۔ اسی بُعدِ معنوی کی بنا پر ذٰلِكَ فرمایا گیا جو قُربِ صُوری کے منافی نہیں۔ لہٰذا ترجمہ میں قُربِ صُوری اور بُعدِ معنوی کو ملحوظ رکھا گیا۔

لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۚ

اس میں کوئی شک نہیں ہے

۴؎ یعنی یہ بلند رُتبہ کتاب جس کے نزول کا وعدہ آیت کریمہ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا۔ میں سُورۂ بقرہ کے نزول سے پہلے فرمایا گیا اور وُہ کُتبِ سماویہ میں بھی کتابِ مَوعُود ہے۔ صداقت و حقانیت اور چمکتے ہُوئے دلائل و براہین پر مشتمل ایسی روشن کتاب ہے جس میں کسی قسم کے شک و شُبہ کی گنجائش نہیں۔ اگر کہا جائے کہ بے شمار کُفار و منافقین نے قرآن مجید میں شک کیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس میں کوئی شک نہیں کرے گا بلکہ لَا رَیْبَ فِیْہِ فرما کر اس حقیقت کا اظہار فرمایا کہ یہ کتاب اپنی سچائی پر ایسے قوی اور روشن دلائل اپنے اندر لئے ہُوئے ہے جن میں تدبّر کیا جائے تو کسی شک و شُبہ

کو اس میں راہ نہیں مل سکتی. قرآن میں شک نہیں بلکہ شک کرنے والوں کے دلوں میں شک ہے اور وہ اپنے اسی شک میں حیران و پریشان ہیں. جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِنْ كَانَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ "اور ان کے دلوں نے شک کیا تو وہ اپنے ہی شک میں متحیر ہیں"۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۲﴾

پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے ۵

۵ هُدًى مصدر معنیٰ اسم فاعل ہے یعنی یہ کتاب متقیوں کو ہدایت کرنے والی ہے. یہاں یہ شبہ پیدا نہ کیا جائے کہ متقی تو پہلے ہی ہدایت پر ہیں ان کے لئے قرآن کے ہدایت ہونے کے کیا معنیٰ؟ اس لئے کہ اس آیت کا یہ مفہوم نہیں کہ غیر متقین کے لئے قرآن ہدایت نہیں قرآن تو سب لوگوں کے لئے ہدایت ہے جیسا کہ اسی سورۂ بقرہ میں قرآن مجید کے متعلق فرمایا گیا. هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ۔ یعنی "قرآن (سب) لوگوں کیلئے ہدایت اور رہنمائی اور حق و باطل سے جدا کرنے کی روشن دلیلوں کا مجموعہ ہے". هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کا مفہوم یہ ہے کہ قرآنی ہدایت سے فائدہ اٹھانے والے صرف متقین ہیں جیسا کہ قرآن کا شفا اور رحمت ہونا تو سب کے لئے ہے لیکن اس سے نفع اٹھانے والے صرف مؤمنین ہیں. بارش کا ہر قطرہ اپنے اندر رحمت و برکت ہی لیکر آتا ہے لیکن اس کا فائدہ صرف زرخیز زمینوں کو حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس بارش کے پانی سے سیراب ہو کر عمدہ سبزہ، پھل اور پھول اگاتی ہیں مگر شور زمین کو خار و خس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور یہ بھی حق ہے کہ قرآن مجید متقیوں کے لئے ہدایت کو زیادہ کرتا ہے. اور مؤمنین کے لئے شفا اور رحمت کو بڑھاتا ہے. تقویٰ کے معنیٰ ہیں "اپنی جان کو ہر ایسی چیز سے بچانا جس سے نقصان کا

خوف ہو۔" لسانِ شرع میں اپنے آپ کو گناہ سے بچانے کا نام تقویٰ ہے جس کے تین مراتب ہیں۔ ۱۔ شرک سے بیزار ہو کر ہمیشگی کے عذاب سے اپنے آپ کو بچانا ۲۔ ہر گناہ سے بچنا۔ ۳۔ اپنے قلب کو ہر اُس چیز سے پاک رکھنا جو اُسے حق سے غافل کر دے اور سب سے منقطع ہو کر بالکل اُسی کا ہو جانا۔ اس کے بعد متقین کے صفات بیان فرمائے گئے تاکہ قرآن سے ہدایت پانے والے متقین کو پہچاننے میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے۔

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ

جو غیب پر ایمان لاتے ہے ۶

۶ے اِس کتاب (قرآنِ حکیم) سے ہدایت حاصل کرنے والے پرہیزگاروں کی پہلی صفت یہ ہے کہ وُہ غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ ایمان کی حقیقت "تصدیقِ قلبی" ہے جو اقرارِ لسانی کے بغیر معتبر نہیں۔ "غیب" وُہ ہے جس کے اِدراک سے حس اور بداہتِ عقل عاجز ہو، اس کی دو قسمیں ہیں: ایک وُہ جس پر کوئی ایسی دلیل قائم ہو جس کے ذریعے ہر شخص اسے جان سکے۔ دُوسری قسم وُہ غیب ہے جس پر کوئی ایسی دلیل قائم نہ ہو اور وُہ اللہ تعالیٰ کا غیبِ خاص ہے۔ نصِ قرآنی وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ اور فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ میں یہی غیبِ خاص مُراد ہے۔ جس کا علم تعلیمِ حق کے بغیر کسی کے لئے ممکن نہیں۔ زبانِ نبوت سے ہمیں جن حقائقِ غیبیہ کا علم ہُوا۔ اُن سب کی تصدیقِ قلبی اور اقرارِ لسانی تقویٰ کی بنیاد اور ایمان بالغیب ہے۔

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ

اور نماز قائم رکھتے ہیں ۷ے

۷؎ قرآن سے ہدایت حاصل کرنے والوں کی دوسری صفت "اقامتِ صلوٰۃ" ہے۔ ایمان کی بنیاد پر عمل قائم ہوتا ہے۔ تمام اعمالِ صالحہ اور عبادات میں نماز سب سے افضل ہے کیونکہ یہ جامع العبادات ہے۔ اسلام کی پانچوں بنیادوں کی حقیقتیں نماز میں پائی جاتی ہیں اسی لئے نماز کو دین کا ستون قرار دیا گیا۔ اقامتِ صلوٰۃ کے معنیٰ صرف نماز پڑھنا نہیں بلکہ شرائط و آداب کے ساتھ نماز پڑھتے رہنا اور اس کے نظام کو استحکام کے ساتھ برپا رکھنا اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم ہے۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾

اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں ۸؎

۸؎ پرہیزگاروں کی تیسری صفت ہے "اللہ کی دی ہوئی روزی سے نیک کاموں میں خرچ کرنا"۔ اس سے زکوٰۃ بھی مراد ہو سکتی ہے کیونکہ قرآن مجید میں صلوٰۃ کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر بکثرت وارد ہوا ہے۔ اور مطلقاً اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بھی مراد ہو سکتا ہے جس میں زکوٰۃ کے علاوہ دیگر صدقاتِ واجبہ و نافلہ سب شامل ہیں بلکہ جن صدقات کا ثواب ارواحِ مؤمنین بزرگانِ دین کو وقتاً فوقتاً پہنچایا جاتا ہے وہ سب بھی اس آیت کے عموم میں شامل ہیں۔ صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اِنَّ اُمِّیَ افْتُلِتَتْ نَفْسُہَا وَاَظُنُّہَا لَوْ تَکَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ فَہَلْ لَّہَا اَجْرٌ اِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْہَا قَالَ نَعَمْ۔ "کسی شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی کہ میری ماں اچانک فوت ہو گئی، میرا گمان ہے کہ اگر وہ کچھ بول سکتی تو صدقہ کرتی، تو کیا اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو اسے ثواب ملے گا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم نے فرمایا "ہاں"۔ صحیح بخاری کی ایک اور حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اَنَّ سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ تُوُفِّيَتْ اُمُّهٗ وَهُوَ غَائِبٌ عَنْهَا فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اُمِّيْ تُوُفِّيَتْ وَاَنَا غَائِبٌ عَنْهَا اَيَنْفَعُهَا شَيْءٌ اِنْ تَصَدَّقْتُ بِهٖ عَنْهَا قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاِنِّيْ اُشْهِدُكَ اَنَّ حَائِطِيَ الْمِخْرَافَ صَدَقَةٌ عَلَيْهَا۔ "سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ کی جب وفات ہوئی تو وہ اپنی والدہ کے پاس نہ تھے اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی "یا رسول اللہ میری ماں وفات پاگئی اور میں اُس کے پاس موجود نہ تھا، کیا اگر میں اُس کی طرف سے صدقہ کروں تو اُسے وہ چیز نفع پہنچائیگی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں" حضرت سعد نے عرض کی تو یا رسول اللہ میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میرا قطار در قطار لگایا ہوا باغ "مخراف" میری والدہ پر صدقہ ہے۔ مشکوٰۃ کی ایک اور حدیث میں ہے: عَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اُمَّ سَعْدٍ مَاتَتْ فَاَيُّ الصَّدَقَةِ اَفْضَلُ قَالَ الْمَاءُ فَحَفَرَ بِئْرًا وَقَالَ هٰذِهٖ لِاُمِّ سَعْدٍ۔ "سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اُنہوں نے عرض کی یا رسول اللہ، میری والدہ وفات پاگئی تو کونسا صدقہ افضل ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "پانی" تو حضرت سعد نے ایک کنواں کھدوایا اور کہہ دیا کہ یہ "ام سعد" کے لیے ہے"۔ جس کنوئیں کا ثواب حضرت سعد نے اپنی ماں کو پہنچایا هٰذِهٖ لِاُمِّ سَعْدٍ کہہ کر اُسے اپنی ماں کے نام کی طرف منسوب کر دیا، معلوم ہوا کہ جس چیز کا ثواب کسی بزرگ کو پہنچایا جائے اُس بزرگ کے نام اُس چیز کو منسوب کرنا جائز ہے۔

فائدہ۔ ایصالِ ثواب صدقاتِ مالیہ کے ساتھ مختص نہیں بلکہ عباداتِ بدنیہ کا ثواب بھی دوسرے کو پہنچایا جا سکتا ہے ابراہیم بن صالح سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں میں نے اپنے باپ سے سنا کہ ہم حج کرنے جا رہے تھے، ایک شخص (ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا کہ تمہارے علاقے میں (بصرہ کے قریب ایک مشہور) شہر اُبلّہ ہے۔

(جہاں نہر فرات کے کنارے مسجد عشار ہے) مَنْ یَضْمَنُ لِیْ مِنْکُمْ اَنْ یُصَلِّیَ لِیْ فِیْ مَسْجِدِ الْعُشَّارِ رَکْعَتَیْنِ اَوْ اَرْبَعًا وَیَقُوْلُ هٰذِهٖ لِاَبِیْ هُرَیْرَةَ سَمِعْتُ خَلِیْلِیْ اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ یَبْعَثُ مِنْ مَّسْجِدِ الْعُشَّارِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ شُهَدَاءَ لَا یَقُوْمُ مَعَ شُهَدَاءِ بَدْرٍ غَیْرُهُمْ "تم میں سے کون میرے لئے ذمہ داری اٹھاتا ہے کہ وہ مسجد عشار میں میرے لئے دو یا چار رکعتیں نماز پڑھے اور کہے کہ یہ نماز ابوہریرہ کے لئے ہے۔ میں نے اپنے محبوب ابوالقاسم (رسول اللہ) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا۔ حضور فرماتے تھے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مسجد عشار سے (ایسے) شہداء کو اٹھائے گا کہ شہداء بدر کے ساتھ ان کے سوا کوئی کھڑا نہ ہو سکے گا۔" ملا علی قاری نے فرمایا یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ شہداء اس امت سے ہیں یا امم سابقہ سے۔ مسجد عشار کے متعلق محدثین کا قول ہے کہ مسجد عشار ایک قدیم ترین مسجد ہے جہاں برکت حاصل کرنے کے لئے لوگ نمازیں پڑھتے ہیں حضرت ابوہریرہ کی اس حدیث سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے۔ اس حدیث سے عبادت بدنیہ کا ثواب دوسرے کو پہنچانے کے علاوہ یہ بھی ثابت ہوا کہ زندہ کے لئے بھی ایصال ثواب جائز ہے نیز اس سے یہ امر بھی ثابت ہوا کہ مسجد سے شہداء اور صالحین کا قرب اس میں نماز پڑھنے کی فضیلت کا سبب ہے

"مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ" کی تفسیر میں صاحب کتاب وجیز امام واحدی متوفی ۴۶۸ھ نے فرمایا۔ (وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ) اَعْطَیْنٰهُمْ بِمَا یَنْتَفِعُوْنَ بِهٖ (یُنْفِقُوْنَ) یُخْرِجُوْنَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ۔ اس تفسیر کی روشنی میں آیت کریمہ کا مفہوم یہ قرار پائیگا کہ پرہیزگار وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ہر عطا اور اس کی ہر نعمت سے جس کا وہ فائدہ اٹھاتے ہیں اسی کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ اپنی اولاد اور مال کو جہاد فی سبیل اللہ میں قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے، اسی کی طرف اپنے دل کو متوجہ رکھتے ہیں، ان کا آنکھ سے دیکھنا، کان سے سننا، ہاتھ پاؤں سے کام کرنا رضائے الٰہی کے خلاف نہیں ہوتا۔ وہ اللہ کی خوشنودی کے لئے اپنے علم و عمل سے

لوگوں کو نفع پہنچاتے ہیں اور اللہ کی دی ہوئی کسی نعمت کو اُس کی رضا کے خلاف کام میں نہیں لاتے قیامت کے دن کی اُس جوابطلبی سے وہ ڈرتے ہیں جس کا ذکر قرآن مجید میں وارد ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا "بیشک کان، آنکھ اور دل سب کے متعلق سوال کیا جائے گا" نیز فرمایا: ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ "پھر قیامت کے دن اللہ کی نعمتوں کے متعلق تم سے ضرور پُوچھا جائے گا" ظاہر ہے کہ سب نعمتیں بیک وقت خرچ نہیں ہوتیں لیکن جس وقت بھی جو نعمت خرچ کی جاتی ہے، مُتقی اُسے کارِ خیر ہی میں خرچ کرتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ

اور جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ کی طرف اُتارا گیا اور جو آپ سے پہلے اُتارا گیا ۹

۹ مُتقین کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وُہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضُور سے پہلے تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل کی ہُوئی ہر چیز پر ایمان لاتے ہیں. تقویٰ کی بُنیاد یہ ہے کہ اللہ کی بھیجی ہُوئی ہر وحی اور اس کی نازل کی ہُوئی ہر چیز پر ایمان لایا جائے، خواہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل کی گئی ہو یا حضُور سے پہلے کسی نبی یا رسُول پر اُتری ہو۔ "وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ" تک مُتقین کی جو صفات بیان ہُوئیں اُن کی روشنی میں متقین سے بظاہر وہی لوگ مفہُوم ہوتے تھے جو جاہلیت سے تائب ہو کر ایمان لائے۔ اِس چوتھی صِفت کے ذکر سے مُتقین کے مفہُوم میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے جو اہلِ کتاب تھے اور یہُودیت و نصرانیت سے نکل کر حلقہ بگوشِ اسلام ہُوئے۔ اِس چوتھی صفت کے

بیان کا ایک مفاد یہ بھی ہے کہ اسلام کی جامعیت اور ہمہ گیری کا اظہار ہو جائے اور ہر وہ شخص جو کسی آسمانی کتاب یا وحیِ الٰہی پر یقین رکھتا ہے جان لے کہ قرآن کسی نبی پر نازل کی ہوئی کسی کتاب یا وحی کا مخالف نہیں بلکہ اللہ کی ہر وحی اور آسمانی کتاب پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیتا ہے۔ قرآن کسی انوکھے دین کی طرف دعوت دے کر تفریق کا داعی نہیں بلکہ جن لوگوں نے بعض انبیاء کی وحی ماننے کے باوجود بعض دیگر انبیاء علیہم السلام کی وحی کا انکار کر کے فرقہ بندی کی راہ اختیار کی، قرآن انہیں حق قبول کرنے کی بنیاد پر اتحاد و اتفاق کی دعوت دیتا ہے اور اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اتفاق و اتحاد کے یہ معنیٰ نہیں کہ حق کو چھوڑ کر باطل کو قبول کر لیا جائے بلکہ قرآنی اتحاد یہی ہے کہ باطل سے کنارہ کشی کر کے حق کو اختیار کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل حق نے حق کو چھوڑ کر باطل سے کبھی اتحاد نہیں کیا۔ نیز یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ کوئی آسمانی وحی کسی دوسری وحی آسمانی کے خلاف نہیں۔ کیونکہ قرآن ہر وحی پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ دو مختلف باتوں پر بیک وقت ایمان لانا اور ان پر یقین رکھنا ممکن نہیں۔

"وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ"۔ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد کسی پر وحیِ نبوت نازل نہ ہو گی۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم آخری نبی ہیں۔ بیشک عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں ان کی نبوت سلب نہیں ہوئی اور نہ ہو گی، مگر ان کی بعثت حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے پہلے ہو چکی ہے اس لیے ان کا نازل ہونا ختم نبوت کے منافی نہیں۔ وہ سابقہ حیات کے ساتھ آسمان پر زندہ ہیں اور اسی حیات کے ساتھ قیامت کے قریب نازل ہوں گے مگر بعثتِ محمدی کے بعد وہ آسمان پر ہوں یا زمین پر، نبی ہونے کے باوجود تا حیات حضور کے امتی ہی کی حیثیت میں رہیں گے۔ اس لیے اگر ان پر کوئی وحی آئے تو وہ وحیِ ولایت ہی کی حیثیت میں ہو گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد کسی کو نبوت نہ ملے گی۔ اور کسی پر ایسی وحی

نازل نہ ہوگی جس پر ایمان لائے بغیر کوئی مؤمن نہ ہو سکے۔ اس قسم کی وحی حضور پر اور حضور سے پہلے نازل ہو چکی۔ حضور کی بعثت کے بعد اُس کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہے۔

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵

اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں ۱۰ وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔

۱۰ یہ متقین کی پانچویں صفت ہے۔ قیامت پر یقین رکھنا پہلی تمام صفات کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ دنیا دار العمل اور آخرت دار الجزاء ہے۔ جس شخص کا یقین یوم جزا پر نہ ہو اُسکا عمل بے بنیاد ہے۔ تمام آسمانی کتابوں اور قرآنی تعلیمات کا خلاصہ یہی ہے کہ دنیا میں جیسا عمل ہوگا، آخرت میں اُس کی جزاء ویسی ہی ملے گی۔ جس کا یقین قیامت پر نہ ہو وہ کبھی بُرائی سے بچ سکتا ہے اور نہ کوئی نیکی کر سکتا ہے۔ بلکہ اُس کے لئے نیکی بدی کا تصور ہی بے معنیٰ ہے۔ کفر و شرک اور ہر قسم کے گناہ سے بچ کر ایمان و اعمالِ صالحہ کو اختیار کرنا اُنہی لوگوں کی شان ہے جو قیامت پر یقین رکھتے ہیں۔

تنبیہ۔ اِن آیات میں وہ لوگ مُراد نہیں جو ایمان لانے کے باوجود راسخ الایمان نہ ہوئے اور ایمان کی لذت اُنہوں نے محسوس نہیں کی۔ اُنہیں میں سے کچھ بدنصیب مُرتد ہو کر دوبارہ کفر کے گڑھے میں جا گرے اور ہمیشہ کے لئے "ہدیٰ" اور "فلاح" کی نعمت سے محروم ہو گئے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ، بلکہ ان تمام آیات میں "هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" تک مؤمنین کاملین مُراد ہیں جو قرآنی ہدایت سے نفع اُٹھا کر یقینِ محکم اور ایمان کامل کی دولت سے مالا مال ہوئے۔

عبادات اور اعمالِ صالحہ کو انہوں نے خوشی سے اختیار کیا، تقویٰ کی حقیقت کو انہوں نے پالیا۔ ایمان اُن کے دِلوں میں راسخ ہو گیا۔ اور اس کی حلاوت اُنہیں محسوس ہونے لگی کفر سے اُنہیں ایسی نفرت اور کراہت پیدا ہو گئی کہ وُہ اُسے بھڑکتی ہوئی آگ تصور کرنے لگے۔ اُن کے لئے ایمان چھوڑ کر کفر اختیار کرنا ممکن نہ رہا۔ ان خوش نصیبوں کے حق میں اللہ تعالیٰ نے "اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ" فرما کر اُن کے ایمان پر مُہرِ تصدیق ثبت فرما دی اور "وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" ارشاد فرما کر اُنہیں فلاح دارین اور نعمائے جنت کی بشارت دے دی۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا
سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ
لَا يُؤْمِنُونَ ۝٦ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ
وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ
وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝٧

بے شک جو لوگ کفر میں راسخ ہو چکے ان کے لئے برابر ہے کہ آپ اُنھیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہ لائیں گے [11] اللہ نے اُن کے دِلوں اور ان کے کانوں پر مہر ثبت کر دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

---

[11] کفر کے بعد جو لوگ ایمان لائے اُن کے دلوں میں کفر ایسا راسخ نہ ہُوا تھا جس کے باعث حق قبول کرنے کی صلاحیت اُن میں باقی نہ رہی ہو۔ یہ آیتِ کریمہ اُن کے حق میں نازل نہیں ہوئی، اس کا نزول اُنہی کفار کے حق میں ہُوا جن کے دلوں میں کفر راسخ ہو کر اُن کے

رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بُغض و عناد کے باعث وہ اپنے کُفر پر شدت کے ساتھ مُصِر رہے اور حق قبول کرنے کی کوئی صلاحیت اُن میں باقی نہ رہی اِس لئے مرتے دم تک وُہ ایمان نہ لائے۔ جیسے ابُوجہل، ابُولہب وغیرہ۔ یہ صحیح ہے کہ علمِ الٰہی میں وہ ایمان لانے والے نہ تھے لیکن اللہ نے اُنہیں کُفر پر مجبُور نہیں کیا، نہ ہی اُن کے دلوں پر پہلے سے مُہر لگائی بلکہ اُنہوں نے اپنے کُفر میں ایسی سرکشی اِختیار کی جس کے سبب اُن کے دل حق قبول کرنے، ان کے کان حق سُننے کے قابل نہ رہے۔ اور نہ اُن کی آنکھوں میں یہ صلاحیت رہی کہ وُہ حق کو دیکھ سکیں۔ یہی وُہ مُہر ہے جس کا ذکر خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ میں فرمایا گیا جو اُن کے اپنے کُفر کا نتیجہ ہے۔ لَا یُؤْمِنُوْنَ فرما کر اللہ تعالیٰ نے اُن کے خُود اِختیاری کُفر پر مُہر لگا دی اور وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ کی وعید شدید اُنہیں سُنا دی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸

اور لوگوں میں سے کچھ وُہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور قیامت کے دِن پر ایمان لائے ہے۔۱۲ حالانکہ وُہ مؤمن نہیں۔ ہے۔۱۳

ہے۔۱۲ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ سے لیکر هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ تک مؤمنین کاملین کا بیان تھا۔ اِس کے بعد اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ تک شدید ترین کُفار کا ذکر ہُوا۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کا ذکر فرمایا۔ منافق وُہ ہے جو زُبان سے ایمان کا اظہار کرے اور اُس کے دل میں کُفر پوشیدہ ہو۔ کُفر و ایمان کے اعتبار سے اِنسانوں کی یہی تین قسمیں تھیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بالترتیب بیان فرما دیا۔ کُفر اگرچہ اکبر کبائر سے ہے لیکن نفاق اس سے بھی

بدتر ہے۔ کفار اور مشرکین نے مسلمانوں کو بے انتہا تکلیفیں پہنچائیں مگر منافقین کی ایذا رسانی سب سے بڑھ گئی۔ اسی لئے فرمایا: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (نساء آیت ۱۴۵) "بیشک منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہیں"

۱۳ھ محض زبان سے ایمان کا اظہار بے کار ہے جب تک دل میں تصدیق نہ ہو۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ
وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

وُہ (اپنے خیال میں) دھوکہ دیتے ہیں اللہ کو ۱۴ھ اور ایمان والوں کو اور وُہ دھوکہ نہیں دیتے مگر اپنی جانوں کو اور وُہ نہیں سمجھتے۔

۱۴ھ منافقین اللہ کو نہیں بلکہ اللہ کے رسُول کو دھوکہ دینا چاہتے تھے مگر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ کے نائب اور اس کے خلیفہ ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسُول کے معاملہ کو اپنا معاملہ قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ میرے رسُول کو دھوکہ دینا مجھ ہی کو دھوکہ دینا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (نساء، آیت ۸۰) یعنی رسُول کی اطاعت میری ہی اطاعت ہے۔" اور فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (فتح، آیت ۱۰) یعنی "رسول کی بیعت اللہ ہی کی بیعت ہے۔" يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ۔ یعنی "رسول کا ہاتھ اللہ ہی کا ہاتھ ہے۔" اللہ تعالیٰ نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے واسطہ سے مؤمنین پر بھی اُن کی اِس دھوکہ دہی کا اِظہار فرمادیا اور اُنکی فریب کاری اور دھوکہ دہی کا سارا وبال

اُنہی پر لوٹ گیا۔ مخفی نہ رہے کہ منافقین ایمان والوں کو دھوکہ دینے کے لئے جو باتیں اُن کے رُوبرو کرتے تھے اُن میں انتہائی مُبالغہ آرائی سے کام لیتے تھے اِس لئے یَخْدَعُوْنَ کی بجائے یُخٰدِعُوْنَ صرف مبالغہ کے لئے فرمایا گیا۔

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَ
هُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ
بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ⑩

اُن کے دِلوں میں بیماری ہے ۱۵ پھر اللہ نے اُن کی بیماری بڑھا دی اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے اِس لئے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ ۱۶

۱۵ مَرَضٌ سے مُراد شک، نفاق اَور بُغض وحَسد ہے، یہی روگ اُن کے دِلوں کو لگا ہُوا تھا اَور اسی مرض میں وُہ مُبتلا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اِس مَرض کو اور بڑھا دیا۔ اِس طرح کہ جس قدر قُرآن نازل ہوتا گیا، اُن کا شک اور نفاق بڑھتا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اسلام اور مُسلمانوں کو جتنا غلبہ عطا فرمایا اور جس قدر شوکت بڑھائی اُسی قدر اُن کا بُغض وحسد اور نفاق بھی بڑھتا چلا گیا۔

۱۶ اُن کے دِلوں میں کُفر ہوتا تھا اور زبان سے اٰمَنَّا کہہ کر جھوٹ بولتے تھے۔ اسی سَبَب سے اُن کے لِئے دردناک عذاب ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا

فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ
مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ
وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور جب اُنہیں کہا جاتے کہ زمین میں فساد نہ کرو۔ تو وُہ کہتے ہیں ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں۔ ﴿۱۱﴾ سُن لو یقیناً وہی فساد کرنے والے ہیں مگر سمجھتے نہیں۔

﴿۱۱﴾ نفاق اختیار کرنے سے منافقین کا بُنیادی مقصد یہ تھا کہ اسلام مِٹ جائے اور مُسلمان ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں۔ اِسی ناپاک مقصد کے پیشِ نظر وُہ لوگوں کو اسلام سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے، مُسلمانوں کے خِلاف کافروں کو بھڑکاتے اور فتنہ و فساد برپا کرنے میں مشغُول رہتے تھے۔ جب اُن سے کہا جاتا کہ تُم زمین میں فساد نہ پھیلاؤ، تو وُہ جواب دیتے کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں۔ مرضِ نفاق نے اُن کے دل و دماغ کو اِس قدر ماؤف کر دیا تھا کہ اُنہوں نے بدی کو نیکی اور بیماری کو تندرستی سمجھ لیا، اللہ کی طرف سے نازل کی ہُوئی اصلاح کو فساد اور اپنے فساد کو اِصلاح تصوّر کرنے لگے۔ اِس میں شک نہیں کہ جہالت و ضلالت کے ہر دُور میں حق کو باطِل اور باطِل کو حق کہا گیا، اصلاح کی دعوت کو دُنیا پرستوں نے ہمیشہ یہی کہہ کر رَد کیا کہ اس نئی آواز سے اِختلاف اور فرقہ بندی کی وبا پھیل جائے گی۔ لہٰذا لوگ جس حال پر ہیں اُنہیں اُسی حال پر آرام و سکُون کے ساتھ رہنے دیا جائے۔ حالانکہ جہالت اور گمراہی خُود ایسے مُہلک اَمراض ہیں کہ اگر اُن کا ازالہ نہ کیا جائے تو علم و حکمت اور ہدایت کے ساتھ بنی نوعِ انسان کا زندہ رہنا ممکن نہ رہے۔ اِسی لئے

اللہ تعالیٰ نے بطریقِ ابلغ مُنافقین کا رَد فرماتے ہوئے اِرشاد فرمایا، اے سادہ لوح اِنسانو! خبردار ہو جاؤ کہ یہ مُنافق اِصلاح کے دعوے میں جھوٹے ہیں بلکہ یہی لوگ فسادی ہیں مگر انہیں شعُور نہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ
اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ
السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ
وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسے (اور) لوگ[۱۸] ایمان لائے (تو) کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جس طرح بیوقوف ایمان لائے؟ سُن لو! یقیناً وہی بیوقوف ہیں مگر وُہ نہیں جانتے۔

---

۱۸ یہاں اَلنَّاس سے حضرت ابُوبکر صدیق، حضرت عُمر فاروق، حضرت عُثمان غنی، حضرت علی مُرتضیٰ، اہلبیت اطہار و دیگر مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم اجمعین مُراد ہیں جو کسی خواہشِ نفسانی، طمعِ دُنیوی یا جان و مال کے خوف کی وجہ سے ایمان نہیں لائے تھے اُن کا اِیمان محض رضائے الٰہی کے لئے تھا۔ وُہ سچے دل سے ایمان لائے اور کامل اخلاص کے ساتھ اُنہوں نے اِسلام قبُول کیا۔ بخلاف منافقین کے کہ وہ طمعِ دنیوی، بدنیتی، شرپسندی اور فتنہ انگیزی کے لئے بظاہر مُسلمان ہوئے اور بعض جان کے خوف سے محض زبانی کلمہ پڑھنے لگے۔ جب مُسلمانوں نے اُن سے کہا کہ تُم ایسا ایمان لاؤ جیسا کہ تُم سے پہلے مؤمنین مخلصین ایمان

لا چکے ہیں۔ تو اُنہوں نے کہا کہ ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لانے کے لئے تیار نہیں منافقین نے اپنی جہالت و حماقت کے باعث نفاق کو عقلمندی اور مؤمنین مخلصین کے اخلاص کو بیوقوفی سے تعبیر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کا ردِ بلیغ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ "وُہ خُود ہی بیوقوف ہیں مگر جانتے نہیں"۔ اِس آیت سے ثابت ہُوا کہ اَسلاف کرام کی اِتباع مطلوب عند الشرع ہے اُن پر لعن طعن کرنے والا خُود ملعُون و مطعُون ہے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾

اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے ۱۹ اور جب اپنے شیطانوں ۲۰ کے پاس اکیلے ہوتے ہیں (تو) کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو صرف مخول کرتے ہیں۔ اللہ ان کے مخول کا اُنہیں بدلہ دیتا ہے اور اُن کی سرکشی میں اُنہیں کھینچتا ہے۔ اس حال میں کہ وُہ بھٹکتے ہیں۔

۱۹ اِس آیت میں منافقین کے نفاق کا بیان ہے کہ وُہ مؤمنوں سے ملتے وقت

اٰمَنَّا کہتے تھے۔ اور اپنے شیاطین رُوَسا، کُفار کے پاس جاکر اُن کی مَعیت کا دم بھرتے اور اپنے کُفرِ قلبی کا اُنہیں یقین دلاتے تھے۔ **شانِ نزول** حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مَروی ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن اُبَیّ (رئیس المنافقین) اور اُس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہُوئی۔ ایک دن عبداللہ بن اُبَیّ نے صحابہ کرام کی ایک جماعت کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ دیکھنا اِن بیوقوفوں کو میں تم سے کس طرح واپس لوٹاتا ہُوں۔ عبداللہ بن اُبَیّ نے آگے بڑھ کر حضرت ابُوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دستِ مُبارک اپنے ہاتھ میں لیا اور آپ کی تعریف کرتے ہوئے کہا، مرحبا اے بنی تیم کے سردار، شیخ الاسلام ثانیِ اثنین فِی الغَارِ، اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ کرنے والے۔ پھر حضرت عُمر رضی اللہ عنہ کا مقدس ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا، مرحبا اے بنی عدی بن کعب کے سردار، فاروق، اللہ کے دین میں قوی، رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جان و مال قُربان کرنے والے پھر حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہُ الکریم کا مُبارک ہاتھ پکڑ کر کہا، مرحبا اے حضُور کے چچازاد، حضُور کے داماد، حضُور کے سوا تمام بنی ہاشم کے سردار۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اے عبداللہ بن اُبَیّ، اللہ سے ڈر، منافق نہ بن، منافق اللہ کی بدترین مخلُوق ہیں۔ عبداللہ بن اُبَیّ نے کہا اے ابُوالحسن ذرا ٹھہریئے خُدا کی قسم میں نے یہ باتیں از راہِ نفاق نہیں کہیں، ہمارا ایمان اور تصدیق آپ ہی لوگوں کی طرح ہے۔ ان صحابہ کرام کے تشریف لے جانے کے بعد عبداللہ بن اُبَیّ نے اپنے ساتھیوں سے کہا، تم نے دیکھا (معاذ اللہ) میں نے اُنہیں کیسا بے وقوف بنایا؟ اِس پر وُہ اُسکی تعریف کرنے لگے، صحابہ کرام نے واپس آکر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ واقعہ سُنایا، اِس پر یہ آیت نازل ہُوئی۔[1]

۲۰؎ "شیاطین" سے رؤسا کُفار مُراد ہیں۔ یہی لوگ منافقین کی سرپرستی کرنے والے تھے جن کا تعلق مختلف قبائل سے تھا مثلاً: کعب بن اشرف، ابُوبُردہ اسلمی، عبدالدار جُہنی، عوف بن عامر، عبداللہ بن سواد یہ لوگ اپنے کُفر میں انتہائی سرکش تھے جس کے باعث

انہیں شیاطین سے تعبیر فرمایا گیا۔ مُنافقوں کا اپنی خاص مجلسوں میں مُسلمانوں کا مذاق اُڑانا اُن کے دِلوں کا وہ کُفر تھا جسے وہ مُسلمانوں سے چھُپاتے تھے اور اپنے شیاطین کے پاس خلوت میں ظاہر کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا منافق مُسلمانوں کا جو مذاق اُڑاتے ہیں اُس کا بدلہ ہم اُنہیں دیں گے۔ یہاں مُنافقین کے استہزاء کے بدلے کو استہزاء سے تعبیر فرمایا ایسا ہی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں سَیِّئَۃ کی جزا کو سَیِّئَۃ سے تعبیر فرمایا گیا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ
فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا
مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾

یہی وُہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گُمراہی خریدی تو ان کی تجارت نے اُنہیں کچھ نفع نہ دیا اور نہ وہ ہدایت یافتہ ہُوئے۔ [۲۱]

[۲۱] بیشک وُہ ہدایت سے محروم تھے مگر ھُدًی لِّلنَّاسِ والی قرآنی ہدایت اُن کے پاس آچکی تھی جسے محض دُنیوی منفعت کی خاطر چھوڑ کر اُنہوں نے کُفر و نفاق کی ضلالت کو اختیار کیا مگر ذِلّت و رُسوائی کے سوا اُنہیں کچھ نہ ملا اور وہ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ کا مصداق بن کر رہ گئے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي
اسْتَوْقَدَ نَارًا ۖ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ

اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا
يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا
يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾

ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی پھر جب اس آگ نے اُس کا آس پاس روشن کر دیا تو اللہ ان کے نُور کو لے گیا۔ اور اُنہیں تاریکیوں میں چھوڑ دیا کہ وُہ (کچھ) نہیں دیکھتے بہرے گُونگے، اندھے ہیں پس وُہ (ہدایت کی طرف) نہیں لَوٹیں گے ﴿۲۲﴾

۲۲؎ لفظِ مَثَلٌ، مِثْلٌ اور مَثِیْلٌ تینوں کے مَعنٰی اصل میں نظیر ہیں۔ پھر لفظِ مَثَلٌ کا استعمال بطورِ مثال بولے جانیوالے قولِ مشہُور کے معنٰی میں ہونے لگا، جسے اُردو میں کہاوت کہتے ہیں۔ اِس کے بعد ایسی اہم صفت یا حال یا قصّہ کے لئے لفظ مَثَلٌ مستعمل ہونے لگا جس میں عجیب وغریب ہونے کا کوئی پہلُو پایا جائے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے، مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ۔ اور فرمایا۔ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی۔ علّامہ خازن نے فرمایا پُوشیدہ چیز کو ظاہر چیز کے ساتھ تشبیہہ دینا مَثَل ہے۔ کفر و نفاق سے نفرت دلانے اور اس نفرت کو دلوں میں پختہ کرنے کے لئے اللہ تعالٰی نے منافقین کے عجیب وغریب حال کی تشبیہ اُن لوگوں کے حال سے دی جو رات کی تاریکیوں میں جنگل میں پڑے ہوں جہاں اُنہیں مہلک خطرات کا سامنا ہو۔ سخت تاریکی کے باعث اُنہیں کچھ نظر نہ آتا ہو، اندھیرے میں وُہ کوئی ایسی چیز نہ دیکھ سکتے ہوں جو بروقت اُن کے بچاؤ کا کام دے سکے۔ اُنہوں نے آگ روشن کی جب اُن کا گرد و پیش روشن ہو گیا اور اس کی روشنی میں اُنہوں نے کچھ سکُون پایا تو اچانک آگ بجھ گئی اور وُہ اس کی

روشنی سے محروم ہو کر پہلے سے زیادہ تاریکیوں میں مُبتلا ہو گئے۔ منافقین کا حال ایسا ہی تھا کہ وُہ وادیٔ حیرت میں اپنے کُفرِ قلبی کی تاریکیوں میں پڑے ہُوئے تھے۔ اُنہیں ہر وقت یہی خوف لاحق تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ مُجاہدینِ اسلام ہمیں تہہ تیغ کر دیں اور ہمارے عیال و اَموال کو غنیمت بنا کر ہمارے کیفرِ کردار تک ہمیں پہنچا دیں، اِس لئے اُنہوں نے ازراہِ نفاق آمَنَّا کہہ کر گویا آگ روشن کی اور اُس کی روشنی میں اُنہوں نے اپنی جان و مال اور اَولاد کو محفُوظ پایا اور مُجاہدین کے ساتھ اموالِ غنیمت میں بھی شریک رہے۔ اُن کے لئے اُن کی آگ کا نُور بس اِن ہی فوائد کا حصُول تھا۔ جب اُنہیں مَوت آئی تو ان کی وُہ آگ بجھ گئی، اس کا نُور چلا گیا اور وُہ اس سے مَحرُوم ہو کر پہلے سے زیادہ ظُلمات و خطرات یعنی عذابِ الیم میں مُبتلا ہو گئے۔ ایک قَول یہ ہے کہ اُن کا نُور چلے جانے سے مُراد یہ ہے کہ زبانِ رسالت نے مؤمنین پر منافقین کے کُفرِ قلبی کا اظہار فرما دیا۔ جس کے بعد وُہ آمَنَّا کہنے کے فوائد سے مَحرُوم ہو گئے اور مزید ذلت و رسوائی اُٹھا کر پہلے سے زیادہ تاریکیوں میں جا پڑے۔ اب اُن کا یہ حال ہے کہ حق سُننے سے بہرے، حق بولنے سے گونگے، حق دیکھنے سے اندھے ہو چکے ہیں، اس کے بعد وُہ حق کی طرف کبھی رجُوع نہ کریں گے۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ

ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ

اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ

حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾

یا مثل بارش کے جو آسمان سے برسے اِس میں تاریکیاں ہیں اور گرج اور چمک وُہ

داخل کرتے ہیں اپنی اُنگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے سبب موت کے ڈر سے ۲۳ھ
اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔

۲۳ھ اللہ تعالیٰ نے منافقین کی مزید تذلیل و تضحیک کے لئے ایک اور مثل بیان فرماتے ہوئے اِرشاد فرمایا: اَوْ كَصَيِّبٍ یہاں "اَوْ" شک کے لئے نہیں بلکہ تساوی اور تخییر کے لئے ہے یعنی یہ دونوں مثالیں برابر ہیں۔ مخاطب کو اختیار ہے کہ منافقین کی عجیب و غریب بدحالی سمجھنے کے لئے دونوں میں سے جسے چاہے اِختیار کرلے۔ اِس آیت میں مُضاف محذوف ہے اور "صَيِّبٍ" سے مُراد اَصحابِ صیّب ہیں۔ "صیّب" بارش کو کہتے ہیں جس سے نزولِ قرآن مُراد ہے۔ "سَمَاء" سے بادل اور ظُلمات سے جا بجا کُفر کا ذکر مُراد ہے یا عباداتِ شاقہ۔ "رَعْدٌ" سے عقوبت و عذاب کی وعیدیں اور "بَرْق" سے فتوحات و غنائم یا چمکتے ہوئے روشن دلائل مُراد ہیں[1]۔ یُوں سمجھئے کہ ہر طرف گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی نزولِ قرآن کی صُورت میں ابرِ رحمت برس رہا تھا۔ جس میں منافقین کے کفر و نفاق کا ذکر تاریکیوں کا ہیبت ناک منظر پیش کر رہا تھا، یا عباداتِ شاقہ کی مشقتیں اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ میں پیش آنیوالی مصیبتیں اُن کے لئے گویا ظلمتوں کی صُورت میں نازل ہو رہی تھیں۔ اِس بارش یعنی قرآن مجید میں وعیدِ عذاب کی گرج بھی تھی اور فتوحات و غنائم یا روشن دلائل کی چمک بھی جن لوگوں نے قرآنی بارش کو اپنے اندر جذب کر لیا اُن کے دل زندہ ہو گئے، کُفر کی ظُلمتوں کا اُنہوں نے مُشاہدہ کر لیا، عذابِ الٰہی کی وعید کی گرج سے اُن کے دِل لرز گئے، فتوحات کے مَناظر یا روشن دلائل اُن کے سامنے بجلی کی طرح چمکے اور وُہ ان پر بصدق دل ایمان لائے، جس سے اُن کا نُور بصیرت اور زیادہ ہو گیا اور اُس کی رَوشنی میں راہِ ہدایت پر اُنہیں استقامت نصیب ہُوئی اور وعدۂ اَجر و ثواب کے وُہ مستحق قرار پائے۔ عباداتِ شاقہ کی تکلیفوں اور مَشقتوں کو اُنہوں نے خُوشدلی سے قبُول کیا اور راہِ حق میں پیش آنے والے مصائب و آلام

کے پہاڑوں سے وُہ ٹکرا گئے اور کامیابی کے ساتھ ان مراحل سے گزر کر اَبدی فوز و فلاح کی منزل کو اُنہوں نے پالیا لیکن منافقین کی حالت عجیب تھی، قرآنی بارش سے اُنہوں نے کوئی فائدہ نہ اُٹھایا، اُن کے دل ویسے ہی مُردہ رہے، اپنے کفر و نفاق کی مہیب تاریکیوں میں وُہ گم ہو گئے، عباداتِ شاقّہ کی تکلیفیں برداشت نہ کر سکے، اللہ کی راہ میں جہاد اور دین کی خاطر جان و مال کی قربانیاں اُن کے لئے مصائب و آلام کے پہاڑ تھے، جن سے خوف زدہ ہو کر وہ سہم گئے۔ کفر و نفاق پر عذاب کی وعیدیں اور اسلام کی صداقت پر چمکتی ہوئی دلیلیں اُن کے لئے بے سُود رہیں بلکہ اُنہیں قرآن سُننا بھی گوارا نہ ہُوا۔ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے تو موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیتے کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن سُننے سے ان کا کُفر کافور ہو جائے جسے وہ موت سمجھتے تھے۔

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ
اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ
قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ
وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ ع

قریب ہے کہ بجلی ان کی نگاہیں اُچک لے جب بھی ان کے لئے چمکی اس میں چلنے لگے اور جب ان پر تاریکی چھا گئی تو ٹھہر گئے ۲۴ اور اگر اللہ چاہتا تو اُن کی شنوائی اور بینائی کو سلب کر لیتا ۲۵ بیشک اللہ جو چاہے کر سکتا ہے ۲۶

۲۴ قرآنی برق قریب تھی کہ اُن کی ظاہری آنکھوں کو بھی اسی طرح اندھا کر دے

جس طرح اُن کے دل کی آنکھیں اندھی تھیں یعنی بجلی کی چمک اُن کی بصارت کو زائل کر دے۔ یہاں بجلی کے چمکنے سے فتوحات و اموال غنیمت کا حصول مُراد ہے۔ یعنی جہاد میں جب مسلمانوں کو فتح ہوتی ہے اور غنیمت کا مال ملتا ہے تو منافقین لالچ میں ایک دو قدم چلتے ہیں اور بظاہر اسلام کا دم بھرتے ہیں لیکن اگر کسی جنگ میں اُنہیں موت کے سوا مالِ غنیمت کی کوئی اُمید نہ ہو تو اپنے کفر و نفاق کے مؤقف پر ٹھہر جاتے ہیں۔ جیسا کہ رئیس المنافقین نے غزوۂ اُحد کے موقع پر اپنے ناپاک طرزِ عمل سے اسی بد باطنی کا مظاہرہ کیا کہ اپنی قوم کے منافق ساتھیوں کی پوری جماعت کو لیکر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور مجاہدینِ اسلام سے الگ ہو گیا اور موت کے ڈر سے راہِ فرار اختیار کی جس پر اسی غزوہ اُحد کے شہید اوّل حضرت جابر کے والد ماجد حضرت عبداللہ بن عمرو بن حرام نے ان منافقین کو اُن کی اس حرکت پر سخت ملامت کرتے ہوئے واپس آنے کے لئے پکارا، مگر موت کا ڈر اُن پر اس قدر غالب تھا کہ وہ واپس نہ آئے جس پر حضرت عبداللہ نے فرمایا، اے اللہ کے دشمنو! اللہ تمہیں دُور ہی رکھے، دفع ہو جاؤ، اللہ اور اس کے رسُول کو تمہاری کوئی حاجت نہیں[1]۔

۲۵ منافقین کی وہ قوت سامعہ اور باصرہ جو کُفر و نفاق کی آفت سے ایسی ماؤف ہو چکی ہے کہ حق سُننے اور حق دیکھنے کی صلاحیت اس میں باقی نہیں رہی، اگر اللہ چاہتا تو قرآنی وعید کی گرج اور اُس کے روشن دلائل کی چمک سے اُسے زائل کر دیتا اور اس کی بجائے اُنہیں صحیح قوتِ سامعہ اور باصرہ عطا فرما دیتا۔ یا بقولِ بعض اُن کے ظاہری کانوں اور آنکھوں کو بھی اسی طرح لے جاتا جیسا کہ اُن کے باطنی کانوں اور آنکھوں کو لے گیا[2]۔

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد نفاقِ عملی کا حکم تو لگایا جا سکتا ہے لیکن انقطاعِ وحیِ نبوت کے سبب نفاقِ اعتقادی کا قطعی حکم لگانا ممکن نہیں رہا۔ مدعیانِ اسلام فِرَقِ باطلہ میں سے جنہوں نے اپنے عقائدِ کُفریہ کا اظہار کر دیا وُہ کافر ہی ہوں گے۔

بے شک اللہ تعالیٰ ہر شئی پر قادر ہے۔ کوئی شئی اُس کی قُدرت سے باہر نہیں۔ وُہ ایسا قادرِ مطلق ہے کہ جس معدومِ ممکن کو چاہے موجُود کر دے اور جس موجُودِ حادث کو چاہے معدوم فرما دے۔ اپنے سب بندوں کو اُسی نے پیدا کیا اور اُن کے سب اعمال کا خالق بھی وہی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (الصّٰفّٰت، آیت ۹۶) یعنی (اے اللہ کے بندو!) اللہ نے تُم سب کو پیدا کیا اور جو کُچھ تم (اچھے یا بُرے) عمل کرتے ہو (سب کو اُسی نے پیدا فرمایا) بُری چیز کا پیدا کرنا بُرا نہیں بلکہ بُرائی کرنا اور اُس سے مُتّصِف ہونا بُرا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سب بندے اُسی کے مقدور ہیں اور اُن کی ہر نیکی اور بدی کو بھی اُس کی قُدرت شامل ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وُہ بُرے کام کر سکتا ہے۔ اور ظُلم و کذب وغیرہ عیوب و نقائص سے مُتّصِف ہو سکتا ہے۔ کیُونکہ کمالِ قدرت کے باوجُود مُنزّہیت و قدوسیت کے ساتھ بھی وہ مُتّصِف ہے۔ اگر کہا جائے کہ اِتّصاف بالکذب یا کسی نقص و عَیب سے مُتّصِف ہونا قُدرتِ الٰہیہ میں شامل نہ ہو تو یہ عجز ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ عجز سے پاک ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عجز نہیں۔ عجز کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کا اللہ تعالیٰ کے اِرادے، اُس کی مشیت و قُدرت کے ساتھ متعلق ہونا ممکن ہو۔ اُسے اللہ تعالیٰ کی قُدرت شامل نہ ہو۔ کسی عیب یا نقص سے مُتّصِف ہونا ایسی چیز ہی نہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارادے، اُس کی مشیت و قُدرت سے متعلق ہو سکے، لہٰذا اُس کا تحتِ قدرت نہ ہونا ہرگز عجز نہیں بلکہ اُس کی شانِ مُنزّہیت اور قدوسیت کا مقتضیٰ ہے۔ یہاں لفظ شئے مصدر بمعنیٰ اسم مفعُول ہے۔ شئی اور مشیت ارادے کو کہتے ہیں، لہٰذا اس آیت میں لفظ "شئی" کے معنیٰ ہیں اللہ تعالیٰ کی ارادہ فرمائی ہُوئی چیز۔ اللہ تعالیٰ اُسی چیز کا اِرادہ فرماتا ہے جو ارادۂ الٰہیہ سے مُتعلق ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو جو چیز ارادہ و مشیّت الٰہی سے متعلق ہونے کی صلاحیت نہ رکھے وُہ قُدرتِ الٰہیہ سے بھی متعلق ہونے کے قابل نہیں۔ دیکھئے، شریک باری تعالیٰ کا وجُود بالاتفاق تحتِ قُدرت نہیں کیُونکہ اس میں مشیّت و قُدرتِ الٰہیہ سے مُتعلق ہونے کی صلاحیت نہیں

لیکن اس کے تحتِ قدرت نہ ہونے سے عجز باری تعالیٰ لازم نہیں آتا اور نہ قدرتِ باری میں کوئی نقص پیدا ہوتا ہے، بلکہ یہ نقص شریکِ باری کی طرف راجع ہے کہ وہ اس قابل ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت و قدرت اس سے متعلق ہو سکے۔

ہم کتاب و سنت کے دلائلِ قطعیہ کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت پر ایمان رکھتے ہوئے اس کی ستوحیت و قدوسیت پر بھی ایمان رکھتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر ہم مومن نہیں ہو سکتے۔ قاضی بیضاوی نے فرمایا لفظ "قدیر" قدرت سے مشتق ہے، اس کا استعمال مبالغہ کے معنیٰ میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر اللہ کے لئے اس کا استعمال بہت ہی کم ہوا ہے۔ قدرت کے معنیٰ ہیں "اَلتَّمَكُّنُ مِنْ اِيْجَادِ الشَّيْءِ"۔ "کسی شئی کے ایجاد پر قابو اور قوت رکھنا"۔ بندے کی قدرت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کسی فعل کی قوت رکھتا ہو۔ قادر اور قدیر کے لئے ضروری نہیں کہ وہ جو کام کر سکتا ہو اسے ضرور کرے۔ بلکہ اس کا کرنا نہ کرنا اس کے ارادے پر موقوف ہے چاہے کرے چاہے نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا نہ کرنا مشیت کے علاوہ حکمت سے بھی متعلق ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ قدیر ہی نہیں بلکہ حکیم بھی ہے لہٰذا اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ
وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾
الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ
بِنَآءً ۖ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ
مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ

اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ ﴿۲۱﴾ جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا تو پانی سے کچھ پھل کئے تمہارے کھانے کے لئے تو اللہ کے لئے شریک نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم جانتے ہو۔ ﴿۲۲﴾

﴿۲۱﴾ "یا" حرفِ ندا، ندائے قریب و بعید دونوں میں مستعمل ہے لیکن اس کی اصل وضع ندا للبعید کے لئے ہے۔ امام نسفی نے فرمایا: وَيَا حَرْفٌ وُضِعَ لِنِدَاءِ الْبَعِيْدِ اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز دور نہیں پھر یہاں منادی قریب کے لئے ندا۔ للبعید کا حرف اختیار فرما کر اس کی اصل وضع سے عدول فرمانے کی کیا حکمت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہاں اصل وضع سے عدول نہیں۔ کیونکہ قرب و بعد امور اعتباریہ سے ہیں بعض اوقات کوئی شئی قریب ہونے کے باوجود کسی دوسرے اعتبار سے بعید ہوتی ہے۔ کتاب اللہ قریب ہے لیکن بلندی رتبہ کے اعتبار سے وہ یقیناً بعید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بُعدِ مرتبی کے اعتبار سے هٰذَا الْكِتٰبُ کی بجائے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ فرمایا۔ ذٰلِكَ اسم اشارہ بعید کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اسے اختیار فرمانے کی حکمت بھی یہی ہے کہ قرآن مجید کی عظمتِ شان اور اس کے بُعدِ مرتبی کا اظہار ہو جائے۔ علیٰ ہذا القیاس مقربین کرام حضرات انبیاء سابقین اور ہمارے نبی کریم علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو حرف "یا" کے ساتھ خطاب فرمانے کی حکمت بھی یہی ہے کہ بندوں پر اس حقیقت کا اظہار ہو جائے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے بلند مراتب پر فائز ہیں کہ ان کا کوئی امتی ان کے مرتبے کو نہیں

پاسکتا۔ رہا یہ اَمر کہ قرآن مجید میں "یَاأَرْضُ"، "یَا سَمَآءُ"، "یَاجِبَالُ"، "یَانَارُ" بھی وارد ہے، یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ سے قریب ہیں اور یہاں بُعدِ مرتبی کا اعتبار بھی نہیں ہو سکتا۔ اِس کے باوجود ان کو حرف "یَا" سے نِدا فرمائی گئی۔ تو مَیں عرض کروں گا کہ بے شک یہ سب اشیاء اللہ تعالیٰ سے قریب ہیں اور اس قسم کی چیزوں میں بُعدِ مرتبی کے اِعتبار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن ایک اور اعتبار سے یہاں بھی بُعد کا مفہوم پایا جاتا ہے وُہ یہ کہ ذاتِ واجب کی بہ نسبت ممکنات پستی میں ہیں، یہی پستی وُہ بُعد ہے جس کے اعتبار سے بے جان اور بے عقل اشیاء کو حرفِ "یَا" سے نِدا فرمائی گئی۔ اور تمام ممکنات پر عُلُوِّ ذاتِ واجب تعالیٰ کے اظہار کی حکمت پُوری ہو گئی اور ساتھ ہی مظاہرِ کائنات کا لائقِ عبادت نہ ہونا اور صرف اللہ تعالیٰ کا معبودِ برحق ہونا بھی واضح ہو گیا۔ اِس آیت کریمہ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ میں "یَا" حرف نِدا للبعید لانے کی ایک خاص حکمت یہ ہے کہ اَلنَّاس میں وُہ لوگ بھی شامل ہیں جو خطاب الٰہی کو سمجھنے سے قصداً دُور رہتے ہیں اور ایسے لوگ بھی جو غفلت کے باعث اِس خطاب سے بعید ہیں۔ اُن کے اِس بُعد کے باعث "یَا" حرف نِدا للبعید سے خطاب فرمایا گیا۔ گویا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے فرما رہا ہے کہ اپنی غفلت کو دُور کرو اور میری طرف مُتوجّہ ہو کر میرا خطاب سُنو۔

اَلنَّاس: حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت علقمہ، حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے منقول ہے کہ یٰٓاَیُّھَا النَّاس سے اہلِ مکہ کو اور یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے اہلِ مدینہ کو خطاب ہے۔ بر تقدیرِ صحت نقل یہ تخصیص بہ اعتبارِ شانِ نزول کے ہے مقتضائے خطاب تمام مَوجُودین اور قیامت تک پیدا ہونے والے بنی نوعِ اِنسان مکلفین کو شامل ہے اس لئے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت قیامت تک کے لئے سب کو عام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا: آیت ۲۸) "اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر (قیامت تک پیدا ہونے والے) تمام لوگوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر"۔ نیز فرمایا: تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ

لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (فرقان، آیت: ۱) "بڑی برکت والی ہے وُہ ذات جس نے اپنے عبدِ مقدّس پر قُرآن نازل فرمایا تاکہ وُہ سارے جہانوں کے لئے نذیر ہو۔" اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا: اُرْسِلْتُ اِلَی الْخَلْقِ کَآفَّةً (مُسلم: ص ۱۹۹، ج ۱) "میں ساری مخلُوق کی طرف رسُول بنا کر بھیجا گیا۔" عمومِ رسالت مقتضائے خطاب کے عموم کی دلیل ہے۔

اُعْبُدُوْا: عبادت کا حُکم مؤمن و کافر سب کے لئے ہے لیکن کُفّار عبادتِ عملیہ سے پہلے مامُور بالایمان ہیں، اِس لئے کہ صحتِ عبادت کے لئے ایمان شرط ہے ایک قول یہ ہے کہ وُہ عبادتِ عملیہ کے بھی مُکلّف ہیں۔ اگر وُہ ایمان لاکر مُسلمان ہو جائیں تو حالتِ کفر میں ترکِ عبادات کا مواخذہ اُن سے ساقط ہو جائے گا، اِس لئے کہ اِنَّ الْاِسْلَامَ یَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهٗ۔ اسلام لانے سے پہلے جو گُناہ سرزد ہو جائیں اسلام اُنہیں منہدم کر دیتا ہے (مُسلم: ص ۷۶، ج ۱) مُفسّرین نے متعدد عبارات میں عبادت کے معنیٰ بیان کئے ہیں مثلاً "اعلیٰ مراتب الخضوع"، "اقصیٰ غایۃ التذلل"، "غایۃ التعظیم"، "الدعاء"، "الطاعت"، اردو فارسی میں عبادت کے معنیٰ "پرستش"، "بندگی"، "پُوجا" کئے گئے ہیں مفسّرین و مترجمین کے یہ سب الفاظ آپس میں قریب المعنیٰ ہیں۔ عبادت کے مُعنیٰ "توحید" بھی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ قُرآن مجید میں جہاں لفظ "عبادت" ہے اُس کے مَعنیٰ "توحید" ہیں۔ اِسی لئے علماء نے فرمایا کہ "عبادت" کا لفظ صِرف اللہ تعالیٰ کی "بندگی" کیلئے اِستعمال ہوتا ہے اور اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ جیسی آیات میں لفظ "عبادت" مُشرکین کے زعم پر بطور تعریض وارد ہُوا ہے۔" اور اُن کی "عبادت" پر اُنہیں تنبیہ کے لئے تُم نے اِلٰہ حق کو چھوڑ کر اللہ کی مخلُوق اور اپنے ہاتھ سے گھڑے ہُوئے بُتوں کو عبادت کا مستحق قرار دے دیا۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تفسیر کبیر میں فرمایا: فَاِنَّ اَصْلَ الْعِبَادَةِ وَ اَسَاسَهَا التَّوْحِیْدُ یعنی "عبادت کی اصل اور اُس کی بُنیاد توحید ہے" توحید کا خُلاصہ ہے، اَللّٰهُ اَحَد (اللہ یکتا ہے) اور اِلٰهُکُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (تمہارا اِلٰہ

ایک اِلٰہ ہے)۔ یعنی الٰہِ حق کا وجُود حق ہے وہ واحد و یکتا ہے اور شرکت سے پاک ہے۔ اِلٰہ وہی ہے جو اپنی ذات و صفات میں مستقل ہو، یعنی وُہ کسی کے اذن، ارادہ اور مشیت کے تحت نہ ہو۔ وُہ غالب ہو، کسی سے مغلُوب نہ ہو۔ عقل اور شرح کے نزدیک وہ ایک اور یکتا ہے اور وہ اللہ ہے

مُشرکین اللہ کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے مگر اُس کی وحدت اور یکتائی کے قائل نہ تھے، اِسی وجہ سے وُہ کواکب، جن و ملائکہ کرام، حضرت مریم، حضرت مسیح علیہما السلام اور اُن کے علاوہ اَصنام وغیرہ مخلُوق کو اِلٰہہٗ مانتے تھے اور اُنہیں مستحق عبادت سمجھ کر ان کی پرستش کرتے تھے، یہ پرستش شرکِ محض ہے۔ شرک توحید کی نقیض ہے اور توحید باری تعالیٰ واجبِ عقلی ہے اور واجبِ عقلی کی نقیض ممتنع عقلی ہوتی ہے۔ لہٰذا اِلٰہِ حق یعنی اللہ تعالیٰ کا نہ ہونا بھی عقلاً ممتنع ہے اور اسی طرح اُس کے شریک کا ہونا بھی ممتنع عقلی ہے۔ اِس مقام پر بطور کُلیہ یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ کسی عقیدے کا شرک ہونا اِس بات پر مَوقُوف ہے کہ وُہ عقیدۂ شرکیہ کسی امر ممتنع عقلی کے جواز کا اعتقاد ہو۔ اِس کے بغیر شرک متصور نہ ہوگا۔

مسئلۂ توحید میں جب الٰہِ حق کے استقلال اور استحقاقِ ذاتی کا اِعتقاد اساس قرار پایا تو یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ مخلُوق کے حق میں کسی اعتقاد یا عمل کو مطلقاً شرک قرار دینا قطعاً باطل ہے خواہ وُہ کسی کے لیے علم و قُدرت اور اختیار و تصرف کا اعتقاد ہو یا کسی کی تعظیم و محبت اور اطاعت و استعانت کا عمل، استقلال ذاتی کے اِعتقاد کے بغیر کوئی اِعتقاد یا عمل شرک قرار نہ پائے گا۔ کسی کے حق میں علم و قُدرت، سمع و بصر، اختیار و تصرُّف کا عقیدہ یا کسی کے لیے اطاعت یا غایتِ تعظیم کو اُسی وقت شرک کہا جائے گا جب اِن اُمور میں استقلال ذاتی کا عقیدہ پایا جائے۔ اللہ کے سوا کسی کو مطلقاً پکارنا شرک نہیں، معبُود سمجھ کر پکارنا شرک ہے۔ کسی مخلُوق کی اطاعت کو مطلقاً عبادت نہیں کہہ سکتے تاوقتیکہ وہ استقلالِ ذاتی کے اِعتقاد سے نہ ہو، ورنہ اطاعتِ رسول، اطاعتِ والدین بھی شرک قرار پائے گی۔ سجدہ غایتِ تعظیم ہے، غیر اللہ کے لیے حرام ہے مگر شرک نہیں جب تک کہ مسجُود الیہ کے استحقاقِ ذاتی اور اُس کے معبُود ہونے کا اعتقاد نہ ہو۔

مُشرکین اپنے معبُودوں کے حق میں یہی اعتقاد رکھتے تھے۔ اگر اُن کا یہ اعتقاد نہ ہوتا تو آیت کریمہ "لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا" (انبیاء، آیت ۲۲) سے ان کے عقیدے کا ابطال ہرگز نہیں ہو سکتا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ آیت تعدد اٰلِھَہ کے ابطال ہی کے لئے نازل ہوئی، اِس لئے ثابت ہو گیا کہ مُشرکین اپنے بُتوں کے حق میں استقلالِ ذاتی کے معتقد تھے۔ اُن کا یہی عقیدہ شرک تھا اور اسی عقیدہ کی بنا پر اُن کا اپنے بُتوں کو پکارنا، اُن سے حاجات طلب کرنا، اُن کے لئے سجدے کرنا، اُن کی نذر و نیاز دینا شرکِ جلی قرار پایا۔ رہا یہ اَمر کہ مُشرکین بُتوں کو مخلُوق مان کر اُنہیں اللہ کا مملوک سمجھ کر اُن کے حق میں استقلال ذاتی کا اِعتقاد کِس طرح رکھ سکتے تھے۔ عقلاً ممکن ہی نہیں کہ مخلُوق و مملوک ہو کر وہ مستقل بالذات ہوں۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ ممکن ہوتا تو یہ عقیدہ شرک کیسے قرار پاتا۔ ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ کسی عقیدہ کا شرکیہ ہونا اِس بات پر مَوقُوف ہے کہ وُہ کِسی اَمر ممتنع عقلی کے جواز کا اِعتقاد ہو۔ اِس کے بغیر شرک متحقق نہیں ہو سکتا۔ مُشرکین کی جہالت یہی تھی کہ وُہ ایسے اَمر کا اِعتقاد رکھتے تھے جو عقلاً ممتنع لذاتہ ہے۔ مخفی نہ رہے کہ استقلالِ ذاتی کا اِعتقاد کئے بغیر کِسی سے حاجات طلب کرنا یا اُس کے لئے کوئی اِختیار ماننا اگرچہ شرک نہیں لیکن کِسی دلیل شرعی کے بغیر ایسا اعتقاد رکھنا شدید ترین غلطی ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ : نوافل کے ذریعے قُرب حاصل کرنے والے صالحین کے حق میں حدیثِ قُدسی وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اپنے اس بندہ کو اپنا محبُوب بنا لیتا ہُوں، پھر میرے محبُوب بنا لینے کے بعد مَیں اُس کی سمع ہو جاتا ہُوں جِس سے وُہ سُنتا ہے۔ مَیں اُس کی بصر ہو جاتا ہُوں جِس سے وُہ دیکھتا ہے اور مَیں اُس کا ہاتھ ہو جاتا ہُوں جِس سے وُہ پکڑتا ہے اور مَیں اُس کا پاؤں ہو جاتا ہُوں جِس سے وُہ چلتا ہے۔ الخ (بُخاری، ج ۲، ص ۹۶۳) امام رازی نے اِس پر کلام کرتے ہُوئے فرمایا، بندہ جب طاعت پر ہمیشگی اِختیار کرتا ہے تو اُس مقام پر پہنچ جاتا ہے جِس کے بارے میں

اللہ تعالیٰ کا اِرشاد ہے: "کُنْتُ لَهٗ سَمْعًا وَ بَصَرًا" یعنی "میں اُسکی سمع اور بصر ہو جاتا ہوں"۔ اللہ کے جلال کا نُور جب اُس کی سمع ہو جائے تو وہ نزدیک اور دُور کو سُن لیتا ہے اور یہی نُور جب اُس کی بصر ہو جائے تو وُہ نزدیک اور دُور کو دیکھ لیتا ہے اور یہ نُور جب اُس کا ہاتھ ہو جائے تو وُہ مُشکل اور آسان، نزدیک اور دُور میں تصرّف کرنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ اِس حدیث سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ معاذ اللہ بندہ اللہ ہو جاتا ہے یا اللہ بندے میں سما جاتا ہے۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔ اللہ تعالیٰ اتحاد اور حلول سے پاک ہے۔ بلکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا مُقرّب بندہ مظہرِ نُورِ جلالِ الٰہی بن جاتا ہے، یہ الوہیت نہیں بلکہ کمالِ عبدیت ہے جسے حاصل کرنے کی رغبت دلانے کے لئے یہ حدیثِ قُدسی وارد ہُوئی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ قُربِ الٰہی کے لئے کسی کو وسیلہ سمجھنا بھی شرک ہے۔ مُشرکین بھی اپنے بُتوں کو وسیلہ سمجھتے تھے۔ قرآن مجید میں اُن کا مقولہ مذکور ہے: وَمَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزُّمر، آیت ۳) یعنی "ہم بُتوں کی عبادت صِرف اِس لئے کرتے ہیں کہ وُہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں"۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ مُشرکین اپنے بُتوں کو محض وسیلہ بنانے کی وجہ سے مُشرک نہیں ہُوئے بلکہ اُن کی عبادت کرنے کی وجہ سے مُشرک قرار پائے، جیسا کہ اُن کے اِسی مقولہ میں "وَمَا نَعْبُدُهُمْ" کے الفاظ موجود ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ وُہ خود اپنے بُتوں کی "عبادت" کا اِقرار کرتے تھے۔

رَبَّكُمْ: یہاں "رَبُّکُمْ" فرمانے میں یہ نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا لحاظ امرِ آخر بمقتضائے ذات ہی عبادت کا مستحق ہے لیکن اُس کی شانِ ربُوبیت بھی اُس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ بندہ اُس کی عبادت کرے اور اُس کی نعمتوں کا شکر بجا لائے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَكُمْ: "خلق" کے معنیٰ پیدا کرنا اور عدم سے وجُود میں لانا ہیں۔ امام راغب اصفہانی اور دیگر علمائے فرمایا: خلق کے اصل معنیٰ ہیں "صحیح مستقیم اندازہ" اور اُس کا استعمال حسب ذیل معانی میں بھی ہوتا ہے: ○ کسی ایسی چیز کی ایجاد، جس کا کوئی

نمونہ اور مثال پہلے موجود نہ ہو۔ ○ ایک شئی سے دوسری شئی کو وجود میں لانا۔ مخفی نہ رہے کہ کسی شئی کو مطلقاً عدم سے وجود میں لانا اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ ○ شکل وصورت بنانا۔ ○ لفظ "خلق" کا استعمال کلام کے لئے ہو تو وہ جھوٹ اور بہتان کے معنیٰ میں ہوتا ہے، اِلّا قلیلاً۔ ○ لفظ "خلق" مخلوق کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ○ "خلق" اگر کپڑے کی صفت ہو تو اُس کے معنیٰ پُرانا ہونے کے ہوتے ہیں۔ اِس آیت کریمہ میں "خلق" بمعنیٰ "ایجاد" ہے یعنی تمہیں عدم سے وجود میں لانے والا اللہ ہی ہے۔ اگر یہاں یہ سوال پیدا کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے "اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ" کے ساتھ "وَالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِکُمْ" نہیں فرمایا، جب کہ لوگوں کی پیدائش کا سلسلہ قیامت تک جاری ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ "اَلنَّاس" کے عموم اور دونوں جگہ "کُمْ" ضمیر مخاطبین کے مفہوم میں شامل ہو کر قیامت تک پیدا ہونے والے سب لوگوں کا ذکر آگیا، اور ظاہر ہے کہ قیامت کے بعد انسانی پیدائش کا یہ سلسلہ منقطع ہے۔ ایسی صورت میں یہاں "وَالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِکُمْ" فرمانا قطعاً خلافِ واقع ہوتا، جس کا تصور بھی کلامِ الٰہی میں نہیں ہو سکتا۔

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ : قطرب کا قول ہے کہ یہاں "لَعَلَّ" بمعنیٰ "کَیْ" استعمال ہوا ہے۔ یعنی "اے لوگو، اپنے رب کی عبادت کرو تاکہ تم متقی ہو جاؤ"۔ "لَعَلَّ اور عَسٰی دونوں حرفِ ترجی ہیں۔ اُمید کے معنی میں مستعمل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُمید سے پاک ہے۔ سیبویہ نے کہا کہ یہ دونوں لفظ جب اللہ کے کلام میں مستعمل ہوں تو یقین کا فائدہ دیتے ہیں۔ اس لئے کہ جب کریم کسی کو اُمید دلائے تو وہ اُسے اپنے وعدہ کی طرح پُورا فرماتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اگر بندہ صحیح معنیٰ میں اخلاص کے ساتھ تادمِ آخر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا رہے تو یقیناً اُس کا شمار متقین میں ہوگا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہاں "لَعَلَّ" بمعنیٰ ترجی ہی مستعمل ہے لیکن یہ "رجاء" یعنی اُمید اللہ کی طرف نہیں بلکہ بندہ کی طرف راجع ہے اور

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "اے لوگو، تقویٰ کے امیدوار ہو کر تم اپنے رب کی عبادت کرو"۔ گناہوں سے بچنے کا نام "تقویٰ" ہے، جس کے کئی مراتب ہیں۔ اس کا انجام دوزخ کی آگ سے بچنا اور آخری کامیابی حاصل کرنا ہے نفس امارہ کی وجہ سے آدمی کے لئے گناہ سے بچنا نیکی کرنے سے زیادہ مشکل ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ"۔ فرما کر تقویٰ کو انسانی عظمت و بزرگی کا معیار قرار دیا۔

۲۸ اِس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دلائلِ قدرت کو بیان فرمایا تاکہ اُن کی روشنی میں بندوں کو اللہ کی معرفت حاصل ہو۔ یہ دلائلِ قدرت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بیان پر بھی مشتمل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عطا فرمائیں، جن کا مقتضیٰ یہ ہے کہ بندے نعمتوں پر اپنے رب کا شکر ادا کریں اور اُس کی عبادت میں کوتاہی سے کام نہ لیں۔ یہ سب نعمتیں اللہ تعالیٰ کے استحقاقِ عبادت پر بھی روشن دلیلیں ہیں جنہیں سمجھنے کے بعد اِنسان کے دل میں نورِ معرفت کے ساتھ اس بات کا یقینِ محکم پیدا ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہیں

اَنْدَادًا: "اَنداد" "نِد" کی جمع ہے، جس کے معنیٰ ہیں "مثل" مگر اس کا اِستعمال مثلِ مخالف ہی کے معنیٰ میں ہوتا ہے۔ اِسی لئے "نِد" کا ترجمہ "ضد" بھی کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مُطلقاً مثل اور شریک سے پاک ہے۔ اِس لئے ارشاد فرمایا: "لوگو! تُم اللہ کے لئے شریک ٹھہراؤ"۔ اِس آیت سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ مشرکین اپنے باطل معبُودوں کو اللہ کی مثل، اُس کے مساوی اور برابر مانتے تھے، جیسا کہ بعض دیگر آیات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: ثُمَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّہِمْ یَعْدِلُوْنَ (انعام: آیت۱)۔ یعنی "کافر بُتوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر کرتے ہیں"۔ نیز فرمایا: وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ وَھُمْ بِرَبِّہِمْ یَعْدِلُوْنَ (انعام: آیت ۱۵۰)۔ یعنی "جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ باطل معبُودوں کو اپنے رب کے برابر کرتے ہیں"۔ حالانکہ مشرکین اللہ کو خالق اور اپنے بُتوں کو مخلُوق مانتے تھے۔ بُتوں کی عبادت اِس لئے کرتے تھے کہ وہ اللہ کے مُقرب ہو جائیں۔ اللہ کے شریک کو اُس کا مملُوک اور اللہ

کو اُس کا مالک کہتے تھے۔ ایسی صُورت میں برابری اور مساوات کہاں رہی؟۔ امام رازی اور دیگر علمائے فرمایا کہ آج تک ایسا کوئی مُشرک نہیں پایا گیا جو اللہ کی ذات وصفات میں کسی کو اُس کے برابر مانتا ہو، پھر ان آیات کے کیا معنیٰ ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی ایک صِفت میں غیر اللہ کو اُس کے برابر مان لینا گویا اُس کی ذات اور تمام صفات میں برابر ماننا ہے۔

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: یعنی جو دلیلیں اور نعمتیں تمہارے سامنے بیان کی گئی ہیں تم اُن سے بے خبر نہیں، تم خُوب جانتے ہو کہ زمین و آسمان اور مذکورہ نعمتوں کا خالق وہی ہے، جیسا کہ سورۂ لُقمان میں فرمایا: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (لقمٰن: آیت ۲۵)۔" اور سورۂ عنکبوت کی ایک آیت میں" مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" کے ساتھ" وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ" بھی وارد ہے اور اس کے بعد ایک دُوسری آیت میں" وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ" (عنکبوت: آیت ۶۳) بھی موجُود ہے۔ ان تینوں آیتوں کا خُلاصہ یہ ہے کہ اگر آپ مشرکین سے پُوچھیں کہ زمین اور آسمان کو کس نے پیدا کیا اور چاند سُورج کا مُسخّر کرنے والا کون ہے اور آسمان سے پانی برسا کر مُردہ زمینوں کو کس نے زندہ کیا تو وہ یہی کہیں گے یہ (سب کچھ) اللہ ہی نے کیا۔ عجب وُہ ان حقیقتوں کو جانتے ہیں تو پھر اللہ کے ساتھ دُوسروں کو شریک بنانا اور غیروں کی عبادت کرنا کیوں کر دُرست ہو سکتا ہے۔ عقلِ سلیم کا تقاضا یہی ہے کہ ہر چیز کے خالق اور ہر نعمت کے دینے والے ہی کی عبادت کی جائے اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ

وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ
تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا
النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ
لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

اور اگر تم شک میں ہو اس سے جو (کلام) ہم نے اپنے (مقدس) بندے پر اُتارا تو لے آؤ اس جیسی کوئی سُورت اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بلاؤ اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر تم نہ کر سکے اور ہرگز نہ کر سکو گے تو بچو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے۔ ۲۹

۲۹ "اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ" زجر و توبیخ کے طور پر فرمایا گیا کہ اگرچہ قرآنی دلائلِ سلطعہ اور براہین قاطعہ نے قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے میں تمام شکوک و شبہات کی بنیادوں کو قطع کر دیا ہے اس کے باوجود بھی اے منکرو، اگر تم کسی شک میں مبتلا ہو اور اپنے دل میں قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے میں کچھ تردد رکھتے ہو تو سب جن و انس کو جمع کر لو، وہ تمام ایک دوسرے کی مدد کریں، اپنے معبودوں کو بھی بلا لو اور تم سب مل کر قرآن کی مثل ایک چھوٹی سی سورت بنا لاؤ۔ لیکن یاد رکھو قیامت تک تم ایسا نہ کر سکو گے۔ قرآن کی اس تحدی اور عظیم چیلنج نے دنیائے کفر میں تہلکہ مچا دیا۔ جس کے سامنے قرآن کے منکرین اہلِ لسان فصحاء اور بلغاء سرنگوں

ہو کر رہ گئے۔ چودہ سو سال میں آج تک کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ قرآن کی مثل کوئی سورت بنا لاتا۔ اب تک سب منکرین عاجز ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ وہ آئندہ کسی وقت بھی قرآن کے اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کی جرأت کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے پیشین گوئی فرمادی: "وَلَنْ تَفْعَلُوْا" (اے منکرو) تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے۔"

ہر شخص اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ کسی انسان کے کارنامے کے مقابلے میں تمام بنی نوع انسان کا ہمیشہ کے لئے عاجز ہو جانا ممکن نہیں، ترقی کے اس دور میں یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے لیکن خالق کا مقابلہ مخلوق کے لئے کسی طرح ممکن نہیں، اس کا کلام تو بڑی چیز ہے، خالق کے بنائے ہوئے گھاس کے ایک تنکے یا درخت کے ایک پتے کی مثل بھی ساری مخلوق مل کر بنانا چاہے تو بعینہٖ اس جیسا ایک پتا یا تنکا کوئی نہیں بنا سکتا۔ جسے وہ اللہ کی پیدا کردہ اشیاء سے بے نیاز ہو کر بنائے اور اس تنکے اور پتے کی ماہیت اور اجزاء کی حقیقت، اس کے اثرات و خواص بعینہٖ وہی ہوں جو خالقِ کائنات کے پیدا کئے ہوئے گھاس کے تنکے یا درخت کے پتے میں موجود ہیں۔ دنیا کا کوئی عقلمند تصور بھی نہیں کر سکتا کہ مخلوق کا کوئی فرد خالق کی پیدا کی ہوئی کسی چیز کی مثل نوعیتِ مذکورہ کے مطابق بنا سکے۔ ایسی صورت میں قرآن مجید کی ایک چھوٹی سی سورت کی مثل بنانے سے آج تک ہر ایک کا عاجز ہونا قرآنِ مجید کے منزل من اللہ ہونے کی روشن دلیل ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسی دلیل سے صاحبِ قرآن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت و رسالت کی صداقت بھی روزِ روشن کی طرح ثابت اور واضح ہے۔ اے کاش! منکرینِ قرآن اور مخالفینِ اسلام بھی آنکھیں کھول کر اس آفتابِ حقیقت کا مشاہدہ کرتے۔

قرآن کریم کے معارضہ سے منکرینِ قرآن کے عاجز ہونے کا درجہ بدرجہ اظہار نہایت حکیمانہ انداز ہے۔ سب سے پہلے سورۂ اسراء (آیت ۸۸) میں ارشاد ہوا کہ اگر تمام انس و جن مل کر قرآن کی مثل لانا چاہیں تو نہ لا سکیں گے۔ اس کے بعد سورۂ ہود (آیت ۱۳) میں فرمایا کہ اگر تم قرآن

کو کلامِ الٰہی نہیں مانتے تو تم سب مِل کر ایسی "دس سُورتیں" بنالاؤ۔ پھر سورۂ یُونس (آیت ۳۸) اور سورۂ بقرہ (آیت ۲۳) میں ارشاد فرمایا کہ اگر تُم قرآن کو مَن گھڑت کلام کہتے ہو اور اس کے کلامِ الٰہی ہونے کے بارے میں شک میں پڑے ہُوئے ہو تو اس کی مثل ایک (ہی) سُورۃ بنالاؤ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ لوگ قدرتی درخت کو دیکھ کر کہنے لگیں کہ یہ اصلی نہیں کسی نے بنا کر مصنوعی درخت لگا دیا ہے۔ اُن سے کہا جائے کہ اگر یہ مصنوعی ہے تو تم بھی اپنے ہمخیالوں کو جمع کر کے اس جیسا درخت بنالاؤ۔ اگر پُورا درخت نہ بنا سکو تو "دس ٹہنیاں" ہی بنالاؤ۔ اگر تم سے یہ بھی نہ ہو سکے تو اس جیسی ایک ہی ٹہنی بنا کر لے آؤ۔ مُنکرین کے اظہارِ عجز میں یہ تدریج دِل نشیں ہونے کے عِلاوہ نہایت لطیف انداز میں اُن کی تضحیک و تذلیل کا پہلُو بھی اپنے اندر لیئے ہُوئے ہے۔

"مِنْ مِّثْلِهٖ" میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ ضمیرِ مجرور کا مَرجع لفظ "عبد" ہو لیکن سُورۂ اسرٰی اور سُورۂ ہُود اور سُورۂ یُونس کی ہر سہ آیاتِ منقولہ بالا اِس احتمال کے منافی ہیں۔ دُوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا مَرجع کلامِ مُنزّل ہو، یہی صواب ہے اور آیاتِ مذکورہ بالا اس کی مؤید ہیں۔ اس تقدیر پر حرفِ "مِن" تبعیض کے لیئے ہو گا یا تبیین کے لیئے؟ اخفش کا قول ہے کہ مِنْ مِّثْلِهٖ میں "مِن" زائدہ ہے[1]۔ اِس آیتِ کریمہ سے قرآن کا معجزہ ہونا ثابت ہُوا۔ قرآن کا اعجاز فصاحت و بلاغت میں منحصر نہیں بلکہ وُہ اپنی جامعیت، علم و حکمت، عُلُومِ غیبیہ، دلائلِ قطعیہ و حُجّۂ محاسن میں اعجازی شان رکھتا ہے۔ وُہ ایسا معجزہ ہے جو قیامت تک باقی رہے گا۔ اور اس کے ضمن میں قرآن میں ذکر کیئے ہُوئے انبیائے سابقین علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معجزات بھی گویا تا قیامت زندہ رہیں گے۔

اَلنَّاسُ وَالْحِجَارَةُ: "اَلنَّاسُ" سے جہنمی لوگ مُراد ہیں اور "اَلْحِجَارَةُ" سے وُہ تمام بُت جو پتھر سے تراشے جاتے تھے۔ اور مُشرکین اُن کی عبادت کرتے تھے۔ جب وُہ اپنے معبُودوں کو اپنے ساتھ دوزخ میں جلتا ہُوا دیکھیں گے تو اُن کی نا اُمیدی کی

کوئی انتہا نہ رہے گی. حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ "حجارۃ" سے سیاہ گندھک کے وہ پتھر مراد ہیں جن سے دوزخ کی آگ بھڑکائی جائے گی. مردار سے زیادہ اُن کی بدبو ہو گی[1] بعض نے کہا "حجارۃ" سے عام پتھر مراد ہیں. یہ اقوال آپس میں متعارض نہیں، حق یہ ہے کہ جہنمی لوگوں کے ساتھ اصنام بھی دوزخ کا ایندھن ہیں اور گندھک کے پتھر بھی اور نار جہنم کی شدت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ان کے علاوہ عام پتھر بھی جہنم کا ایندھن ہوں۔

اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ : جنت کی طرح جہنم بھی ابدی ہے. ابدی عذاب کے اعتبار سے وہ کفار ہی کے لئے تیار کی گئی ہے. مؤمن خواہ کیسا ہی گنہگار ہو، نار جہنم میں ہمیشہ نہ رہے گا. ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے کافر ہی ہیں۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور آپ خوشخبری دیں اُنہیں جو ایمان لائے اور اُنہوں نے نیک کام کئے کہ اُن

کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ جب بھی (انہیں) دیا جائے گا اُن (باغوں) میں سے کوئی پھل کھانے کو، کہیں گے یہ وہی ہے جو ہمیں پہلے ملا تھا اور اُن کو (صورت میں) ایک جیسے پھل دیئے جائیں گے اور ان کے لئے وہاں پاک بیویاں ہوں گی اور وہ ان (باغوں) میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۳۰ے

۳۰ے وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا : قرآنِ مجید کی حقانیت پر چمکتی ہوئی دلیلوں کا انکار کرنے والے معاندین و کفار کو نارِ جہنم کی وعید سنانے کے بعد ان ایمان والوں کو جنتوں اور اُن کی ابدی نعمتوں کی خوشخبری دی جا رہی ہے جو قرآن کی حقانیت پر ایمان لائے اور نیک کام کر کے اُنہوں نے ایمان کے تقاضے کو پورا کیا۔

رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ : اہلِ جنت کا یہ کہنا کہ یہ میوے وہی ہیں جو ہمیں پہلے مل چکے ہیں، بعض صحابہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد اُن کے اعمالِ صالحہ کا اجر و ثواب ہے جس کی خبر اُنہیں دنیا میں وحیِ الٰہی کے ذریعے مل چکی تھی[1] یعنی جیسی اُن کی نیکیاں تھیں ویسی ہی اُن سے ملتی جلتی جنت کی نعمتیں اور اُس کے پھل اُنہیں دیئے جائیں گے اور اس کے یہ معنیٰ بھی ہو سکتے ہیں کہ دنیا میں ان پھلوں کے ہم رنگ و ہم شکل پھل ہمیں دیئے گئے، اِس کے علاوہ یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے جنت میں جو پھل ہمیں ملے تھے وہ ایسے ہی تھے کیونکہ جنت میں ایک مرتبہ پھل کھانے کے بعد جب بھی اُنہیں پھل ملیں گے وہ رنگ اور شکل و صورت میں پہلے پھلوں کے مشابہ ہوں گے۔ اِسی لئے وہ کہیں گے اس سے پہلے ایسے ہی پھل ہمیں دیئے گئے تھے تو اُن سے کہا جائے گا کہ یہ پھل کھاؤ، اُن کا رنگ ایک جیسا ہے مگر ذائقہ مختلف، یہ اس لئے ہو گا کہ جنتیوں کی فرحت و مسرت میں اضافہ ہو۔

وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ : اہلِ جنت کو جنت میں نہایت پاکیزہ بیویاں ملیں گی جو ہر قسم کی نجاستوں اور غلاظتوں سے پاک ہوں گی، بول و براز تو درکنار ناک کی ریزش اور

تھوک سے بھی وُہ محفُوظ ہوں گی، اُن کے اخلاق و عادات بھی نہایت پاکیزہ ہوں گے اُن کے محاسن میں بکثرت احادیث وارد ہیں۔ اگر کہا جائے کہ "وَلَهُمْ فِيهَآ اَزْوَاجٌ" میں مَرد و عورت دونوں شامل ہیں کیُونکہ ہر ایک دُوسرے کا زوج یعنی جوڑا ہے۔ جس طرح ایک مَرد کو جنّت میں بہت سی عورتیں ملیں گی اِسی طرح ایک عورت کو بھی وہاں بہت سے مَرد ملنے چاہئیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جنّت میں جسے جو کچھ ملے گا وہ اس کی خواہش کے مطابق ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ اَنْفُسُكُمْ (حٰمٓ سجدہ آیت ۳۱) یعنی "جنّت میں تمہارے لئے وُہ سب کچھ ہوگا جس کی تُم خواہش کروگے"۔ لیکن مخفی نہ رہے کہ جنّت میں کسی اہلِ جنّت کے دِل میں کوئی ایسی خواہش پیدا نہ ہوگی جو اصلِ فطرت کے خِلاف ہو۔ کیُونکہ وُہ عیب ہے، جس سے جنّتی پاک ہوں گے۔ دُنیا میں کوئی غیر فطری خواہش لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو سکتی ہے لیکن جنّت میں کسی اہلِ جنّت کے دِل میں خلافِ فطرت خواہش کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ مَرد کی اصلِ فطرت ایک سے زیادہ عورتوں کی متقاضی ہو سکتی ہے، یہ تقاضا اُس کے حق میں عیب نہیں لیکن عورت کی اصلِ فطرت بیک وقت ایک سے زیادہ مَردوں کی متقاضی نہیں ہو سکتی۔ اگر دُنیا میں کوئی عورت اِس قسم کی غیر فطری خواہش اپنے دِل میں رکھتی ہے تو وُہ یقیناً عیب ہے۔ جنّت میں اس عیب کا تصوّر کسی بھی جنّتی عورت کے حق میں نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا وہاں کوئی عورت ایک سے زائد کسی مَرد کی خواہش مند نہ ہوگی۔ ایسی صُورت میں کسی جنّتی عورت کو بہت سے مَرد ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح عورتیں مَردوں کے لئے نعمت ہیں اسی طرح مَرد بھی عورتوں کے لئے یقیناً نعمت ہیں اور زیادتیٔ نعمت کا تقاضا فِطری خواہش ہے اس لئے اگر عورتوں کے دِل میں یہ خواہش پیدا ہو تو خلافِ فطرت نہ ہوگی۔ میں عرض کروں گا کہ اگر یہی سوال کسی سلیمۃ الفطرت حیادار عفّت مآب عورت کے سامنے رکھا جائے تو وُہ شرم و حیا سے پسینہ پسینہ ہو جائے گی۔ اور اُس کی زبانِ حال جواب دے گی کہ سائل اپنے والد کو اپنے

حق میں نعمت سمجھتا ہے یا نہیں ؟ اگر نہیں سمجھتا تو ناخلف ہے اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ میرا والد میرے حق میں اللہ کی نعمت ہے تو کیا وہ اِس نعمت کی زیادتی کا طلبگار ہوگا ؟ اور اس کی فطرت ایک سے زیادہ والد کی خواہشمند ہوگی ؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو وہ سمجھ لے کہ ایک حیادار عورت ایک سے زیادہ خاوند کی خواہش مند نہیں ہو سکتی۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا
مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ
اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ
اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا
وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ
اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ
عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ
مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ
فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۸﴾

بیشک (سمجھانے کے لئے) اللہ کسی حقیر چیز کی مثال بیان فرمانے سے نہیں رُکتا، مچھر ہو یا

اس سے اُوپر پھر وُہ جو ایمان والے ہیں جانتے ہیں کہ وُہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور جنہوں نے کُفر کیا وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ایسی مثال سے کیا ارادہ کیا؟ وُہ گمراہی میں ڈال دیتا ہے اس سے بہت لوگوں کو اور ہدایت دیتا ہے اس سے بہتیروں کو اور نہیں گمراہ کرتا اس سے مگر صرف نافرمانوں کو۔ وُہ جو توڑ دیتے ہیں اللہ کے عہد کو اسے پکا کرنے کے بعد، اور کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کے ملانے کا اللہ نے حُکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں وہی نقصان اُٹھانے والے ہیں۔ ۳۱

---

۳۱ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖ، "یَسْتَحْیٖ" حیاء سے ماخوذ ہے۔ حیاء کے معنیٰ ہیں انقباضِ نفس کے باعث کسی کام کو ترک کر دینا۔ اللہ تعالیٰ انقباض سے پاک ہے اِس لئے یہاں "لَا یَسْتَحْیٖ" کے معنیٰ ہیں لَا یَتْرُکُ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو حق سمجھانے میں کسی حقیر چیز کی مثال بیان فرمانے کو ترک نہیں فرماتا۔ **شانِ نزول**: بروایت ابی صالح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے لئے آگ روشن کرنے والوں اور بارش والوں کی دو مثالیں بیان فرمائیں تو منکرین نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی شان نہیں کہ وُہ مثالیں بیان کرے۔ اِس پر یہ آیت نازل ہُوئی۔ حسن اور قتادہ سے منقول ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قُرآن مجید میں مُشرکین کے لئے بیان کرتے ہُوئے مکھی اور مکڑی کا ذکر فرمایا تو یہُودیوں نے مذاق اڑاتے ہُوئے کہا کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہو سکتا جس میں مکھی اور مچھر کا ذکر ہے۔ اِس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ حقیقتِ حال بیان کرنے اور حق کی وضاحت کے لئے اللہ تعالیٰ کسی حقیر چیز کی مثال بیان فرمانے کو ترک نہیں فرماتا، خواہ وہ مچھر ہو یا مکھی یا اس کے علاوہ کیسی ہی حقیر چیز کیوں نہ ہو، حق کی وضاحت میں اُس کی حقارت مانع نہیں ہو سکتی۔ ادنیٰ تأمل سے معلُوم ہو سکتا ہے کہ حقائقِ کائنات کا حقیر ترین ذرّہ بھی معرفتِ الٰہیہ کی روشن دلیل ہے۔ ضرب الامثال حکیمانہ طرزِ بیان ہے جس کا انکار جہالت و حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا : قرآن مجید کو کلامِ الٰہی ماننے والے اور اس کی صداقت پر ایمان رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں جن لوگوں کے لئے جس چیز کی جو مثال بیان کی گئی ہے۔ وہی ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔

وَاَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا : کفار اور معاندین جو حق قبول کرنے کی صلاحیتیں ضائع کر چکے اور ضرب الامثال کی حکمتوں کے منکر ہیں ازراہِ کفر و عناد کہتے ہیں کہ اس مثل کے بیان کرنے سے اللہ کا کیا ارادہ ہے؟ ان کے جواب میں ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس سے بہت سے لوگوں کو ہدایت فرماتا اور بہتوں کو گمراہ کرتا ہے، یعنی اُن کی گمراہی میں اُنہیں چھوڑے رکھتا ہے اور یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی طاعت سے رُوگردانی کر کے سرکشی اور بغاوت اختیار کرتے ہیں جو اللہ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں، اللہ کے کسی حکم پر وہ عمل نہیں کرتے اور فساد انگیزی پر کمربستہ رہتے ہیں۔ ہدایت کی راہیں اُن کے لئے بھی کشادہ تھیں مگر اُنہوں نے جان بُوجھ کر ضلالت کا راستہ اختیار کیا۔ سُنّتِ الٰہیہ یہی ہے کہ جس نے روشن دلیلوں کے باوجود حق سے انحراف کر کے باطل کی راہ اختیار کی، اللہ تعالیٰ اُسے اُسی راہ پر چلاتا ہے (نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (نساء: آیت ۱۱۵) "جس نے مومنین کے خلاف کوئی راہ اختیار کی، ہم اُسے اُسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرا، اور اُسے جہنم میں پہنچائیں گے جو بہت بُرا ٹھکانا ہے۔")

عَهْدَ اللّٰهِ : یہاں عہد کے بارے میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں۔ مثلاً ایک قول یہ ہے کہ یہاں عہد سے مُراد عہدِ "اَلَسْتُ" ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عالمِ ارواح میں تمام ارواحِ بنی آدم سے فرمایا "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" "کیا میں تمہارا رب نہیں"؟۔ قَالُوْا بَلٰى۔ سب نے کہا کیوں نہیں، تو ضرور ہمارا رب ہے"۔ اِس عہد کے بعد جن لوگوں نے اللہ کی ربوبیت کا انکار کیا اور اللہ کے سوا اُنہوں نے دُوسروں کو رب مانا، وہ سب اس عہد کو توڑنے والے ہیں۔ دُوسرا یہ کہ عہد سے مُراد اللہ کی اس امانت کا اُٹھانا ہے جس کے اُٹھانے سے

زمینوں، آسمانوں اور پہاڑوں نے خوف کی وجہ سے اِنکار کر دیا تھا، اِنسان نے اُسے اُٹھا لیا۔ امانتِ الٰہیہ کا اُٹھانا اُس کے حقوق کی رعایت اور اس کے تحفظ کا عہد کرنا ہے، کُفار و مُشرکین نے اِس عہد کو بھی پُورا نہ کیا۔ ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کی اُمت سے اپنی طاعت و عبادت اور اپنے احکام بجا لانے کا عہد لیا تھا۔ مگر منکرین نے اِس کی بھی خلاف ورزی کی۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے لوگوں سے عہد لیا تھا کہ وُہ حضرت مُحمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لائیں، اُن کی نصرت کریں، اُن کے دین پر قائم رہیں نیز اُن کی نعت و صفت اور اُن کے صِدقِ نبوت کی جو نشانیاں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پیش گوئیوں اور کتبِ سماویہ میں پائی جاتی ہیں، اُنہیں نہ چھپائیں۔ منکرین و معاندین اہل کتاب یہود و نصاریٰ حضُور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان نہ لائے۔ آسمانی کتابوں میں تحریف کر کے حضُور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نعت و صفت کو چھُپایا، نصرت کی بجائے حضُور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عداوت و مخالفت اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کے عہد و میثاق کو توڑا۔ اِس کے عِلاوہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں حُکم دیا تھا کہ وُہ سب نبیوں پر ایمان لائیں، صِلہ رحمی اِختیار کریں مگر معاندین اہلِ کتاب نے قطع رحمی اِختیار کی اور بعض انبیاء پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنے کے باوجُود بعض دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ اُنہوں نے کُفر کیا، اِسی طرح اللہ کی کتاب کے کِسی حصّہ کو مانا اور کِسی حصّہ کا اِنکار کر دیا۔

معاندین اہلِ کتاب ہُوں یا دیگر کُفار و مُشرکین سب نے اللہ کی زمین میں فساد پھیلانے کو اپنا شیوہ بنا لیا۔ حالانکہ اُن کی اِس نافرمانی، فسق و فجور، نقضِ عہد اور اوامرِ الٰہیہ اور احکامِ خداوندی کی توہین و تنقیص اور فتنہ و فساد کے خلاف روشن دلیلیں اُن کے سامنے موجُود تھیں مگر اِس کے باوجُود اُنہوں نے جان بُوجھ کر ضلالت و ہلاکت کی خوفناک راہوں کو اِختیار کیا۔ بس یہی لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اُن کے اپنے اِختیار کے حوالے کر دیا اور ہدایت قبُول کرنے پر اُنہیں مجبُور نہیں کیا۔ کیونکہ بنی نوعِ اِنسان کے لیے یہی اِختیار ایمان و عمل کا معیار ہے اور تمام

احکامِ شرعیہ کا اسی پر دار و مدار ہے۔ "یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا" کے یہی معنیٰ ہیں جس کی وضاحت "وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ" سے فرما دی گئی اور یہ حقیقت آفتاب سے زیادہ روشن ہو کر سامنے آگئی کہ اللہ تعالیٰ اِس بات سے پاک ہے کہ وُہ کسی کو گمراہی پر مجبُور کرے۔ اگر وہ مجبُور کرتا تو ہدایت و طاعت پر مجبُور کرتا جب اُس نے ہمیں ہدایت پر مجبُور نہیں کیا تو گمراہی پر مجبُور کرنا کس طرح اُس کے شایانِ شان ہو سکتا ہے؟ خلاصہ یہ کہ اللہ کسی کو گمراہ نہیں کرتا لیکن جو لوگ اللہ کی نافرمانی کر کے خُود گمراہ ہوتے ہیں اللہ اُن کی گمراہی میں اُنہیں چھوڑ دیتا ہے جس کا انجام ان کے حق میں اَبدی خسارہ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

بھلا تُم کس طرح کُفر کرتے ہو اللہ کے ساتھ حالانکہ تُم بے جان تھے تو اُس نے تم میں جان ڈالی پھر وُہ تمہاری جان نکالتا ہے پھر تُمہیں زندہ کرے گا۔ پھر تُم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۳۲

۳۲ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ: "کیف" استفہام حال کے لئے ہے۔ یہاں اس کے ساتھ تقریر اور توبیخ کے معنیٰ شامل ہو گئے اِس لئے وہ حقیقتِ استفہام کے لئے نہ رہا۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کے ساتھ انکار و تعجب شامل ہو گیا[1]۔ علامہ واحدی فرماتے ہیں کہ "کیف" یہاں استفہام کے لئے ہے اور مخلوق کے لئے تعجب کے معنیٰ میں مستعمل ہُوا ہے[2]۔ وحدانیت باری تعالیٰ پر چمکتے ہُوئے دلائل قائم ہونے کے باوجُود اُس کی توحید کے اِنکار پر زجر و توبیخ

کے ساتھ مُشرکین کو خطاب فرمایا گیا اور گویا ایمان والوں کو کہا گیا کہ ان کے کُفر و اِنکار پر تعجب کرو کہ یہ لوگ روشن دلیلوں کے باوجود کس طرح کُفر کرتے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ مُشرکین اللہ تعالیٰ کے مُنکر نہ تھے پھر "کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ" فرمانا کیونکر درست ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وُہ اللہ کے رسُول کے ساتھ کُفر کرتے تھے اور رسُول کے ساتھ کُفر کرنا اللہ ہی کے ساتھ کُفر کرنا ہے۔ لہٰذا "کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ" فرمانا بالکل صحیح ہے واقع کے عین مطابق ہے۔

وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا: اِس آیتِ کریمہ میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر فرمایا گیا۔ ایک موت وُہ ہے جو "کُنْتُمْ اَمْوَاتًا" کے ضمن میں بیان ہُوئی جس کے بعد دُنیوی حیات کا ذکر فرمایا گیا۔ دُوسری موت وُہ ہے جو دُنیوی حیات کے بعد طاری ہوتی ہے۔

جس طرح پہلی مَوت اور اس کے بعد دُنیوی حیات کا منکرین کو یقین ہے اِسی طرح دُوسری مَوت بھی اُن کے نزدیک مُشاہد اور یقینی ہے۔ اس مَوت کے بعد دُوسری حیات کا ذکر فرمایا گیا جسے منکرین تسلیم نہیں کرتے لیکن اس حیات پر حیاتِ دُنیوی کو بطورِ دلیل اس آیت میں پیش کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وُہ اللہ جس نے پہلی موت کے بعد تمہیں حیات دی وُہ اِس بات پر بھی قادر ہے کہ اس مَوت کے بعد بھی تمہیں زندہ کر دے اور تُم حسابِ اعمال اور جزاء اور سزا کے لیئے اُسکی بارگاہ میں پیش کر دیئے جاؤ۔ دُنیوی مَوت کے بعد اُس اُخروی حیات کا ذکر ایسا دعویٰ ہے جس پر پہلی موت کے بعد دُنیوی حیات چمکتی ہُوئی دلیل ہے۔ اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "پہلے تُم مُردہ تھے، تمہاری موت کے بعد اللہ نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مَوت دے گا، موت کے بعد پھر زندہ کرے گا"۔ "تناسخ یعنی آواگون" کا شُبہ پیدا کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں "کُنْتُمْ اَمْوَاتًا" سے بے جان ہونا مُراد ہے جیسا کہ قرآن مجید میں دُوسری جگہ ارشاد فرمایا، وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ "یعنی ہم نے اِنسان کو مٹی کے ست سے پیدا کیا"۔ ظاہر ہے کہ مٹی کا "ست" بے جان ہوتا ہے۔ یہ مُراد نہیں کہ پہلے تُم زندہ تھے پھر تُمہارے مرنے کے بعد ہم نے تمہیں

کے ساتھ مُشرکین کو خطاب فرمایا گیا اور گویا ایمان والوں کو کہا گیا کہ ان کے کُفر و اِنکار پر تعجب کرو کہ یہ لوگ روشن دلیلوں کے باوجود کس طرح کُفر کرتے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ مُشرکین اللہ تعالیٰ کے مُنکر نہ تھے پھر "کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ" فرمانا کیونکر درست ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وُہ اللہ کے رسُول کے ساتھ کُفر کرتے تھے اور رسُول کے ساتھ کُفر کرنا اللہ ہی کے ساتھ کُفر کرنا ہے۔ لہٰذا "کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ" فرمانا بالکل صحیح ہے واقع کے عین مطابق ہے۔

وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا: اِس آیتِ کریمہ میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر فرمایا گیا۔ ایک موت وُہ ہے جو "کُنْتُمْ اَمْوَاتًا" کے ضمن میں بیان ہُوئی جس کے بعد دُنیوی حیات کا ذکر فرمایا گیا۔ دُوسری موت وُہ ہے جو دُنیوی حیات کے بعد طاری ہوتی ہے۔

جس طرح پہلی مَوت اور اس کے بعد دُنیوی حیات کا منکرین کو یقین ہے اِسی طرح دُوسری مَوت بھی اُن کے نزدیک مُشاہد اور یقینی ہے۔ اس مَوت کے بعد دُوسری حیات کا ذکر فرمایا گیا جسے منکرین تسلیم نہیں کرتے لیکن اس حیات پر حیاتِ دُنیوی کو بطورِ دلیل اس آیت میں پیش کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وُہ اللہ جس نے پہلی موت کے بعد تمہیں حیات دی وُہ اِس بات پر بھی قادر ہے کہ اس مَوت کے بعد بھی تمہیں زندہ کر دے اور تُم حسابِ اعمال اور جزاء اور سزا کے لیئے اُسکی بارگاہ میں پیش کر دیئے جاؤ۔ دُنیوی مَوت کے بعد اُس اُخروی حیات کا ذکر ایسا دعویٰ ہے جس پر پہلی موت کے بعد دُنیوی حیات چمکتی ہُوئی دلیل ہے۔ اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "پہلے تُم مُردہ تھے، تمہاری موت کے بعد اللہ نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مَوت دے گا، موت کے بعد پھر زندہ کرے گا"۔ تناسخ یعنی "آواگون" کا شُبہ پیدا کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں "کُنْتُمْ اَمْوَاتًا" سے بے جان ہونا مُراد ہے جیسا کہ قرآن مجید میں دُوسری جگہ ارشاد فرمایا: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ "یعنی ہم نے اِنسان کو مٹی کے ست سے پیدا کیا"۔ ظاہر ہے کہ مٹی کا "ست" بے جان ہوتا ہے۔ یہ مُراد نہیں کہ پہلے تُم زندہ تھے پھر تُمہارے مرنے کے بعد ہم نے تمہیں

زندہ کیا۔ ایسی صورت میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا۔ لیکن "کُنْتُمْ اَمْوَاتًا" فرمانے میں اِس شُبہ کی کوئی گنجائش نہیں بلکہ ان الفاظ سے اس شبہ کا اِزالہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں "اَمْوَاتًا" سے پہلے کسی حیات کا ذکر نہیں۔ آواگون کی صورت میں ہر حیات سے پہلے موت اور ہر موت سے پہلے حیات ہے۔ کسی مرحلہ پر یہ چکر ختم ہونے میں نہیں آتا۔ حالانکہ اِس آیت کریمہ میں "ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ" فرما کر دُوسری حیات کے بعد مَوت کے تصوّر کو ختم کر دیا گیا۔ اگر کہا جائے کہ بعض مُؤمنین پر جہنّم میں مَوت کا طاری ہونا حدیث میں وارد ہے جیسا کہ مُسلم شریف (ص ۱۴۲ ج ۱۰) میں ہے کہ دوزخ میں کچھ لوگوں کو آگ کا عذاب ہوگا، فَاَمَاتَہُمُ اللّٰہُ اِمَاتَۃً: پھر اللہ اُن پر مَوت طاری کر دے گا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ "ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ" سے جس مَوت کی نفی مفہوم ہوتی ہے وُہ مَوتِ عامّہ ہے اور یہ مَوت چند افراد کے ساتھ مخصوص ہے اس لِئے کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ علمائؒ نے اس موت سے "نوم" مُراد لی ہے اور کہا ہے کہ وُہ گنہگار جب اپنے گناہوں کی سزا بھگت چکیں گے اور اُنکی شفاعت کا وقت قریب آئے گا تو اُن پر نیند طاری کر دی جائے گی تاکہ اس کے بعد اُنہیں عذاب کی تکالیف کا احساس نہ ہو۔

بعض لوگ اِس آیت کریمہ سے حیاتِ برزخی کا اِنکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دُنیوی مَوت کے بعد "ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ" سے صِرف قیامت کے دِن زندہ کیا جانا مُراد ہے۔ بر تقدیر تسلیم اس کا جواب یہ ہے کہ آیت کریمہ میں حیاتِ برزخی کی نفی نہیں فرمائی گئی۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہاں اس کا ذکر نہیں ہُوا، تو مَیں عرض کروں گا کہ عدمِ ذکر سے وجُود کی نفی لازم نہیں آتی۔ حیاتِ برزخی کے وجُود پر کتاب وسُنّت سے دُوسرے دلائل موجُود ہیں، مثلاً قرآن مجید میں فرمایا: اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْہَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَۃُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (مؤمن آیت ۴۶) یعنی فرعونیوں کو صُبح وشام نارِ جہنّم پر پیش کیا جاتا ہے اور جس دن قیامت قائم ہوگی کہا جائے

گا کہ اُنہیں سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔" ظاہر ہے کہ حیات کے بغیر عذاب متصور نہیں نیز شہداء کے حق میں فرمایا: "بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ" (بقرہ آیت ۱۵۴) اِنہیں شہداء کے حق میں دُوسری جگہ فرمایا: "بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ" (آل عمران، آیت ۱۶۹) عذابِ قبر کے بارے میں بیشمار اَحادیث وارد ہُوئیں جو یقیناً حیاتِ برزخی کی دلیل ہیں، ان کے علاوہ دیگر آیاتِ قرآنیہ بھی حیاتِ برزخی کی روشن دلیلیں ہیں اور بکثرت احادیثِ نبویہ سے حیاتِ برزخی ثابت ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا
فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰٓى
اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ
وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

(اللہ) وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے زمین کی سب چیزوں کو پھر متوجہ ہُوا آسمان کی طرف تو ٹھیک سات آسمان بنائے اور وُہ ہر چیز کو خُوب جانتا ہے۔ ۳۳

۳۳ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ : اِس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مُنکرین کو اپنی معرفت کے دلائل کی طرف متوجہ فرمایا اور ساتھ ہی ان نعمتوں کا ذکر فرمایا۔ جن کے ہوتے ہُوئے کُفر و انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ جواہر و اعراض، عناصر اجسام اور اُن کی اَقسام، دریا، پہاڑ، درخت، پھُول، پھل جمادات و نباتات، حیوانات، معدنیات اور ہمہ قسم کی پیداوار اور عجائبِ مخلُوقات بلکہ ہر چیز اللہ کی وحدانیت پر روشن دلیل ہے

جس سے وجودِ باری تعالیٰ اور اُس کے صفاتِ کاملہ کا ثبوت ملتا ہے، اس کی صنعت و قدرت، علم و حکمت ہر چیز سے ظاہر اور ثابت ہوتی ہے۔ پھر یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمتیں ہیں جن کا شمار ناممکن ہے۔ ان سے دینی اور دُنیوی منافع حاصل ہوتے ہیں۔ عجائبِ قُدرت میں غور و فکر، تدبر و تعقل ایسی منفعت ہے جس سے دینی اور دُنیوی سعادات و برکات وابستہ ہیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ نعمت وہی ہے جسے ہم کھاتے پیتے اور بطریقِ معروف اپنے استعمال میں لاتے ہیں بلکہ وُہ سب چیزیں بھی نعمتیں ہیں جن سے علم و حکمت، عبرت اور نصیحت کا حصُول ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین میں ہر قسم کی نعمتیں ہمارے لیے پیدا فرمائی ہیں جن کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ہم ان سے نفع اُٹھائیں، اللہ کی معرفت حاصل کریں اور ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائیں۔ نکتہ: اس آیتِ کریمہ اور دیگر آیاتِ قرآنیہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کی دلیلوں اور نعمتوں کو بیان فرما کر اپنے بندوں کو اپنی طرف متوجہ فرمایا ہے اور "هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى" (فتح: آیت ۲۸) فرما کر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ مقدسہ کو بھی اپنی معرفت کی روشن دلیل اور نعمتِ عظیمہ کی حیثیت سے پیش فرما کر اپنے بندوں کو اپنی طرف بلایا ہے۔ گویا تمام دلائلِ معرفت کا مجمُوعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ مقدسہ ہے۔ اِسی طرح تمام نعمتوں کا خزینہ بھی حضُور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی کا وجُودِ اقدس ہے بلکہ کوئی دلیل جب تک انوارِ رسالت کی روشنی میں نہ دیکھی جائے معرفت کا فائدہ نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ علُومِ عقلیہ میں مہارتِ تامہ رکھنے والے مشہُور اکابر عقلاء و حکماء نے ان دلائل سے معرفت حاصل نہیں کی۔ کیُونکہ نُورِ نبوت سے اُنہوں نے روشنی حاصل نہیں کی تھی اسی طرح یہ سب نعمتیں صحیح معنیٰ میں ہمارے لیے اِسی وقت نعمت قرار پاسکتی ہیں جب اِن کا حصُول رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وساطت سے ہو، اس کے بغیر کوئی نعمت حقیقی نعمت نہیں ہوسکتی بلکہ جس نعمت کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ مقدسہ سے نہ ہو وُہ زحمت بن جاتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہُوئی پاک نعمتیں (مال ہو یا اولاد)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے الگ ہو کر مثلاً زنا، سود، رشوت، غصب اور سرقہ کے ذریعے حاصل کی جائیں تو وہ بظاہر نعمت ہونے کے باوجود حقیقتاً زحمت ہوں گی۔ پھر یہ کہ یہ سب دلیلیں معرفتِ الٰہیہ کی خاموش دلیلیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ لوگ اُن کی عبادت کرتے رہے اور یہ سب دلیلیں خاموش رہیں۔ ناطق دلیل صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مقدسہ ہے یا وہ دلیلیں جن کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رُوحانی فیض سے ناطق بنا دیا۔ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ تمام دلائلِ معرفت اور اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطہ سے حاصل کیا جائے۔

لفظ "ارض" جنس ہے جس کے مفہوم میں ساتوں زمینیں شامل ہیں۔ جیسا کہ آیتِ کریمہ "اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ" (الطلاق: آیت ۱۲) اور اس کے علاوہ احادیث سے سات زمینوں کا ہونا ثابت ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ: "استویٰ" کے صلہ میں جب "اِلیٰ" ہو تو اُس کے معنیٰ قَصَدَ اور اَقْبَلَ کے ہوتے ہیں، یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان کا قصد فرمایا اور اس کی طرف متوجہ ہُوا۔ زمین و آسمان کی تخلیق میں قبل و بعد کا مسئلہ علماء میں مختلف فیہ رہا ہے۔ اَدِلّۂ شرعیہ کی روشنی میں علماء محققین کے نزدیک قولِ مختار یہ ہے کہ آسمان سے پہلے جرمِ زمین پیدا ہُوا اِس کے بعد آسمان پیدا کیا گیا اور پھر آسمان کی پیدائش کے بعد جرمِ زمین کو پھیلانے کے ساتھ اس کے سات طبقے کئے گئے اور اس میں اشیاءِ ارضیہ کو پیدا کیا گیا پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان کی طرف قصد فرما کر اسے ہموار کیا اور سات آسمان بنا دیئے۔ زمین کے ساتھ آسمان اور اس کی جملہ مخلوقات بھی اللہ کی معرفت کی دلیلیں اور اُس کی عظیم ترین نعمتیں ہیں۔

وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ: ہر چیز کا خالق ہونا اس امر کی روشن دلیل ہے کہ ہر چیز کو وُہ خُوب جانتا ہے۔ کیونکہ علم کے بغیر خلق و ایجاد ممکن نہیں۔ اس نے اپنے علم و حکمت کے مطابق ان تمام نعمتوں اور معرفت کی دلیلوں سے فائدہ اُٹھانے کے لئے آدم

اور بنی آدم کو مخلوق فرمایا اور جامع استعداد عطا فرمائی کہ وہ پوری کائنات سے رضائے الٰہی کے مطابق استفادہ کر سکیں۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ
اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ
قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ
يَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ
وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

اور (یاد کیجئے) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا بیشک میں بنانے والا ہوں زمین میں (اپنا) نائب۔ اُنہوں نے کہا کیا تو اس میں اسے (نائب) بنائیگا جو وہاں فساد کرے اور خُون بہائے؟ اور ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں فرمایا بیشک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ ۳۴ھ

۳۴ھ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ : قرآنِ مجید میں جہاں بھی لفظ "اِذْ" وارد ہوا وہاں اُذْکُرْ محذوف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ کلمہ زائدہ ہے۔ لیکن قول اوّل راجح ہے۔ خلافتِ الٰہیہ کے تذکرے میں لفظ اَللّٰہ کی بجائے رَبُّكَ فرمانا اِس حکمت پر مبنی ہے کہ اظہارِ ربوبیت

غلط اور مضحکہ خیز ہے اور یہ قول ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہہ دے کہ جوہر و عرض، مادہ و جسم، جماد اور نبات، حجر و شجر، حیوان اور تمام عناصر بس وہی حقائق ہیں جو انسان میں پائے جاتے ہیں۔ انسان سے باہر نہ کوئی جوہر ہے، نہ کوئی عرض، نہ عناصر ہیں، نہ اجسام، نہ جماد ہے نہ نبات اور نہ ہی کوئی حیوان۔ کوئی بیوقوف اور پاگل بھی یہ بات ماننے کے لئے آمادہ نہ ہوگا لہٰذا حقیقتِ انسانی میں پائی جانے والی حقیقتِ ملکیہ کو فرشتہ کہہ کر خارج میں فرشتہ کے منفرد وجود کا انکار کرنا کتاب و سنت کے خلاف اور عقلِ سلیم کے منافی ہے۔ نظریات اور عقائد کے اختلاف کے باوجود فرشتوں کے منفرد وجود کا انکار یہود و نصاریٰ بلکہ مشرکینِ عرب نے بھی نہیں کیا۔ کیونکہ ان سب کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت ضرور پہنچی۔ باوجود کفر و شرک کے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کا کچھ نہ کچھ اثر اقوامِ عالم میں ضرور پایا گیا فرشتوں کے وجود کو تسلیم کرنا انہیں اثرات میں سے ہے صحیح مسلم (ص ۲۱۳ ج ۲) میں حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا خُلِقَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ نُّوْرٍ یعنی "فرشتے نور سے پیدا کئے گئے ہیں"۔ ملائکہ معصوم ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس اور اس کے احکام کی بجاآوری میں مصروف رہتے ہیں۔ **استشارہ**، اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے فرمانا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں، معاذ اللہ ان سے اذن حاصل کرنے کے لئے نہ تھا۔ بلکہ محض استشارہ یعنی طلبِ مشورہ کے لئے تھا اور یہ استشارہ بھی احتیاج کی بنا پر نہ تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی امر میں کسی کا محتاج نہیں۔ بلکہ یہ استشارہ بعض حکمتوں پر مبنی تھا جیسے ملائکہ اور خلیفہ کا اکرام۔ حدیث مرفوع اِنَّ رَبِّیْ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی اسْتَشَارَنِیْ فِیْ اُمَّتِیْ (مسند ص ۲۹۲ ج ۵۱) یعنی "میرے رب نے میری اُمت کے بارے میں مجھ سے مشورہ طلب فرمایا"۔ بھی اسی حکمت پر مبنی ہے اور یہ استشارہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کی لاعلمی یا احتیاج کی بنا پر نہ تھا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی اُمت کے اکرام پر مبنی تھا۔ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (آلِ عمران: آیت ۱۵۹) فرما کر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کو صحابہ کرام سے مشورہ فرمانے کا جو حکم دیا وہ بھی حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عزت افزائی کے لئے تھا ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی سے مشورہ کے محتاج نہ تھے۔

اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کو فرشتوں اور جنات سب پر خلیفہ مقرر فرمانے والا تھا مگر اُن کی خلافت کے بارے میں استشارہ صرف فرشتوں سے ہُوا، جنات سے کوئی رائے طلب نہیں فرمائی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے اس کے اہل تھے اور جنات سرکش و نافرمان تھے۔ خیر کی صلاحیت نہ رکھنے کے باعث ان میں رائے دینے کی اہلیت نہ تھی۔ معلوم ہُوا کہ جو رائے دینے کا اہل نہ ہو اُس سے رائے طلب کرنا سُنّتِ الٰہیہ کے خلاف ہے۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ : آدم علیہ السلام کو پیدا فرمانے سے پہلے فرمایا میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہُوں اور پیدا کرنے کے بعد اُنہیں مسجودِ ملائک بنا کر فرمایا کہ آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ اس میں بیشمار حکمتیں ہیں۔ انشاءاللہ اس مسئلہ پر ہم آگے چل کر کچھ کلام کریں گے۔

خَلِیْفَۃً : لُغت میں پیچھے آنے والے کو "خلیفہ" کہتے ہیں۔ لیکن یہاں نائب کے معنیٰ میں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا نائب ہونے کی حیثیت سے زمین و آسمان کی اشیاء میں تصرُّف کرنے والا۔ جس سے آدم علیہ السلام مُراد ہیں۔ آدم علیہ السلام کے بعد یہ خلافت ان کی اولاد کو منتقل ہُوئی۔ انبیاء و رُسل کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنے اپنے دَور میں اس منصبِ خلافت پر فائز رہے حتیٰ کہ ان میں سے بعض انبیاء علیہم السلام کو "خلیفہ" کا لقب بھی عطا ہُوا جیسے حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا گیا: "یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ" (ص، آیت ۲۶)

حضرات انبیاء کرام کے بعد صدیقین اور اولیائے کاملین ان کے قائم مقام ہُوئے اور بالواسطہ وُہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ قرار پائے۔

خلافتِ الٰہیہ کو آدم علیہ السلام کی ذات میں منحصر سمجھنا صحیح نہیں اور اسی طرح یہ بات بھی دُرست نہیں کہ اولادِ آدم علیہ السلام کا ہر فرد خلیفۃ اللہ ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ خلافتِ الٰہیہ کے لئے جو صلاحیت اور استعداد اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی، اُن کی اولاد میں

وُہ افراد جو اس صلاحیت اور استعداد کے حامل ہوں وہی اس منصب خلافتِ الٰہیہ کے اہل قرار پائیں گے اور وہ افراد آدم علیہ السلام کی اولاد میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پیدا ہونے والے تمام انبیاء و رسل کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں اور اُن کے علاوہ قیامت تک پیدا ہونے والے صدیقین اور اولیائے صالحین ہیں۔ انبیاء اور رُسلِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سب معصوم ہیں اُن کا ہر کام خلافتِ الٰہیہ کے تحت ہے، اُن کے علاوہ اگرچہ منفرد حیثیت سے کوئی معصوم نہیں مگر من حیث المجموع وہ بھی معصوم ہیں۔ یعنی اولیائے کاملین صالحین جس اَمر پر متفق ہو جائیں وہ معصیت نہیں ہو سکتا اور اپنے اجماعی و اتفاقی فیصلہ میں وہ خلیفۃ اللہ کا حکم رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے اربابِ حل وعقد مومنین صالحین کتاب وسُنّت کی روشنی میں بطیبِ خاطر جو متفقہ فیصلہ کریں وُہ شرعاً واجب القبول ہے۔

دین کے استحکام، ملّت کے تحفّظ اور اُمتِ مُسلمہ کے دینی و دُنیوی حقوقِ شرعیہ کی حفاظت و رعایت کے لیے اکابرینِ اُمّت، اربابِ حل وعقد پر واجب ہے کہ وُہ اللہ کی زمین میں خلافتِ الٰہیہ کا نظام قائم کریں اور "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً" (بقرہ: آیت ۳۰) کی حکمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں جیسا کہ خلافتِ راشدہ اور بعض دیگر ادوار مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے دَور میں ہُوا۔ اور اگر کبھی اس امامتِ کُبریٰ کا نظام قائم ہونے کے امکانات مضمحل ہو جائیں جیسا کہ اس وقت یہی صُورتحال ہے، تو تمام دُنیا کے مُسلمانوں پر واجب ہے کہ وُہ جُزوی اور انفرادی طور پر اپنے اپنے ملک میں مستحکم بنیادوں پر اسلامی معاشرہ قائم کریں اور اپنے مُلکی حالات کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کے احکام کو اللہ کے بندوں پر نافذ کرنے کی کامیاب کوشش کریں۔ اور اِس حقیقت کو دل و دماغ میں راسخ کریں کہ حُکم صرف اللہ کا ہے جسے نافذ کرنے کے لئے بندہ خُود حاکم نہیں بلکہ احکم الحاکمین کا نائب اور قائمقام ہے۔ اگر اتنی جزوی کوشش بھی نہ کی گئی تو اللہ تعالیٰ کے حضُور کوئی بھی جواب دہی کے مؤاخذہ سے نہ بچ سکے گا۔ اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے خلافتِ ارضی اور کُفار پر غالب رہنے کا وعدہ فرمایا لیکن

خلافتِ راشدہ اور عادلہ کے بعد صدیاں گزر چکیں، امتِ مسلمہ اِس نعمت سے محروم ہے اِس کا جواب یہ ہے کہ من حیث الامۃ یہ وعدہ انہیں مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے جو ایمان و عمل میں کامل ہوں۔ کمالِ ایمان کا معیار یہ ہے کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت، اللہ اور رسول کے ماسوا پر غالب ہو اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا کے لئے فی سبیل اللہ موت کی تمنا اُن کے دلوں میں اتم و اکمل طور پر پائی جائے۔

خلافتِ عادلہ کے بعد مسلمانوں کی اکثریت مسلمان ہونے کے باوجود اس کمالِ ایمان سے محروم ہوگئی۔ ان کے دلوں پر اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے دنیا کی محبت غالب ہوگئی۔ اِس حُبِّ دنیا کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ موت سے اُن کے دِلوں میں کراہت پیدا ہوگئی۔ اور اللہ کیلئے جان دینے کا جذبہ مضمحل ہو گیا اور اُن کی یہ بدحالی، خلافتِ ارضی اور اغیار پر غالب رہنے کی نعمت سے محرومی کا سبب بن گئی۔ یہ وُہ صورتِ حال ہے جس کی نشاندہی زبانِ رسالت نے پہلے ہی فرمادی تھی: مَآ اَخَافُ عَلَيْكُمْ اَنْ تُشْرِكُوْا بَعْدِيْ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَا الْفَقْرَ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ وَلٰكِنْ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ اَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا كَمَا بُسِطَتْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ فَتَنَافَسُوْهَا كَمَا تَنَافَسُوْهَا وَتُهْلِكَكُمْ كَمَآ اَهْلَكَتْهُمْ (بخاری، ص ۱۱۷۹، ۴۴۲۷ / ج ۱) یعنی "مجھے اپنے بعد تم پر شرک اور فقر کا کوئی خوف نہیں، خوف یہ ہے کہ تم پر دُنیا کشادہ ہو جائے اور حُبِّ دُنیا کی وجہ سے تم بھی گذشتہ اُمتوں کی طرح ہلاک ہو جاؤ۔" نیز ابُوداؤد و بیہقی کی حدیث میں اُمتِ مسلمہ کی اس بدحالی کا ذکر نہایت ہی المناک صُورت میں وارد ہے۔ حضرت ثوبان سے روایت ہے، رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اے مسلمانو! قریب ہے کہ کافروں کی جماعتیں تم پر حملہ آور ہونے کے لئے اس طرح ایک دُوسرے کو بُلائیں گی جیسے کسی پیالے میں کھانا رکھا ہو اور اُسے کھانے کے لئے ہر طرف سے لوگوں کو بلایا جائے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ حضور، کیا اُس وقت ہم قلیل ہوں گے؟ فرمایا نہیں، تُم اس وقت بہت کثیر تعداد میں ہو گے لیکن تُم اس وقت

سیلاب کے جھاگ اور اُس کے خس و خاشاک کی طرح ہو گے (یعنی ایمانی قوت و شجاعت تم میں باقی نہ رہے گی)، اللہ تعالیٰ تمہاری ہیبت اور تمہارا رعب دشمن کے دِل سے نکال دیگا اور تمہارے دِلوں میں بُزدلی اور کمزوری پیدا کر دے گا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا حضور! بُزدلی اور کمزوری کا سبب کیا ہو گا؟ فرمایا حُبُّ الدُّنْیَا وَ کَرَاھِیَۃُ الْمَوْتِ۔ "دُنیا کی محبت اور موت کی کراہت" ظاہر ہے کہ جو شخص دُنیاوی زندگی پسند کرے گا موت اس کے نزدیک ناپسند ہی ہو گی۔ عرصہ دراز سے مُسلمان اِسی بدحالی میں مُبتلا ہیں اور موجُودہ دَور میں تو یہ بدحالی ایسی خوفناک صُورت اِختیار کر گئی ہے کہ اس کے نتائج کے تصوّر سے بھی دل لرز جاتا ہے۔

اِس مقام پر یہ شُبہ پیدا نہ کیا جائے کہ عُلماء، اولیاء اور اصفیاء ہر دَور میں پائے گئے جو ہر طرح اس کے اہل تھے کہ اُنہیں یہ خلافتِ ارضی اور غلبہ علی الکفار کی نعمت عطا کی جائے۔ میں عرض کروں گا کہ اِس میں شک نہیں کہ ایسے مؤمنین کاملین ہر دَور میں پائے گئے اور یقیناً یہ دَور بھی ایسے حضرات سے خالی نہیں لیکن عامۃ المسلمین کی بہ نسبت وہ بہت تھوڑے رہے اور اُمتِ مسلمہ کے لیئے یہ وعدہ من حیث الامۃ تھا جس کے لیئے اکثریت کا اسی اہلیت سے متصف ہونا ضروری ہے۔ اکثریت جب گناہوں میں مبتلا ہو جاتی ہے تو قلیت نیک ہونے کے باوجُود ہلاکت کی زد میں آجاتی ہے اگرچہ وُہ ہلاکت اُن کے حق میں عذاب نہ ہو۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے: اِذَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِقَوْمٍ عَذَابًا اَصَابَ الْعَذَابُ مَنْ کَانَ فِیْھِمْ ثُمَّ بُعِثُوْا عَلٰٓی اَعْمَالِھِمْ (بخاری ص ۱۰۵۳ ج ۲) یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب بھیجتا ہے تو نیک و بد بھی اس میں ہلاک ہو جاتے ہیں پھر جب وُہ اٹھائے جائیں گے تو ہر ایک کا اُٹھایا جانا اس کے اچھے یا بُرے اعمال کے مطابق ہو گا۔

مجدّدین نے ہر دَور میں گمراہوں کی پیدا کی ہُوئی ظلمت و ضلالت اور ہر قسم کے گرد و غبار سے دینِ متین کو پاک کر کے اُمتِ مُسلمہ کے سامنے پیش کیا اور مُسلمانوں کو بداعتقادی و بدعملی

سے بچانے کی بھرپور کوشش کی لیکن خلافتِ الٰہیہ کا نظام قائم نہ ہو سکا۔ مجددین کے علاوہ دین کا جذبہ رکھنے والے بعض اہلِ دل حضرات نے بھی اپنے محدود ماحول میں مخلصانہ جدوجہد کی کوششیں کیں جو بارآور نہ ہو سکیں۔ اِس میدان میں کچھ ایسے لوگ بھی نظر آئے جن کے متعلق کہا گیا کہ یہ ایک ایسا حکیمانہ فلسفہ لے کر اُٹھے ہیں جو حکومتِ الٰہیہ کی رُوحِ رواں ہے۔ لیکن عملی طور پر وہ فلسفہ بھی الفاظ کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اِس مسلسل ناکامی اور محرومی کی داستان بڑی طویل ہے۔ اجمالی طور پر صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ خلافتِ الٰہیہ اور امامتِ کبریٰ کا قیام کوئی آسان کام نہیں۔ ضروری ہے کہ اُمتِ مسلمہ بحیثیتِ مجموعی ایمانِ کامل سے متصف ہو کر جذبۂ جہاد و شوقِ شہادت سے معمور ہو اور ایسی رُوحانی قیادت اُسے میسر ہو جائے جو اُسے ایک مرکز پر مجتمع کر سکے۔ اگرچہ موجودہ حالات میں بظاہر اس کی توقع نہیں کی جا سکتی مگر ہمارا فرض ہے کہ ہم مایوس نہ ہوں اور اپنی کوششوں کو مسلسل جاری رکھیں۔ کتاب و سُنّت کی رُوشنی میں ہمیں اس اُمید کی جھلک نظر آ رہی ہے کہ انشاءاللہ جلد یا بدیر ایک عظیم رُوحانی قیادت سامنے آئے گی جو صحیح معنیٰ میں خلافتِ الٰہیہ قائم کر کے اُمتِ مُسلمہ کو امامتِ کبریٰ کے مرکز پر جمع کر دے گی اور بقول حافظ شیرازی ؒ "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" کا منظر نگاہوں کے سامنے ہوگا۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

رہا یہ اَمر کہ عورت بھی نوعِ انسان کی ایک صنف ہے وُہ بھی خلافتِ الٰہیہ کی حقدار ہونی چاہیئے تو مَیں عرض کروں گا کہ خلافتِ الٰہیہ کے نظام میں یقیناً عورت کو بلند مقام حاصل ہے۔ خلافتِ الٰہیہ کی تائید و حمایت اور اُس کی تقویت کے لئے بناتِ اسلام جس کام کی شرعی و طبعی اہلیت رکھتی ہیں، اُن کا اُس کی انجام دہی کے منصب پر فائز ہونا اسلامی نظام کا عین مقتضیٰ ہے لیکن جو اُمور ان کی فطرتِ سلیمہ اور طبیعتِ مستقیمہ کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے اُن کی انجام دہی بناتِ اسلام کے سُپرد ہونا حکمت و مصلحت اور شریعت کے خلاف ہوگا۔ مثلاً جُمعہ اور جماعات کا قائم کرنا اور اِسی طرح اُن کا قوّام ہونا دُرست نہ ہوگا کیونکہ یہ حیثیت

اور استعداد اللہ تعالیٰ نے مَردوں ہی کو عطا فرمائی۔ **فائدہ:** قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس نائب کو "خلیفہ"، "آدم"، "بشر" اور "اِنسان" چار لفظوں سے تعبیر فرمایا، سُورۂ بقرہ (آیت) میں ہے: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔ "بیشک میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں"۔ نیز اسی سُورت (آیت ۳۵) میں ہے: یٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ۔ "اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو"۔ سُورۂ صٓ (آیت) میں فرمایا: اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ۔ "جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا) میں بنانے والا ہوں مٹی سے بشر"۔ یہاں لفظ بشر سے حضرت آدم علیہ السلام مُراد ہیں۔ اور سُورۂ حجر (آیت ۲۶) میں فرمایا: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ۔ "اور بیشک ہم نے اِنسان کو بجنے والی سیاہ متغیر مٹی سے پیدا کیا"۔ اِس آیتِ کریمہ میں حضرت آدم علیہ السلام کو لفظ اِنسان سے تعبیر فرمایا۔ "خلیفہ" کے معنی یہاں پیچھے آنے والے کے نہیں بلکہ یہاں لفظ "خلیفہ" سے بحیثیت نائب ہونے کے متصرف فی الامور مُراد ہے۔ حکمتِ تخلیق کی بنا پر اُسے خلیفہ سے تعبیر فرمایا گیا۔ لفظ "آدم" اور "بشر" کی وضع ظاہرِ جسم، رنگ اور چمڑے کے معنی کے لیے ہے۔ اِن دونوں لفظوں سے ظاہرِ جسم یا جسمانی اوصاف اور خواص ہی کے معنی مفہوم ہوتے ہیں اور اس کی حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے اسے لفظ "اِنسان" سے تعبیر فرمایا۔ اِسی لیے مناطِقِ اِنسانی حقیقت کو دریافت کرنے کے لئے آدمی یا بشر کا لفظ اِستعمال نہیں کرتے بلکہ "اَلْاِنْسَانُ مَاهُوَ" کہہ کر ماہیتِ انسانی کو طلب کرتے ہیں۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام حقیقتِ بشریہ رکھنے کے باوجود اپنی حقیقتِ کاملہ جامعہ میں لوگوں کی مثل نہیں بلکہ اس سے بلند و بالا ہو کر محض چہرہ مُہرہ اور ظاہری جسمانیت میں مخاطبین کی مثل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "اِنَّمَآ اَنَا اِنْسَانٌ مِّثْلُكُمْ" کی بجائے "اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" فرمایا گیا۔ آدم علیہ السلام کو "بشر" اِس لیے کہا گیا کہ وُہ بادی البشرہ تھے یعنی اُن کا چہرہ مُہرہ صاف تھا، چوپایوں کی طرح اُن کے جسم پر بال نہ تھے۔ اور انسان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ لفظ انسان، نِسیان یا اُنس یا اِیناس سے مشتق ہے۔ نِسیان کے معنی بھولنا، اُنس کے معنی محبت

کرنا اور اِیناس کے معنیٰ دیکھنا ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: 'اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا۔' "موسیٰ علیہ السلام نے جانبِ طور سے آگ کو دیکھا۔" یہ تینوں معنیٰ آپس میں مربوط ہیں بایں طور کہ حُسن کو دیکھ کر محبت پیدا ہوتی ہے اور محبت جب منتہائے کمال کو پہنچتی ہے تو انسان محبوب کے ماسوا کو بھول جاتا ہے اور اس چیز کو ترک کر دیتا ہے جو وصالِ محبوب کی راہ میں رکاوٹ ہو۔ خلافتِ الٰہیہ کے منصب پر انسان کو فائز کرنے کی بنیادی حکمت یہی ہے کہ احکام الٰہیہ کو نافذ کرنے میں اس کا مطمحِ نظر صرف اللہ کی ذات ہو۔ اللہ سے غافل کرنے والی ہر چیز کو بھلا کر اللہ ہی کے احکام کو نافذ کرے اور اس کی راہ میں کوئی چیز حائل نہ ہونے پائے۔ اُنس اور محبت کے بغیر یہ بات ناممکن ہے۔ اِس لئے خلافتِ الٰہیہ کی اصل بنیاد اللہ کی محبت اور معرفت ہے۔ اس وصف کی صلاحیت نہ جنات میں تھی نہ ملائکہ میں، کیونکہ جامعیت کے بغیر یہ صلاحیت متصور نہیں اور جامعیت کا حامل صرف انسان تھا اِس لئے خلافتِ الٰہیہ کا منصب اسی کو عطا کیا گیا۔

اگر کہا جائے کہ آدم علیہ السلام باوجود اُنس یعنی محبتِ الٰہیہ کے جنت میں اللہ تعالیٰ کی نہی (وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ) کو کیسے بھول گئے؟۔ تو اس کا جواب سمجھنے سے پہلے اس حقیقت پر غور کرنا ہوگا کہ تخلیقِ آدم سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔ "یعنی میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں"۔ لیکن تخلیق کے بعد حکم ہوا کہ یٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ۔ "اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو"۔ (جنت میں سے جو چاہو بافراغت کھاؤ اور اس درخت کے قریب نہ جاؤ) زمین میں خلیفہ بنانے کا اِعلان فرما کر آدم علیہ السلام کو جنت میں رہنے کا حکم دینا بظاہر اس اِعلان کے خلاف معلوم ہوتا ہے لیکن غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اُس وقت جنت میں آدم علیہ السلام کی یہ سکونت محض ایک حکمت کو پورا کرنے کے لئے تھی۔ دُنیوی زندگی کے لئے اُن کا مستقل مسکن اور مستقر زمین ہی تھی۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً سے بھی یہ حقیقت واضح ہے۔ جنت کو اُن کا مسکن بنانے اور ایک خاص درخت سے انہیں روکنے کی حکمت

یہ تھی کہ زمین میں بحیثیت خلیفۃ اللہ جانے سے پہلے آدم علیہ السلام کی سیرت میں ان لوگوں کے لئے ایک نمونہ قائم ہو جائے جن سے احکامِ الٰہی کی تعمیل میں قصور اور کوتاہی کا صدور ہونے والا تھا کہ جس طرح "لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" کی تعمیل میں آدم علیہ السلام سے بظاہر لغزش سرزد ہوئی تو اُنہوں نے تواضع اور کمالِ عبدیت کی بنا پر اپنی اُس ظاہری لغزش کا اعتراف کر کے اپنے رب کی بارگاہ میں نہایت عاجزی کے ساتھ توبہ کرتے ہوئے اُس کی مغفرت اور رحمت طلب کی اسی طرح احکامِ الٰہیہ کی بجاآوری میں قصوروراروں اور گنہگاروں کو آدم علیہ السلام کی اتباع کرنی چاہیئے. اس کا انجام اُن کے حق میں وہی ہوگا جو آدم علیہ السلام کے حق میں ہوا یعنی اللہ تعالیٰ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی اور اُنہیں اپنا برگزیدہ فرمالیا۔ اور اگر کسی نے احکامِ الٰہیہ کی نافرمانی کر کے عاجزی کی بجائے تکبر اور توبہ کی بجائے سرکشی اختیار کی تو اُس کا انجام وہی ہوگا جو آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے حکمِ خداوندی کی نافرمانی کرنے والے ابلیس کا انجام ہوا اور ہمیشہ کے لئے ملعون قرار پایا۔ اگر اُس وقت جنت میں آدم علیہ السلام کی سکونت نہ ہوتی تو "لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" کی نہی بھی متصور نہ ہوتی اور نہ آدم علیہ السلام سے نہی کی خلاف ورزی کا صدور ہوتا۔ اور اُس ظاہری لغزش کے ہونے پر جو حکمت بیان کی گئی اُس کا تحقق بھی نہ ہوتا جب کہ علمِ الٰہی میں اس حکمت کا پورا ہونا متعین تھا. خلاصہ یہ کہ اگر آدم علیہ السلام سے "لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" کی نہی کا نسیان سرزد نہ ہوتا. تو اُن کے لئے جنت سے زمین پر آنے کا سبب نہ پایا جاتا، حالانکہ اُن کا زمین پر خلیفۃ اللہ بننا مُرادِ الٰہی تھا جس کی دلیل "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" ہے معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام اپنے محبوب اور مُرادِ محبوب کو نہیں بھولے بلکہ ایسی چیز کو بھولے جو محبوب اور اُس کی مُراد کے ماسوا تھی. اِس مقام پر یہ شبہ صحیح نہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ حضرت آدم کو اس نسیان کے بغیر بھی زمین پر لانے پر قادر تھا. بیشک اُس کی قدرت حق ہے لیکن اُس نے اظہارِ قدرت کو خود ہی حکیمانہ اسباب کے ساتھ مربوط فرمایا ہے، آدم علیہ السلام کا نسیان اُنہی اسباب میں شامل ہے. اللہ تعالیٰ کے قادر ہونے کے ساتھ اُس کا حکیم ہونا بھی برحق ہے اور حکیم کی شان نہیں کہ حکمت کے خلاف کوئی کام کرے.

حکمت کی رعایت سے قُدرت کی نفی نہیں ہوتی۔

آدم علیہ السلام کی اس ظاہری لغزش کو حقیقۃً معصیت نہ سمجھا جائے اور اس بات پر غور کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنّت میں ٹھہرا کر ایک خاص درخت کے قریب جانے سے منع فرما دیا اور شیطان کو اختیار دے دیا کہ وُہ اِس ممانعت کی خلاف ورزی میں آدم علیہ السلام کی لغزش کا سبب بن جائے اور صدورِ لغزش کے بعد آدم علیہ السلام کا زمین میں خلیفۃ اللہ ہونا جو منشاءِ ایزدی تھا حکیمانہ طور پر پُورا ہو جائے۔ اَدنیٰ تأمّل سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے منشا اور مُراد کو متحقّق فرمانے کے لِئے یہ سب حکیمانہ اَسباب پیدا فرمائے، ان اسباب میں آدم علیہ السلام کی ذاتِ مُقدّسہ کے ساتھ صِرف ایک ہی مُنبیادی سبب وابستہ ہے۔ اور وُہ اُن کا نِسیان ہے۔ ظاہر ہے کہ نسیان امرِ اختیاری نہیں اِس لِئے وُہ فی نفسہٖ کسی معصیت اور گُناہ کی بُنیاد قرار نہیں پا سکتا۔ بیشک اس واقعہ میں آدم علیہ السلام کی طرف عصیان کی نسبت نصِ قُرآنی میں وارد ہے لیکن یہ عصیان حقیقی نہیں بلکہ محض صُوری ہے، کیُونکہ معصیت بغیر عزم کے نہیں ہوتی اور قُرآن مجید ہی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد موجُود ہے کہ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا "آدم بھُول گئے ہم نے اُن کا عزم نہیں پایا"۔ آدم علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں اور نبی معصُوم ہوتا ہے، اِس لِئے وہ معصیتِ حقیقیہ سے پاک ہیں۔ رہا یہ امر کہ آدم علیہ السلام نے "رَبَّنَا ظَلَمْنَا" کہہ کر خُود اپنے ظُلم کا اعتراف کیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کا اپنی غیر اختیاری لغزش کو تواضع اور اِنکساری کی بنا پر لفظ "ظلم" سے تعبیر فرمانا کمالِ عبدیت ہے جسے ہمارا معصیت کہنا خُود معصیت ہوگا۔

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا: یہاں "ہمزہ" اِنکار اور اعتراض کے لِئے نہیں بلکہ تعجّب اور استفسار کے لِئے ہے۔ فرشتوں نے استِشارہ کے جواب میں عرض کیا۔ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ "رہا یہ اَمر کہ فرشتوں کو کیسے معلُوم ہُوا کہ "خلیفہ" زمین میں فساد و خونریزی کرے گا؟ اِس

کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ "خلیفہ" کے جسم کی ترکیب عناصر متضاد اور اجزائے مختلفہ سے ہوگی۔ ایک قول یہ ہے کہ لوحِ محفوظ کے ذریعے یہی بات فرشتوں کو معلوم ہو گئی تھی۔ یہ جان کر انہوں نے سمجھا کہ ایسی متضاد ترکیب کا نتیجہ فساد و خونریزی ہی ہو سکتا ہے۔ اسی لئے انہوں نے از راہِ تعجب اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا کہ فساد و خونریزی کرنے والے کو کیوں "خلیفہ" بنایا جا رہا ہے۔ ہمارے خیال میں ہماری تسبیح و تقدیس اور عصمت کا تقاضا یہ ہے کہ خلافتِ الٰہیہ کا استحقاق ہمارے ہی لئے ہونا چاہیئے۔ اگر کہا جائے کہ آدم علیہ السلام معصوم ہیں پھر ان کا زمین میں فساد و خونریزی کرنا کیونکر صحیح ہوگا؟ تو میں عرض کروں گا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو فسادی اور خونریز قرار نہیں دیا، یہ تو فرشتوں کا قول ہے جو قصورِ علم کی وجہ سے ان سے صادر ہوا۔ ان کے اسی قسم کے قصورِ علم کو اللہ تعالیٰ نے "اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" فرما کر ظاہر فرما دیا۔

اس مسئلہ کی تفصیل یہ ہے کہ خلافتِ الٰہیہ کے منصب پر معصوم اور غیر معصوم دونوں فائز ہو سکتے ہیں اگرچہ بعثتِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بنی آدم میں کسی معصوم کے پیدا ہونے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

کسی معصوم خلیفۃ اللہ سے فساد اور ناحق خونریزی کی معصیت سرزد نہیں ہوتی اور غیر معصوم صحیح معنیٰ میں وہی "خلیفۃ اللہ" ہو سکتا ہے جو فساد اور ناحق خونریزی کا مرتکب نہ ہو۔ خلافتِ الٰہیہ کی استعداد تو ہر فردِ بنی آدم میں رکھی گئی مگر مفسد و خونریز، ظالم و جابر اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس استعداد کو ضائع کر چکے۔ ایسی صورت میں اگر وہ زبردستی خلیفہ بن بیٹھیں تو وہ "خلیفہ" کہلائیں گے مگر ان کو خلیفۃ اللہ ہرگز نہ کہا جائے گا، نہ ان کی خلافت "خلافتِ الٰہیہ" قرار پائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمانا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں، فرمانِ خداوندی "وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ" (سورۃ النمل، آیہ ۶۲) کی طرح محض اخبار، یعنی "بتانا" ہے صحتِ خلافت کے لئے بطورِ شرط اسے نص قرار دینا صحیح نہیں، کما لا یخفی۔ اظہارِ رائے میں فرشتوں کی نظر اپنے اور خلیفہ کے صرف ظاہر حال تک محدود رہی۔ انہوں نے منصبِ خلافت کی حقیقت اور خلیفہ کے معیارِ اہلیت کو نہ

سمجھا۔ ان کے اسی نوعیت کے قصورِ علم کو ظاہر فرمانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ یعنی اے میرے فرشتو! میں وہ سب کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے محض تسبیح و تقدیس معیارِ خلافت نہیں نہ عناصرِ متضادہ سے مرکب ہونا منصبِ خلافت کے منافی ہے۔ بلکہ خلافت کا معیار یہ ہے کہ خلیفہ جن چیزوں پر تصرف کرے گا اُن سب کے حقائقِ لطیفہ بطور امثال و نظائر اُس کی ذات میں پائے جائیں تاکہ کوئی چیز اُس کے تصرف سے باہر نہ رہے۔ اِسی لیے زمین اور آسمان اور عالمِ امکان کی ہر شے اِنسان کی ذات میں جمع کر دی گئی۔ اِمام راغب مفردات القرآن میں فرماتے ہیں: اَلْعَالَمُ عَالَمَانِ اَلْکَبِیْرُ وَھُوَ الْفَلَکُ بِمَا فِیْہِ وَالصَّغِیْرُ وَھُوَ الْاِنْسَانُ لِاَنَّہٗ مَخْلُوْقٌ عَلٰی ھَیْئَۃِ الْعَالَمِ وَقَدْ اَوْجَدَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْہِ کُلَّ مَا ھُوَ مَوْجُوْدٌ فِی الْعَالَمِ الْکَبِیْرِ۔ "عالم دو ہیں، ایک عالمِ کبیر جو فلک الافلاک ہے۔ ان تمام موجودات و مخلوقات کے ساتھ جو اس میں پائی جاتی ہیں۔ دُوسرا عالمِ صغیر اور وُہ اِنسان ہے۔ اِس لیے کہ وُہ عالمِ کبیر کی ہیئت پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس میں ہر اُس چیز کو پیدا فرما دیا ہے جو عالمِ کبیر میں موجود ہے۔ متعدد آیاتِ قرآنیہ میں یہ مضمون وارد ہے مثلاً "سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ" (سورۂ حٰمٓ السجدہ، آیہ: ۵۳) نفسِ انسانی کا آفاقِ عالم سے تقابل ظاہر کرتا ہے کہ عالمِ کبیر کے سب حقائق اس عالمِ صغیر میں پائے جاتے ہیں جسے اِنسان سے تعبیر کیا گیا۔ سورۂ ذاریات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ" علامہ بیضاوی (متوفی ۷۹۱ھ) نے تفسیر بیضاوی میں اس کے تحت فرمایا: اَیْ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اٰیَاتٌ اِذْ مَا فِی الْعَالَمِ شَیْءٌ اِلَّا وَفِی الْاِنْسَانِ لَہٗ نَظِیْرٌ۔ (بیضاوی، ج: ۲، ص: ۳۳۳، الذّٰریٰت)۔ یعنی "تمہاری جانوں میں تمام نشانیاں موجود ہیں اِس لیے کہ سارے عالم میں ایسی کوئی شئ نہیں جس کی نظیر نفسِ اِنسانی میں موجود نہ ہو۔ بعینہٖ یہی مضمون مندرجہ ذیل مفسرین نے اِس آیتِ کریمہ کے تحت حسبِ ذیل عبارات میں ارقام فرمایا: علامہ نیشاپوری (متوفی ۴۰۶ھ)

نفسیر غرائب القرآن (ص: ۹، پ۲۷، علی ہامش ابن جریر) میں ارشاد فرماتے ہیں: "وَذٰلِكَ اَنَّ الْاِنْسَانَ عَالَمٌ صَغِيْرٌ فِيْهِ تَشَابُهٌ مِّنَ الْعَالَمِ الْكَبِيْرِ"۔ قاضی ثناءاللہ پانی پتی (متوفی ۱۲۲۵ھ) تفسیر مظہری (ج ۹، ص ۸۳) میں تحریر فرماتے ہیں: "فَاِنَّ فِي الْعَالَمِ الصَّغِيْرِ اَعْنِيْ نَفْسَ الْاِنْسَانِ كَائِنٌ مِّنَ الْاٰيَاتِ كَمَا فِي الْعَالَمِ الْكَبِيْرِ"۔ علامہ محمود الوسی (متوفی ۱۲۷۰ھ) تفسیر روح المعانی (ص: ۹، پ۲۷) میں لکھتے ہیں: "اِذْ لَيْسَ فِي الْعَالَمِ شَيْءٌ اِلَّا وَفِي ذَاتِ الْاِنْسَانِ لَهٗ نَظِيْرٌ"۔ علامہ شیخ محمد نووی الجاوی (متوفی ۱۳۱۶ھ) تفسیر مراح لبید (ص: ۳۲۳، ج: ۲) میں فرماتے ہیں: "اِذْ لَيْسَ فِي الْعَالَمِ شَيْءٌ اِلَّا وَفِي الْاَنْفُسِ لَهٗ نَظِيْرٌ"۔ علامہ قرطبی (متوفی ۶۷۱ھ) تفسیر الجامع لاحکام القرآن (جزو: ۲، ص: ۲۰۲) میں زیرِ آیتِ کریمہ "اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"، رقمطراز ہیں: "وَقَالَ بَعْضُ الْحُكَمَآءِ اِنَّ كُلَّ شَيْءٍ فِي الْعَالَمِ الْكَبِيْرِ لَهٗ نَظِيْرٌ فِي الْعَالَمِ الصَّغِيْرِ"۔

معیارِ خلافت خلیفۃ اللہ کی یہ جامعیت ہی نہیں بلکہ اللہ کا نائب ہونے کی حیثیت سے ضروری ہے کہ صفاتِ الٰہیہ کا ظہور بھی اس خلیفہ میں پایا جائے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں وارد ہے: "خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ" (صحیح بخاری، ج: ۲، ص: ۹۱۹)۔ اسی مضمون کی ایک اور صحیح حدیث علامہ ابن حجر نے فتح الباری (ج: ۵، ص: ۱۳۹) میں نقل فرمائی: "اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَةِ الرَّحْمٰنِ"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو رحمٰن کی صورت پر پیدا فرمایا"۔ یہاں صورت سے مراد صفت ہے اور وہ بھی بلا تشبیہ۔ اللہ کا نائب ہو کر حقائقِ ممکنات میں اُس کا تصرف کرنا اس امر کا مقتضی تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفت پر پیدا کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ صفاتِ الٰہیہ حُسنِ اُلوہیت ہے۔ خلیفۃ اللہ میں اس کا ظہور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُنس و محبت پیدا ہونے کا موجب ہے۔ یہ ظہور جب درجۂ کمال کو پہنچتا ہے تو اُنس اور محبت کامل ہوتی ہے جس کا انجام وہ قربِ الٰہی ہے کہ حدیثِ قدسی کے مطابق بندے کا سُننا، دیکھنا، چلنا، پھرنا اور بولنا اللہ ہی کی طرف منسوب ہوتا ہے اور ایسی صورت میں خلافتِ الٰہیہ کی حقیقت روشن ہو کر سامنے آجاتی

ہے۔ خلافت کا یہ معیار محض تسبیح و تقدیس سے نہیں بلکہ اُنس اور محبت الٰہیہ سے بھی متعلق ہے جو کسی جن یا فرشتے میں نہیں، صرف اِنسان میں ہے۔

؎ دردِ دل کے واسطے پیدا کیا اِنسان کو ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

یہی وہ حقیقت تھی جس تک فرشتوں کے علم کی رسائی نہ ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ"۔ معیارِ خلافت وہ جامعیت ہے جو خلیفہ کے جسم کی اِس ترکیب میں مضمر ہے جسے تم منصبِ خلافت کے منافی سمجھ رہے ہو۔ میں نے اپنے خلیفہ کی ذات میں موجوداتِ ارضی اور سماوی کی ان سب حقیقتوں کے امثال و نظائر کو جمع کر دیا ہے جن پر میرے نائب کی حیثیت سے وہ متصرف ہوگا۔ جب تک وہ سب حقائق اُس کی ذات میں موجود نہ ہوں، نہ وہ اُن کے اَحوال کو جان سکتا ہے نہ اُن کے آثار و خواص سے اُسے واقفیت ہو سکتی ہے، نہ ہی اُن کے ساتھ اُس کا کوئی رابطہ قائم ہو سکتا ہے۔ اِسی لئے اسے ان تمام اشیاء کے نام بتا دیئے گئے جن پر وہ متصرف ہوگا، یہ تصرف ہماری نیابت میں ہمارے احکام کو نافذ کرنے کے لئے ہے۔ جب وہ تمام حقائقِ لطیفہ اُس کی ذات میں موجود ہوں گے اور ان سب کا اور اُن کے احوال و آثار اور خاصیات کا اُسے علم ہوگا تو وہ اُن سب پر قابو پا کر میرے احکام اُن پر آسانی سے نافذ کر سکے گا اور اُس کا یہ تصرف اور نفاذِ احکام خارجی موجودات پر تصرف اور نفاذِ احکام کے لئے قوی رابطہ ہوگا اور اِس طرح وہ منصبِ خلافت کو انجام دے سکے گا۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ تفسیر فتح العزیز (ج: ۱ ص ۱۵۵) میں فرماتے ہیں کہ اشیاءِ ارضیہ کے اَسباب چونکہ آسمانوں سے مربوط ہیں اِس لئے مسبّب میں تصرف کیلئے اسباب میں تصرّف کرنا ضروری ہے۔ جس طرح خلیفہ کے جسم کو موجوداتِ ارضیہ کا جامع بنایا اِسی طرح اُس کی رُوح کو موجوداتِ سماویہ کے حقائقِ لطیفہ کی جامعیت عطا فرمائی تاکہ آسمانی مخلوق بھی اس کے زیرِ تصرف ہو اور وہ زمین سے لے کر آسمان تک اللہ کے نائب کی حیثیت سے متصرف ہو کر ہر چیز کا نفع حاصل کرے اور اس طرح اُس کی خلافت ہر چیز پر قائم ہو جائے۔

یہاں یہ اَمر بھی واضح ہو گیا کہ موجودات و ممکنات کا "علم" اور اُن پر تصرّف کی قدرت و اختیار

خلافتِ الٰہیہ کا بُنیادی نقطہ اور کمالِ انسانیت اور عبدیت کا مقتضیٰ ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا
ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ
بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾

اور اللہ نے آدم کو سب (چیزوں کے) نام سکھا دیئے پھر ان سب (چیزوں) کو فرشتوں پر پیش کر کے فرمایا تم مجھے ان (چیزوں) کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ ۳۵ھ

۳۵ھ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا: اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جو کچھ سکھایا، اس میں متعدد اقوال ہیں۔ ابنِ عباس، ابنِ جبیر، مجاہد اور قتادہ کا قول ہے: "اَسْمَاءَ جَمِيْعِ الْمَخْلُوْقَاتِ" تمام مخلوقات کے نام سکھائے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف یہ قول بھی منسوب ہے کہ اِسْمَ مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ یعنی جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ قیامت تک ہوگا، سب کے نام آدم علیہ السلام کو سکھا دیئے۔" یہ دونوں قول ایک دوسرے کے قریب ہیں بعض نے جمیع لغات مراد لیے، بعض نے کہا کہ ستاروں کے نام سکھائے یا فرشتوں کے نام یا ذریتِ آدم اور فرشتوں کے نام یا تمام اجناس مخلوقہ کے نام۔ اھ

دالبحر المحیط، ج: ۱، ص: ۱۴۵) یہ اقوال بھی پہلے اور دوسرے قول کے منافی نہیں۔ یہ سب چیزیں بھی جمیع مخلوقات اور مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ میں شامل ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ صاحبِ بحر محیط نے ان اقوال کے بعد لکھا: وَعَلَّمَهٗ اَحْوَالَهَا وَمَا يَتَعَلَّقُ بِهَا مِنَ الْمَنَافِعِ الدِّيْنِيَّةِ وَالدُّنْيَوِيَّةِ۔ کہ جن اشیاء اور اجناسِ مخلوقہ کے نام اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سکھائے، اُن کے کل احوال اور اُن سے متعلقہ تمام دینی، دُنیوی منافع کا علم انہیں عطا فرما دیا۔ انتہیٰ۔

علامہ سید محمود آلوسی حنفی بغدادی (متوفی ۱۲۷۰ھ) نے اِن تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد حکیم ترمذی کا ایک قول نقل کیا کہ اس آیت میں اَسماء سے مُراد اسماء الٰہیہ ہیں۔ حکیم ترمذی کے قول کی تائید میں علامہ آلوسی فرماتے ہیں: "میرے نزدیک حق وہی ہے جس پر اھلُ اللہ ہیں اور وہی منصبِ خلافتِ الٰہیہ کا مقتضٰی ہے اور وُہ یہ ہے کہ اَسماء علویہ ہوں یا سفلیہ، جوہریہ ہوں یا عرضیہ، اھلُ اللہ کے نزدیک سب کو اسماء الٰہیہ کہا جاتا ہے۔ اِس اعتبار سے کہ وُہ سب اَسماءُ اللہ تعالیٰ کی ذات پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ تمام اسماء اور اُن کے مسمیات میں اسکی ظہُور ہے بغیر اس کے کہ وُہ ان میں مقیّد ہو۔[1]

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السّلام کو تمام مسمیات کے کُل اسماء سکھادیئے۔ اگر کہا جائے کہ اَسمائے مسمیات کی تعلیم کے کیا معنی ہیں؟ تو میں کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اجناسِ مخلوقہ آدم علیہ السّلام کو دکھادیں اور انہیں سکھادیا کہ مثلاً اس کا نام گھوڑا ہے اور اس کا نام اُونٹ اور اس چیز کا یہ نام ہے، اِس چیز کا یہ نام۔ اُن سب کے تمام احوال اور وُہ سب دینی اور دنیوی فوائد و منافع اُنہیں سکھادیئے جو اُن سے متعلق ہیں، انتہٰی۔[2] آیت کے مَعنٰی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السّلام کو مختلف اجزاء اور جُداگانہ قوٰی سے اِس شان سے پیدا فرمایا کہ ان میں ایسی استعداد پیدا کردی جس کے ذریعے وہ مَعقُولات و مَحسُوسات اور مُتخیّلات و مَوہُومات، تمام مدرکات کی سب انواع کا پُورا ادراک کرسکیں اور اُنہیں ایسی مَعرفت کا الہام فرمادیا جس سے وُہ تمام اشیاء کی ذاتوں اور اُن کی خاصیتوں اور اُن کے تمام ناموں اور سب علوم کے اُصُول اور ہر قسم کی صناعات کے قوانین اور اُن کے آلات کی کیفیت کو پہچان سکیں۔[3] اللہ تعالیٰ نے تمام اَشیاء کی صفات، اُن کے تمام احوال اور سب خاصیتیں آدم علیہ السّلام کو تعلیم فرمادیں۔[4] اِسی مضمون کو علامہ ابُوسعود نے نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ اسی آیتِ کریمہ کے تحت اپنی تفسیر میں ارقام فرمایا۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر ابُوسعُود بہامش الکبیر للرازی، ج: ۱، ص ۴۶۲) علاوہ ازیں یہی مضمون علامہ نیشاپُوری کی تفسیر غرائب القرآن (ج: ۱، ص: ۲۱۴)، تفسیر ابن کثیر (ج: ۱، ص: ۷۳) تفسیر امام بغوی

(ج:۱، ص: ۴۰) میں بھی نہایت وضاحت کے ساتھ مرقوم ہے اور بخاری شریف کتاب التفسیر (ج:۲، ص: ۶۴۲) میں بھی "اَسْمَاءَ كُلِّ شَيْءٍ" کی تعلیم کا قول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث شفاعت کے ضمن میں مروی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے لے کر متاخرین مصنفین اور علمائے مفسرین تک سب کی عبارات کا خلاصہ یہی ہے کہ مخلوقاتِ ارضیہ ہوں یا سماویہ اللہ تعالیٰ نے سب اشیاء اور اُن کے آثار و خواص، جمیع احوال اور اُن سے متعلقہ تمام دینی و دُنیوی منافع کا علم آدم علیہ السلام کو عطا فرمایا۔ یہ انہی حقائقِ عالمِ امکان کا علم ہے جن کا آدم علیہ السلام کی ذات میں پایا جانا اور آدم علیہ السلام کا اُن سب حقیقتوں کا جامع ہونا روشن دلائل کے ساتھ ہم اس سے پہلے ثابت کر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جن حقائق کا آدم علیہ السلام کو جامع بنایا اُن حقائق پر تصرف کے لئے اُنہیں قوتِ علم و عمل بھی عطا فرمائی۔ یہی قوت اصل خلافتِ الٰہیہ ہے۔ فرشتوں کو اَسماءِ اشیاء کی تعلیم نہیں فرمائی گئی، اس لئے کہ وہ حقائقِ اشیاء کے جامع نہ تھے اور خلافتِ الٰہیہ کی استعداد اُن میں نہ تھی۔ یُوں کہئے کہ خلافت "قوتِ تصرُّف" ہے اور خلیفہ متصرف۔ آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کی بنیادی حکمت تھی کہ وہ بحیثیتِ خلیفۃ اللہ عالمِ کبیر کی ہر شے کو حقیقتِ انسانیہ کا مطیع بنا کر سب کے منافع کو اُس کی طرف متوجہ کر دیں اور اللہ تعالیٰ کی محبت و اُنس کا مظہر ہونے کی حیثیت سے انسانی فطرت میں اُنس و محبتِ الٰہیہ کے اُس جوہر کو اُجاگر کر دیں جو مدارِ انسانیت ہے اور اس طرح حکمتِ الٰہیہ اس نکتے پر پُوری ہو جائے کہ ساری کائنات انسان کے لئے ہے اور انسان صرف اللہ تعالیٰ کی محبت و اطاعت کے لئے۔ اگر خلافت کا مقصد صرف یہ ہوتا کہ خلیفہ جلت و حرمت کے احکام مکلفین تک پہنچا دے، تو فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے لئے سجدے کا حکم دینا بالکل بے معنی قرار پائے گا۔ حق یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے سامنے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم اسی لئے دیا گیا کہ وہ انسان کو خلیفۃ اللہ مان کر اُس کی طاعت قبول کر لیں۔ اس وقت کی سب سے اعلیٰ و افضل مخلوق ملائکہ کرام کا حضرت آدم علیہ السلام کے لئے سجدہ ریز ہونا اس اَمر کی روشن دلیل قرار پا گیا کہ عالمِ کبیر

میں اَب کسی شئی کو آدم علیہ السلام کی طاعت اور فرمانبرداری سے اِنکار اور سرکشی کی گنجائش نہیں۔ اگر کسی نے اِنکار کیا تو وُہ خلافتِ الٰہیہ کا باغی اور طوقِ لعنت کا سزاوار ہوگا۔ بیشک آدم علیہ السلام سے خلیفۃ اللہ ہونے کے باوجُود صُورۃً ایک لغزش سرزد ہُوئی لیکن اس کا سبب اِنکار یا تکبُّر نہ تھا بلکہ اس کا باعث صِرف نسیان تھا اِس لئے نہ وُہ مَعصیت ہے نہ تکبُّر، اور اُس کے سرزد ہونے میں حکمت یہ تھی کہ تکبُّر و تواضع کا فرق ظاہر ہو جائے اور بنی نوعِ انسان کے وُہ افراد جن سے زمین میں بہ تقاضائے بشریت کوئی نافرمانی سرزد ہو تو آدم خلیفۃ اللہ کی ذات میں اُن کے لئے یہ نمُونہ مَوجُود ہو کہ وُہ اللہ کی بارگاہ میں عاجز و متواضع ہو کر اپنی نافرمانی کا اعتراف کر کے مُعافی مانگ لیں تاکہ وُہ خلافتِ الٰہیہ کے باغی قرار نہ پائیں اور جو لوگ از راہِ تکبر و سرکشی فرمانِ خُداوندی بجا لانے سے اِنکار کریں، وہ شیطان کے ساتھی قرار پائیں۔ گویا آدم علیہ السلام، عاجزی اور تواضع کرنیوالوں اور اللہ سے مُعافی چاہنے والوں اور خلافتِ الٰہیہ کے وفاداروں کے لئے نمُونہ ہیں اور شیطان تکبّر کرنے والے سرکشوں اور باغیوں کے لئے ایک مثال ہے۔ جو جس کی راہ اختیار کرے گا، اُسی کے انجام کو پہنچے گا۔ خلافتِ الٰہیہ کے نظام کے لئے یہ ایک بُنیادی حکمت تھی۔

اِنسان جسم و رُوح، دو چیزوں کا مجمُوعہ ہے۔ رُوح عالمِ قدس کی ایک لطیف مخلُوق ہے جو عالمِ بالا کے حقائق و کمالات اور اُس کے جُملہ منافع کی جامع ہے اور جسم کی تخلیق مادّۂ ارضیہ سے ہُوئی جو تمام مادّی اثرات و خصُوصیات اور مخلُوقاتِ ارضیہ کے کمالات و منافع کا حامل ہے۔ خلافتِ الٰہیہ کی استعداد نسلِ اِنسانی کے ہر فرد کو جسم و رُوح کے ضمن میں عطا کی گئی مگر شیطان نے اِنسان کو اس نعمت سے محرُوم کرنے کی جو کوشش کی اُس کے نتیجہ میں افرادِ انسانی پانچ گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔

پہلا گروہ: وُہ ہے جو پُوری طرح شیطان کی گرفت میں آ کر خلافتِ الٰہیہ سے بغاوت کر بیٹھا، اُس نے خلافتِ الٰہیہ کی استعداد بالکل ضائع کر دی، اللہ تعالیٰ کی توحید اور اُس کی مَعرفت سے اُس کا کوئی تعلق ہی نہ رہا، سعادتِ دارین اور ابدی نجات کی راہوں سے دُور جا پڑا، کوئی رُوحانی کمال حاصل کرنے کی اُس میں طاقت نہ رہی حتیٰ کہ مادّی فوائد جاننے اور اُنہیں

حاصل کرنے سے بھی وُہ محروم رہا۔ یہ وُہ لوگ ہیں جنہیں عقل و خرد سے عاری جُہلائے مُشرکین و کفار و منافقین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دُوسرا گروہ : وُہ ہے جس میں جسمانی اِستعداد تو باقی رہی مگر اغوائے شیطانی سے متاثر ہو کر اُس نے رُوحانی استعداد کو ضائع کر دیا، اس لئے رُوحانی تقاضوں کو بروئے کار لانے سے وُہ محروم ہو گیا۔ معرفتِ الٰہیہ تو درکنار اللہ تعالیٰ کی ہستی سے بھی مُنکر ہو گیا۔ اُس نے صرف جسم اور مادّہ کو اپنا مُطمحِ نظر بنا لیا اور اپنی بقیہ استعداد کا رُخ مادّیات ہی کی طرف موڑ دیا، وُہ عقلی موشگافیوں میں گُم ہو کر رہ گئے، بعض نے جدید الکشافات اور مادّی ایجادات میں یدِ طُولیٰ حاصِل کیا، بیشمار مُفید چیزیں ایجاد کیں، فضا پیمائی اور خلا نوردی میں کمال حاصل کیا، سیاروں کے ذریعے زمین و آسمان کے تلاطم بِلا دیئے، حیرت انگیز آلات ایجاد کئے، اَب اُن کی ترقی کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ اُنہوں نے بنی نوعِ اِنسان کی ہلاکت کے لئے ہزاروں میل تک مار کرنے والے میزائل تیار کر لئے، ایٹم بم، نیپام بم بنائے، آواز سے زیادہ تیز رفتار ہوائی جہاز تیار کئے جن کے ذریعے چند سیکنڈ میں رُوئے زمین کو ہلاکت خیز منظر میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور ایٹم بموں کے ذریعے کرۂ زمین کو چشم زدن میں اُڑا کر نیست و نابُود کر دینا آسان ہے۔ خلافتِ الٰہیہ کی وُہ استعداد جو بنی نوعِ انسان کی جسمانی، رُوحانی، دُنیوی، اُخروی فوائد کے لئے تھی، مہلکاتِ انسانی کے لئے اُسے وقف کر دیا گیا اور نوبت "بایں جا رسید" کہ ان چیزوں کے ایجاد کرنے والے خُود اپنے آپ کو بھی اِن مہلکات کی زد میں محسُوس کر رہے ہیں۔ اُنہیں ہر وقت یہ خطرہ لاحق ہے کہ ہمارے ہی ایجاد کئے ہُوئے آلات نہ معلوم کس وقت ہم پر پھٹ پڑیں اور کرۂ ارضی کے ساتھ ہم بھی لقمۂ اجل بن کر نہ رہ جائیں۔ ولنعم ما قیل ؎ "اے روشنیِ طبع تو بر من بلا شدی"۔

تیسرا گروہ : وہ ہے جن میں استعداد تو موجود تھی مگر شیطان کے ورغلانے کا اتنا اثر اُن پر ضرور ہُوا کہ وُہ غفلت اور سُستی کا شکار ہو گئے کہ اپنی استعداد کو پُوری طرح بروئے کار نہ لائے یہ وُہ عامۃ المسلمین ہیں جنہوں نے قدرے قلیل جسمانی اور رُوحانی منافع حاصل کئے مگر اپنی صلاحیتوں

کو پُوری طرح کام میں نہ لانے کی وجہ سے رُوحانیات یا مادّیات پر کامل تصرّف حاصل نہ کر سکے بیشک وُہ منصبِ خلافت پر فائز نہیں ہوئے مگر اُنہوں نے خلافتِ الٰہیہ سے بغاوت بھی نہیں کی۔

چوتھا گروہ : اللہ کے اُن خاص بندوں کا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی عطا فرمائی ہُوئی جسمانی، رُوحانی، علمی، عملی پُوری استعداد موجُود تھی، اغوائے شیطان کا کوئی اثر ان کی استعداد کو ضرر نہ پہنچا سکا۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مخاطب فرما کر پہلے ہی فرما دیا تھا: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ (بنی اسرائیل، آیت ۶۵) "بیشک میرے خاص بندوں پر تجھے کوئی غلبہ حاصل نہ ہوگا"۔ یہ مقدّس گروہ انبیاء کرام علیہم الصّلوٰۃ والسّلام اور اُن کے مُتّبعین کاملین پر مشتمل ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی عطا فرمائی ہُوئی اِستعداد کو پُوری طرح کام میں لا کر خلافتِ الٰہیہ کے منصب کو پایا۔ حکمت و مصلحت کے مُطابق رُوحانیات و مادّیات پر متصرّف ہُوئے اور خلافتِ الٰہیہ کے تقاضوں کو اُنہوں نے صحیح معنوں میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

پانچواں گروہ : وُہ ہے جس نے اپنے خیال میں صرف رُوح اور اُس کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھا اور جسمانیات و مادّیات کو نظر انداز کر دیا۔ یہ وُہ تارک الدُّنیا لوگ ہیں جو ریاضت و مُجاہدہ میں مشغُول رہے۔ ان میں موحّد بھی ہُوئے، جو اغوائے شیطان سے محفُوظ رہے اور غیر موحّد بھی، جنہیں شیطان نے ابدی نجات کی راہوں سے دُور کر دیا۔ ریاضت و مُجاہدہ سے کسی نے فائدہ اُٹھایا ہو یا نہ اُٹھایا ہو لیکن دُنیاوی اور مادّی منافع سے یہ سب لوگ بلا امتیاز محرُوم رہے۔

انبیاء علیہم السّلام اور اُن کے مُتّبعین کاملین اگرچہ جسمانیات و رُوحانیات سب پر پُوری طرح متصرّف تھے مگر اُنہوں نے مادّی حیثیت سے بالعموم مادّی تصرّفات کا اظہار اِس لئے نہیں فرمایا کہ اُن کے پیشِ نظر ابدی سعادت تھی، مادّی تصرّفات کی طرف اگر وُہ متوجّہ ہو جاتے تو اُن کے مُتّبعین کے لئے یہ خطرہ پیدا ہو جاتا کہ وُہ جسمانی اور مادّی منافع میں مستغرق ہو کر سعادتِ ابدی اور نجاتِ اُخروی سے محرُوم ہو جائیں، اِس لئے اُنہوں نے مادّی منافع کو ثانوی حیثیت میں رکھا

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں تمام جسمانی و روحانی اور مادی علوم ہونے کے باوجود روحانیات ہی کو اولیت کی حیثیت دی گئی ہے تاکہ تخلیقِ انسانی کی حکمت اور خلافتِ الٰہیہ کی مصلحت فوت نہ ہونے پائے۔ رہا یہ امر کہ خلیفہ کے متصرف ہونے کے باوجود اکثر امورِ مستحسنہ اور مقاصدِ حسنہ میں تصرف کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ تصرف کے آثار کا ظاہر ہونا اللہ تعالیٰ کی حکمتوں سے وابستہ اور اُس کی مشیت و ارادہ کے ماتحت ہے، دیکھئے خلیفہ کے تصرف کے آثار کا ظہور تو درکنار، اللہ تعالیٰ کی قدرت جو ہر شک و شبہ سے پاک ہے بادی النظر میں بسا اوقات امورِ مستحسنہ میں اس کے ظہور کے آثار بھی نہیں پائے جاتے۔ مثلاً کفر اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے مگر اس کے باوجود وہ پایا جاتا ہے، شیطان اور اس کی سرکشی سب اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں مگر ان کا سلسلہ اب تک جاری ہے لیکن اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ اُس کے دفع کرنے پر قادر نہیں کیونکہ اُس کی قدرت کا ظہور اُس کی حکمتوں سے وابستہ اور اس کی مشیت و ارادے کے مطابق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نائب ہونے کی حیثیت سے اُس کے خلیفہ کے تصرفات اور اُن کا اظہار بھی یہی حکم رکھتا ہے کہ اس کے تصرف کا کوئی ظہور اللہ تعالیٰ کی حکمت، اُس کی مشیت اور ارادے کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خلیفہ متصرف نہیں۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے خاص متبعین نے مادی تصرفات میں بھی اکثر و بیشتر روحانی تصرف ہی کا طریقہ اختیار فرمایا، اِس لئے کہ اُن ادوار میں لوگ مادہ پرستی کا شکار تھے روحانیات کی طرف قطعاً کسی کی توجہ نہ تھی اس لئے ضروری تھا کہ روحانیات سے مانوس کرنے کے لئے اُن کے سامنے زیادہ سے زیادہ روحانی تصرفات لائے جائیں۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معجزات اور اولیائے کرام کی کرامات سب اسی حکمت پر مبنی ہیں۔ عصائے کلیم، یدِ بیضاء، عیسیٰ علیہ السلام کا احیائے موتیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزۂ شق القمر سب اسی قبیل سے ہیں۔

علاوہ ازیں مادی تصرفات ہر دور میں اس دور کے حسبِ حال ہی ہو سکتے ہیں۔ اُمم سابقہ کی تاریخ میں موجودہ مادی ترقی کی مثالیں اس لئے نہیں پائی جاتیں کہ اُس وقت انسانی ذہن کے لئے مادی ارتقا کے اسباب مہیا نہ تھے۔ جوں جوں وہ اسباب مہیا ہوتے گئے اسے سہارا

ملتا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ انسان ان کمالات کو بالقوۃ اپنے اندر لئے ہوئے تھا اور آسمانی تعلیمات میں بھی یہ علوم موجود تھے، بالخصوص قرآن مجید تو ان تمام مادّی انکشافات اور نئی ایجادات کے علوم سے لبریز ہے، بکثرت آیاتِ قرآنیہ اس کی دلیل ہیں۔ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "تفسیر اتقان" میں انواعِ علوم بیان کرتے ہوئے "تریسٹھویں نوع" میں قرآن مجید کی اُن تمام آیات کو جمع کر دیا ہے جن میں مادّی انکشافات اور علوم جدیدہ کا اجمالی بیان وارد ہے۔ علمائے اسلام نے ہر دور میں اس کے تقاضوں کے مطابق اُن کا انکشاف کیا اور تا حدِ امکان اُنہیں عملی جامہ پہنانے میں کوشش کی لیکن ظاہر ہے کہ انسانی ذہن کے مادّی ارتقاء اور خارجی ماحول کی حدود سے آگے بڑھنا کسی کے لئے ممکن نہ تھا تاہم جیسے جیسے حالات بدلتے گئے، انکشافات اور اُنہیں عملی جامہ پہنانے کی راہیں ہموار ہوتی گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ (انفال: آیت) "دشمنوں کے مقابلہ کے لئے اپنی طاقت کے مطابق تم تیاری کرو" ظاہر ہے کہ دشمن کی جیسی طاقت ہوگی اُس کے مقابلے کے لئے ہمیں ویسی ہی قوت و طاقت تیار کرنا پڑے گی۔ اس کے بغیر دشمن کا مقابلہ ہم نہ کر سکیں گے۔ پہلے زمانہ میں تیر و تلوار اور اسی قسم کا سامان جنگ دشمن کے پاس ہوتا تھا، اُس کے لئے ویسی ہی تیاری کرنا ضروری تھی اسی لئے تیر اندازی سیکھنے، گھوڑے دوڑانے اور تلواروں زرہوں وغیرہ مروجہ سامانِ حرب مہیا کرنے کا تاکیدی حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے صحابہ کرام کو ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں ان چیزوں سے دشمن کا مقابلہ نہیں ہو سکتا، اب حکم قرآنی کے مطابق وہی اسلحہ اور سامانِ حرب مسلمانوں کے لئے مہیا کرنا فرض ہے جو دشمن ہمارے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔ اس مختلف صورتِ حال کا سبب صرف یہی ہے کہ خارجی حالات بدل گئے اور انسانی ذہن اُن سے متاثر ہوا لیکن قرآنی تعلیمات اِن بدلے ہوئے حالات میں بھی مسلمانوں کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ اب اگر کوئی قرآن کی سچائی پر ایمان رکھنے کے باوجود اُن پر عمل پیرا نہ ہو تو مسلمان خطاکار اور گنہگار ضرور ہے مگر کافر و باغی نہیں۔ اُمتِ مسلمہ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کمی کو پورا کرے ورنہ اِس دنیا میں اس کے نتائج سے بچنا دشوار ہے جس کی ذمہ داری اسلام

اور قرآن پر نہیں بلکہ اُمتِ مسلمہ خود اس کی ذمہ دار ہے۔

یہ شبہ پیدا نہ کیا جائے کہ قرآن کریم کی جن آیات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں تمام علوم موجود ہیں، اُن میں سے کوئی آیت بھی کسی علم کی وضاحت نہیں کرتی محض اجمالی ذکر پایا جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر اجمال کی تفصیل آیاتِ قرآنیہ میں مخفی ہے جیسا کہ اُن سب علوم کی استعداد ہر انسان میں پوشیدہ ہے۔ بشرطیکہ اُس نے اپنی استعداد کو ضائع نہ کر دیا ہو، مگر اُس کا بروئے کار آنا عمل پر موقوف ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے "چقماق" کہ اُس میں آگ موجود ہوتی ہے مگر اس کا بروئے کار آنا "رگڑ" کے عمل پر موقوف ہے۔ عمل ایسی چیز ہے کہ آیاتِ قرآنیہ ہوں یا حقیقتِ انسانیہ، عمل کے بعد اُن کے مخفی علوم کا ظاہر ہونا یقینی ہے بجز اُس علم غیب کے، جس کا حصول تعلیمِ حق کے بغیر ممکن نہیں۔ جن لوگوں نے نہ آیات میں تدبر سے کام لیا، نہ اپنی استعداد کو وہ بروئے کار لائے، اگر وہ علم کی روشنی اور عمل کے فوائد سے محروم رہے تو نہ حقیقتِ انسانیہ کی کمال استعداد پر حرف آتا ہے اور نہ آیاتِ قرآنیہ کا اُن مخفی علوم سے خالی ہونا لازم آتا ہے۔ قرآن مجید میں تدبر و تفکر کی جو تاکید وارد ہے اُس کا مقصد یہ نہیں جو بعض لوگوں نے سمجھا بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ حقائقِ کائنات میں غور و فکر کرتے رہو اور اس کے نتیجے میں ہر انکشافِ حقیقت کو دلیلِ معرفتِ الٰہیہ سمجھو اور ہر چیز کے فوائد و منافع کو اللہ تعالیٰ کی امانت جانو اور اُس کے نائب ہونے کی حیثیت سے اُس کے حکم کے مطابق اُن میں تصرف کرو تاکہ تمہارا ایمان و عمل مستحکم ہو جائے اور خلافتِ الٰہیہ کا تقاضا پورا ہو سکے۔

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ، پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے خواصِ مختلفہ اور قوائے متضادہ کے پائے جانے کو منصبِ خلافت کے منافی سمجھتے تھے، اس لئے کہ یہ اختلاف و تضاد موجبِ فتنہ و فساد ہے جس سے قطع نظر کے باوجود بھی ان کے نزدیک خلیفہ کا جامع حقائقِ کائنات اور اُن کے خواص و اسماء کا عالم ہونا حکمت کے مطابق نہ تھا۔ وہ محض تسبیح و تقدیس الٰہی کو معیارِ خلافت سمجھتے تھے اور اسی بنا پر اُن کا یہ خیال

تھا کہ وہ خود مستحقِ خلافت ہیں۔ اُن کا یہ خیال اُن کے قصورِ علم پر مبنی تھا۔ "اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ" فرما کر پہلے ہی اُنہیں تنبیہ فرما دی گئی تھی اس کے بعد اُن تمام اشیاء کا بتانا کہ جن کے نام آدم علیہ السلام کو سکھا دیئے تھے۔ فرشتوں پر پیش فرما کر اللہ تعالیٰ نے بطورِ اتمامِ حجت ارشاد فرمایا، اِن چیزوں کے نام بتاؤ اگر تمہارا اپنے آپ کو مستحقِ خلافت سمجھنا درست ہے۔

اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ : قرآن مجید میں اس مقام پر فرشتوں کا ایسا کوئی کلام مذکور نہیں جس میں صدق یا کذب کا احتمال پایا جائے۔ "اَتَجۡعَلُ" میں استفہام ہے۔ جو انشاء ہونے کی وجہ سے صدق یا کذب کا احتمال نہیں رکھتا اور "نَحۡنُ نُسَبِّحُ" مطابق للواقع ہے جس میں کذب متصور نہیں اس لیے "اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ" کے معنیٰ یہ نہیں ہو سکتے کہ اگر تم اِن چیزوں کے نام نہ بتا سکے تو جھوٹے قرار پاؤ گے بلکہ اس کے معنیٰ صرف یہ ہیں کہ محض تسبیح و تقدیس کی بنا پر مستحقِ خلافت ہونے کا تمہارا خیال صحیح نہ ہو گا۔ ظاہر ہے کہ صدق و کذب خیال کی صفت نہیں بلکہ کلام کی صفت ہے۔ لہٰذا یہی کہا جائے گا کہ محض ظاہرِ حال کی مناسبت کی وجہ سے "اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ" فرمایا گیا

قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ

اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۳۲﴾

اُنہوں نے کہا تُو پاک ہے ہمیں کچھ علم نہیں مگر جو تُو نے ہمیں سکھایا۔ بیشک تُو ہی بہت جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔ ۳۶

۳۶ قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَا : فرشتے عاجز ہو گئے اور اُنہوں نے سمجھ لیا کہ واقعی محض تسبیح و تقدیس کی بنا پر ہم منصبِ خلافت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جو علم اُن کی جامعیت کے ساتھ عطا فرمایا، حکمت کا مقتضیٰ اور خلافت کا معیار وہی ہے۔ فرشتوں نے اپنے قصورِ علم اور اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا اعتراف کر لیا۔

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ

فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ

اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ

تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

فرمایا اے آدم بتادو اُنہیں سب چیزوں کے نام تو جب آدم نے اُنہیں سب کے نام بتادیئے فرمایا کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ بیشک میں جانتا ہوں سب چھپی چیزیں آسمانوں اور زمینوں کی اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے تھے۔ ۳۴

---

۳۷ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ : فرشتوں کے اظہارِ عجز کے بعد آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ آپ اِن چیزوں کے نام فرشتوں کو بتادیجئے، آدم علیہ السلام نے سب کچھ انہیں بتادیا، اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا، کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمینوں کے سب غیب جانتا ہوں اور تمہارا ظاہر و باطن سب کچھ میرے علم میں ہے۔ اس ارشادِ ربانی کے ضمن میں عظمتِ ربوبیت کے اظہار کے ساتھ آدم علیہ السلام کے استحقاقِ خلافت پر اتمامِ حجت اور اس کا اِعلان بھی ہو گیا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا

لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ

وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

اور جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے اُس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافر ہو گیا۔ ۳۴ھ

۳۸ھ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ : یہ صحیح ہے کہ تخلیقِ آدم سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دے دیا تھا کہ جب میں آدم کے جسم میں رُوح پھونک دُوں تو تم اسے سجدہ کرتے ہوئے گر جانا لیکن بعض لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں کہ سُورۂ "حجر" اور سُورۂ "صٓ" کی آیت: "فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ" سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفخِ رُوح کے فوراً بعد فرشتے آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے جس کا ذکر تفسیر کبیر (ص ۴۲۰ - ج ۱) میں امام فخرالدین رازی نے بھی کیا ہے کہ "فَاءِ تَعْقِيْب" کا مفاد یہ ہے کہ آدم کے زندہ ہوتے ہی بلا تاخیر اُسی وقت فرشتوں نے اُنہیں سجدہ کیا اور تعلیم اسماء کا واقعہ سجدہ کے بعد پیش آیا، جیسا کہ صاحب رُوح المعانی نے بھی یہ کہہ کر اس خیال کو رد کر دیا کہ "فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ" میں "فا" سببیہ ہے۔ عاطفہ نہیں جسے تعقیب پر محمول کر کے کہا جائے کہ نفخِ رُوح کے بعد بغیر کسی مہلت کے تعلیم اسماء سے پہلے آدم کو فرشتوں نے سجدہ کیا۔ عقل و نقل دونوں کی روشنی میں یہی بات صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرانے سے پہلے کُل اسماء کا علم عطا فرمایا پھر اُنہیں فرشتوں پر پیش فرما کر حکم دیا کہ ان چیزوں کے نام بتاؤ، جب فرشتے نہ بتا سکے تو آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ آپ ان چیزوں کے نام فرشتوں کو بتائیں، پھر آدم علیہ السلام کے بتلانے کے بعد فرشتوں نے اپنے عجز کا اعتراف کر لیا اور یہ بات اُن پر بخوبی واضح ہو گئی کہ ہمارا اپنے آپ کو مستحقِ خلافت سمجھنا صحیح نہ تھا، اس کے مستحق آدم ہی ہیں۔ جب آدم علیہ السلام کا مستحقِ خلافت ہونا پوری طرح بے غبار ہو گیا تو اُس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم فرمایا کہ تم آدم کو سجدہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو یہ حکم دیا اور سب فرشتے

آدم علیہ السلام کے آگے سربسجود ہو گئے۔

بعض لوگوں کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ صرف زمین کے فرشتوں کو سجدے کا حکم تھا اور خاص انہیں فرشتوں نے سجدہ کیا۔ حق یہ ہے کہ سجدے کا حکم کل فرشتوں کو دیا گیا اور بلا تخصیص کل فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا: "فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ" (حجر، آیت: ۳۰) لفظ "كُلُّهُمْ" سے تخصیص کی نفی ہو گئی اور لفظ "اَجْمَعُوْنَ" نے اس نفی کی مزید تاکید کر دی۔ بعض علماء نے کہا کہ لفظ "اَجْمَعُوْنَ" کا فائدہ یہ ہے کہ کل فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو مختلف اوقات میں الگ الگ نہیں بلکہ سب نے بیک وقت اجتماعی طور پر سجدہ کیا (ملخصاً: مدارک)۔ اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ فرشتے نور سے پیدا کئے گئے اور از روئے قرآن مجید جنات کی پیدائش "نار" سے ہے۔ "نور" اور "نار" ایک ہی جوہر لطیف ہیں۔ ذات میں دونوں متحد ہیں، صفات میں فرق ہے جیسا کہ زمین کا کوئی حصہ سرسبز و شاداب نظر آتا ہے اور کوئی حصہ بالکل شور۔ ریت اور مٹی بھی زمین ہے اور سخت ترین پتھر بھی زمین ہی کی جنس سے ہے مگر تغایر اوصاف کی وجہ سے کوئی مٹی ہے اور کوئی پتھر۔ اسی طرح جنات اور فرشتوں کا تخلیقی مادہ اجزائے ذاتیہ کے اعتبار سے ایک ہے۔ لیکن ان کی صفات مختلف ہیں مثلاً فرشتوں میں ولادت اور نسل کا وصف نہیں پایا جاتا اور جنات میں یہ صفت پائی جاتی ہے۔ فرشتوں کے جوہر لطیف میں حرارت نہیں اور جنات مجسمہ حرارت ہیں۔ فرشتے معصوم ہیں اور جنات معصوم نہیں۔ ثعلبی سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا کہ اِنَّ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنْ حَيٍّ مِّنْ اَحْيَاءِ الْمَلٰٓئِكَةِ يُقَالُ لَهُمُ الْجِنُّ (قرطبی، ص: ۲۹۵-ج: ۱) "ابلیس فرشتوں کی اس جماعت سے تھا جسے جن کہا جاتا ہے"۔ اس قول سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ ملائکہ میں ایسے گروہ بھی ہیں جنہیں جن کہا گیا۔ ایسی صورت میں ان ملائکہ اور جنوں میں صفاتی فرق پایا جائے گا اور ذاتی اختلاف نہیں ہوگا اور یوں کہا جائے گا کہ ان اوصاف کے اختلاف کی وجہ سے جوہر ذاتی

میں متحد ہونے کے باوجود جن اور فرشتے الگ الگ مخلوق شمار کئے گئے۔

تخلیقِ آدم سے پہلے (عالمین کے علاوہ) فرشتے اور جن ہی قوتِ علم و عمل سے متصف تھے، فرشتے اپنی صفات کے اعتبار سے ارفع و اعلیٰ تھے اِس لئے وہ جنات کے سردار قرار پائے، جنات اُن کے ماتحت ہوئے۔ ظاہر ہے کہ سردار کو جو حکم دیا جائے ماتحت اُس میں شامل ہوتا ہے جس طرح عالمِ ارواح میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو آخر النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کے دین کی نصرت کا جو حکم دیا گیا۔ اُن کی اُمتیں بھی اس میں شامل تھیں۔ اِسی طرح فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے لئے سجدہ کرنے کا جو حکم ہُوا۔ ماتحت ہونے کی وجہ سے جنات بھی اُس میں شامل تھے۔ سردار کے ساتھ اُس کے ماتحت کا ذکر ضروری نہیں ہوتا اِس لئے انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ اُن کی اُمتوں اور فرشتوں کے ساتھ جنات کا ذکر نہیں فرمایا گیا۔ جنات میں بھی اوصاف کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اِنسانوں کے اوصاف آپس میں ایک دُوسرے سے مختلف ہیں۔ بعض جنات نیک، صالح ہیں اور بعض سرکش و گنہگار۔ انسانوں کی طرح اُن میں بھی کوئی مومن ہے کوئی کافر۔ اطاعت شعار جنات نے ملائکہ کے ساتھ شامل ہو کر حضرت آدم کو سجدہ کیا اور بغاوت کرنے والے سرکش جنات ابلیس کے ساتھ ہو گئے۔ ابلیس سرکش باغی جنوں کا سرغنہ تھا۔ فرشتوں کے ساتھی جنات فرشتوں کے حکم میں شامل رہے اور ابلیس کے ساتھی جنات ابلیس قرار پائے۔ "ابلیس" سے مُراد شیطان ہے۔ اِس کا نام ابلیس اِس لئے ہُوا کہ نافرمانی کے بعد وُہ اللہ کی رحمت سے نا اُمید ہو گیا اور اس کی صُورت بھی بدل دی گئی۔ سریانی زبان میں اس کا نام "عزازیل" تھا اور عربی میں "حارث" لفظ "شیطان" کا مادّہ اگر "شطن" مانا جائے تو اس کے معنیٰ ہوں گے "حق سے دُور ہونے والا" اور اگر وُہ "شیط" سے ماخوذ ہو تو شیطان کے معنیٰ ہوں گے "ہلاک ہونے والا اور جل جانے والا"

اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ : شیطان نے ازراہِ تکبّر اللہ کا حکم ماننے سے اِنکار کیا اور تکبّر اور غرور کی وجہ سے اُس نے حضرت آدم کو سجدہ نہ کیا۔ یہ واقعہ سُورۃ "صٓ" میں بھی مذکور ہے۔

اور اِس میں یہ بھی وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان سے فرمایا: "اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ" (ص: آیت ۷۵) مفسرین نے یہاں "اَلْعَالِيْنَ" کی دو توجیہیں کی ہیں۔ ایک یہ کہ "عَالِيْنَ" سے متکبرین مُراد ہیں۔ اِس توجیہ پر ترجمہ اس طرح ہوگا: "اے شیطان کیا (اَب) تُو نے تکبر کیا یا پہلے ہی تُو متکبرین میں سے تھا؟" دُوسری توجیہ یہ کی کہ "عالین" درجاتِ عالیہ رکھنے والوں کی ایک جماعت ہے۔ اِس مقام پر تفسیر بیضاوی اور رُوح المعانی کی عبارات میں غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر "عالین" سے متکبرین مُراد نہ ہوں اور بلند درجات رکھنے والی جماعت کے افراد اِس سے مُراد لیے جائیں تو وُہ جنّات اور ملائکہ مخاطبین میں سے نہ ہوں گے بلکہ وُہ ایسی ارواحِ قُدسیہ کے افراد ہوں گے جو اپنے عُلوِّ مراتبِ رسالت کے باعث اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں اس طرح مُستغرق ہونے کی وجہ سے کہ اُنہیں ماسوی اللہ کا شعُور تک نہ تھا، سجدے کے خطاب میں داخل نہ تھے، نہ اُنہیں آدم کو سجدہ کرنے کا حُکم دیا گیا تھا۔ دُوسری توجیہ کے مطابق شیطان نے ازراہِ تکبر اپنے آپ کو عالین میں شمار کیا اور آدم کو سجدہ کرنے سے اِنکار کر دیا۔ کیونکہ یہ اللہ کے صریح حُکم کا اِنکار تھا۔ اِس لیے اِس انکار کی وجہ سے شیطان کافر ہو گیا، یا یہ کہ وہ پہلے ہی علمِ الٰہی میں کافر تھا، اَمرِ الٰہی کا مُنکر ہو کر اُس نے اپنے کُفر کو ظاہر کر دیا۔ **کیفیتِ سجدہ:** ایک قول کے بموجب سجدہ سے مُراد محض اطاعت ہے۔ بعض کا قول ہے کہ فرشتے آدم علیہ السلام کے سامنے جُھک گئے (تا حدِ رکوع) اُن کا جُھکنا ہی سجدہ تھا لیکن جمہُور کا مذہب یہ ہے کہ سجدہ سے مُراد سجدۂ معروفہ ہے، یعنی فرشتے آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے گر گئے۔ نصِ قُرآنی "فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ" کی رُوشنی میں یہی حق معلُوم ہوتا ہے (ص: آیت ۷۲) بعض لوگوں نے کہا کہ "لِاٰدَمَ" کے معنیٰ ہیں "آدم کی طرف"۔ لیکن یہ قول اصل کے خلاف اور بلا دلیل ہے، لہٰذا قابلِ قبُول نہیں۔ جمہُور کے مطابق "اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ" کے معنیٰ یہی ہیں کہ آدم کو سجدہ کرو، مگر یہ سجدہ آدم کی عبادت کے لیے نہ تھا بلکہ صرف ان کی تعظیم کے لیے تھا۔ عبادت کا سجدہ صرف اللہ کے لیے خاص ہے، اللہ کے سوا کسی کے لیے عبادت کی نیّت سے سجدہ کرنا شرکِ خالص ہے۔ صرف

تعظیم کی نیت سے مخلوق کو سجدہ کرنا ہرگز شرک نہیں، ورنہ وُہ پہلی شریعتوں میں کسی وقت بھی کسی کے لئے جائز نہ ہوتا اور فرشتوں کو بھی اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کے لئے سجدۂ تعظیمی بجالانے کا حکم صادر نہ فرماتا۔ ہماری شریعت میں سجدۂ تعظیمی بھی کسی مخلوق کے لئے جائز نہیں۔ غیر اللہ کو سجدۂ تعظیمی کی ممانعت میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بکثرت احادیث وارد ہُوئیں جو تواترِ معنوی کی حد تک پہنچتی ہیں، اس لئے پہلی شریعتوں کا سہارا لے کر اَب سجدۂ تعظیمی کو جائز قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں۔

ایک معاصر مترجم نے اِس آیت کا ترجمہ اِس طرح کیا: "پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جُھک جاؤ تو سب جُھک گئے مگر ابلیس نے اِنکار کیا"۔ مترجم مذکور نے اِس پر بطورِ تفہیم لکھا:

> "اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور اُس سے تعلق رکھنے والے طبقۂ کائنات میں جس قدر فرشتے مامُور ہیں، اُن سب کو انسان کے لئے مطیع و مسخّر ہو جانے کا حکم دیا گیا۔ چُونکہ اس علاقے میں اللہ کے حُکم سے انسان خلیفہ بنایا جا رہا تھا اس لئے فرمان جاری ہُوا کہ صحیح یا غلط جس کام میں بھی اِنسان اپنے ان اِختیارات کو جو ہم اسے عطا کر رہے ہیں اِستعمال کرنا چاہے اور ہم اپنی مشیّت کے تحت اسے ایسا کر لینے کا موقع دے دیں تو تمہارا فرض ہے کہ تم میں سے جس جس کے دائرۂ عمل سے وُہ کام متعلق ہو وُہ اپنے دائرہ کی حد تک اُس کا ساتھ دے۔ وُہ چوری کرنا چاہے یا نماز پڑھنے کا اِرادہ کرے، نیکی کرنا چاہے یا بدی کے ارتکاب کے لئے جائے، دونوں صُورتوں میں جب تک ہم اُسے اُس کی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اِذن دے رہے ہیں تمہیں اُس کے لئے سازگاری کرنی ہو گی۔ مثال کے طور پر اس کو یُوں سمجھئے کہ ایک فرمانروا جب کسی شخص کو اپنے ملک کے کسی صُوبے یا ضلع کا حاکم مقرر کرتا ہے تو اُس علاقے میں حکُومت

کے جس قدر کارندے ہوتے ہیں اُن سب کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت
کریں اور جب تک فرمانروا کا منشا یہ ہے کہ اُسے اپنے اختیارات کے استعمال
کا موقع دے، اُس وقت تک اُس کا ساتھ دیتے رہیں۔ قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح
کام میں اُن اختیارات کو استعمال کر رہا ہے یا غلط کام میں۔ البتہ جب جس کام
کے بارے میں بھی فرمانروا کا اشارہ ہو جائے کہ اُسے نہ کرنے دیا جائے تو وہیں
اُن حاکم صاحب کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور اُنہیں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے
کہ سارے علاقے کے اہلکاروں نے گویا ہڑتال کر دی ہے حتیٰ کہ جس وقت فرمانروا
کی طرف سے اُن حاکم صاحب کی معزولی اور گرفتاری کا حکم ہوتا ہے تو وہی تابعدار
خدام جو کل تک اُن کے اشاروں پر حرکت کر رہے تھے، اُن کے ہاتھوں میں
ہتھکڑیاں ڈال کر اُنہیں کشاں کشاں دارالفاسقین کی طرف لے جاتے ہیں"

مترجم مذکور نے ترجمہ اور تشریح میں عامۂ مترجمین و مفسرین کے خلاف اپنا الگ راستہ
اختیار کیا۔ مترجمین نے "اُسْجُدُوْا" کا ترجمہ "سجدہ کنید"، "سجدہ کرو" اور "سجدے میں گر جاؤ"
کیا۔ اور مُفسرین کے نزدیک سجدہ کے معنی صرف جھکنا، جسے عربی میں "انحناء" کہتے ہیں، قوی نہیں
بلکہ ضعیف ہیں نصِ قرآنی "فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ"، جمہور کے اس قول کی قوی دلیل ہے،
پھر مُترجم مذکور کے کلام میں زمین سے تعلق رکھنے والے (گویا اِلحاقی اور طبقاتی) فرشتوں کی تقسیم
اور تخصیص بھی مفسرین کے خلاف ہے۔ جمہور کا قول یہی ہے کہ بلا تخصیص سب فرشتوں کو حضرت آدم
کے لئے سجدہ کا حکم ہوا۔ بغیر کسی استثناء کے سب فرشتے آدم کے لئے سجدہ میں گر پڑے۔ ظاہر
نصِ قرآنی "فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ" مفسرین کے قول کی روشن دلیل
ہے۔ اِس طویل اقتباس کی رُو سے مترجم کے نزدیک ہر انسان خلیفۃ اللہ ہے، خواہ مؤمن ہو
یا کافر، ظالم ہو یا مظلوم اور وہ ہر ایک کے لئے فرشتوں کو مطیع و مُسخر مانتا ہے۔ ایسی صورت میں
سوچنا پڑے گا کہ اگر ظالم و مظلوم، مؤمن و کافر آپس میں آمادۂ قتال ہو جائیں تو فرشتے کس کا

ساتھ دیں گے؟ یا وُہ بھی آپس میں قتال کریں گے؟ فکر صحیح یہی جواب دے گی کہ ہر مؤمن و کافر اور ظالم و مظلوم کا خلیفہ ہونا درست نہیں۔ اس کے بعد یہ امر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مترجم مذکور نے دُنیاوی فرمانرواؤں اور اُن کے مقرر کردہ حاکموں کو اللہ تعالیٰ اور اُس کے مقرر کردہ خلفاء کی مثال قرار دیا۔ حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی اور اللہ تعالیٰ کے خلفاء کے حق میں سخت بے ادبی ہے اور یہ کتنی بڑی جسارت ہے کہ خلفاء اللہ کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اُن کی معصیت و نافرمانی کی بنا پر اُن کے مطیع فرمان فرشتے اُنہیں گرفتار کر کے دار الفاسقین تک پہنچاتے ہیں۔

مترجم مذکور کی غلط فہمی کا منشا غالباً وُہ آیات ہیں جن میں بنی نوعِ انسان کے لئے زمین اور آسمان کی ہر چیز کو مُسخّر کر دینے کا ذکر ہے۔ جیسے "وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ" (جاثیہ، آیت: ۱۳) اور بعض وُہ آیات بھی جن میں لوگوں کو مخاطب فرما کر خلافتِ ارضی کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ مثلاً "وَاذْكُرُوٓا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ" (اعراف، آیت ۶۹) مترجم مذکور نے لفظ "خلفاء" سے خلیفۃ اللہ سمجھ لیا اور تسخیرِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ سے خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے فرشتوں کا اُس کے لئے مُطیع و مُسخّر ہونا مُراد لے لیا۔ حالانکہ ان آیات میں خلافتِ الٰہیہ مُراد نہیں بلکہ پہلی قوموں کے بعد مخاطبین کا زمین میں آباد کرنا مُراد ہے اِسی طرح زمین و آسمان کی ہر چیز کا مُسخّر کرنا خلیفۃ اللہ ہونے کی بُنیاد پر نہیں بلکہ نعمتِ عامّہ کا بیان ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لانے کی طرف بنی نوعِ انسان کو متوجّہ فرمایا گیا ہے۔ سابقاً بالتفصیل معلوم ہو چکا ہے کہ خلیفۃ اللہ آدم علیہ السلام ہیں اور پھر وُہ لوگ جو طاعتِ الٰہیہ اور عدل و انصاف میں آدم علیہ السلام کے قائم مقام ہوں۔ ہر ظالم اور نافرمان کو خلیفۃ اللہ سمجھنا ہرگز صحیح نہیں تفسیر ابن کثیر (ج ۱، ص: ۷۰) میں ہے: ذٰلِكَ الْخَلِيفَةُ هُوَ آدَمُ وَمَنْ قَامَ مَقَامَهُ فِي طَاعَةِ اللّٰهِ۔ الخ۔ یعنی "خلیفۃ اللہ آدم علیہ السلام ہیں اور جو اُن کے قائم مقام ہیں

اطاعتِ الٰہیہ میں"۔ یہی عبارت تفسیر ابن جریر (ج:۱، ص:۱۵۴) میں ہے۔ اسی طرح حضرت شاہ عبدالعزیز محدثِ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر فتح العزیز میں فرمایا: "پس ہر فرد را از افرادِ انسان خلافتِ الٰہی نرسید" یعنی انسان کے ہر ہر فرد کو خلافتِ الٰہی نہیں پہنچی۔ اس کے بعد آگے چل کر فرماتے ہیں: "اگر ہر ہر فردِ انساں را خلافتِ الٰہی ثابت کنیم راست نمی آید" یعنی اگر انسان کے ہر فرد کے لیے ہم خلافتِ الٰہیہ ثابت کریں تو یہ بات دُرست نہیں ہو سکتی۔ آخر میں خلافتِ الٰہیہ کے معنیٰ بیان کر کے ارقام فرماتے ہیں: "ایں معنیٰ در ہر ہر فرد ثابت نیست بالبداہۃ پس ہر ہر فرد خلیفۂ او تعالیٰ نمی تواند شد" (تفسیر عزیزی، سورۂ بقرہ، ص:۱۶۲)۔ یعنی خلافتِ الٰہیہ کے یہ معنیٰ انسان کے ہر فرد میں بداہتہً ثابت نہیں، لہٰذا انسان کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کا خلیفہ نہیں ہو سکتا۔

فوائدِ ضروریہ: ۱۔ بیشک عالمِ اجسام میں حضرت آدم علیہ السلام ہی پہلے انسان اور اللہ کے خلیفہ ہیں لیکن عالمِ حقائق میں خلیفۃ اللہ الاعظم اور اوّلِ خلائق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مقدسہ ہے۔ تخلیقِ آدم سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی منصبِ خلافت اور مسندِ نبوت پر متمکن ہوئے۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام نے خود ارشاد فرمایا: کُنْتُ نَبِیًّا وَّ اٰدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ ــــ (رواہ ابو نعیم وابن سعد والطبرانی۔ جامع صغیر، ج:۲، ص:)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں نبی تھا اور آدم علیہ السلام جسم و رُوح کے درمیان تھے"۔ چونکہ آدم علیہ السلام ابُوالبشر یعنی سب انسانوں کے جسمانی باپ ہیں اس لیے ضروری تھا کہ اُن کے جسدِ مبارک میں ہر جسمِ انسانی کے اجزائے اصلیہ موجود ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین نے لکھا کہ جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبرِ انور کی جگہ سے حضور کے اجزائے جسمیہ مبارکہ کی مٹی لے گئے اور یہ آبِ تسنیم سے گوندھی گئی اور اسے جنت کی نہروں میں غوطے دلوائے گئے۔ پھر اسے زمینوں اور آسمانوں میں پھرایا گیا۔ آپ کو فرشتوں نے آدم سے پہلے پہچان لیا پھر جسدِ آدم کی مٹی کے ساتھ اسے ملا دیا گیا۔ پھر آدم میں رُوح پھونکی گئی اور نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آدم کی پیشانی میں چمکایا گیا (تفسیر ثعالبی ملخصاً بحوالہ خلاصۃ التفاسیر

ج:۱، ص:۲۵)۔ پیشانی آدم میں نورِ محمدی کا چمکنا اُن کے سجودِ ملائکہ ہونے کا سبب ہوا۔ جیسا کہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں فرمایا: اِنَّ الْمَلٰئِکَةَ اُمِرُوْا بِالسُّجُوْدِ لِاٰدَمَ لِاَجْلِ اَنَّ نُوْرَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ کَانَ فِیْ جَبْهَةِ اٰدَمَ۔ (کبیر ج:۲، ص:۴۵۵)

یعنی "فرشتوں کو آدم کے لئے سجدے کا حکم اِسی لئے ہوا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نورِ مبارک اُن کی پیشانی میں تھا"۔ اِس عبارت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خلیفۂ اعظم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہیں، آدم علیہ السلام کی خلافت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت کا ظہور ہے۔ جیسا کہ علامہ سید محمود آلوسی بغدادی نے فرمایا: فَهُوَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ عَلَی الْحَقِیْقَةِ الْخَلِیْفَةُ الْاَعْظَمُ فِی الْخَلِیْقَةِ وَالْاِمَامُ الْمُقَدَّمُ فِی الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی وَلَوْلَاهُ مَا خُلِقَ اٰدَمُ وَلَا وَلَا الخ (روح المعانی، پ۱، ص۲۰۰-۲۰۱) یعنی: درحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی اللہ کی مخلوق میں اللہ تعالیٰ کے خلیفۂ اعظم ہیں اور زمینوں اور بلند آسمانوں میں سب سے مقدم امام حضور ہی ہیں اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ ہوتے تو نہ آدم پیدا ہوتے نہ اُن کے علاوہ کوئی چیز"۔ مخفی نہ رہے کہ محض آدمی ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہر مؤمن و کافر کو کائناتِ ارضی میں تصرف کا جو اختیار دیا ہے اور اسی طرح زمین اور آسمان کی چیزوں کو اُس کے لئے مُسخر اور مطیع بنایا ہے اس کا تعلق خلافتِ الٰہیہ سے نہیں بلکہ وُہ اللہ کی نعمتِ عامّہ ہے جو ہر مکلف آدمی مؤمن اور کافر کو اس لئے عطا کی گئی کہ وُہ سب اِس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں، اگر کسی نے شکر ادا نہ کیا تو مُجرم قرار پاکر وُہ عذابِ الٰہی کا سزاوار ہوگا لیکن خلافتِ الٰہیہ کا منصب مومنین کاملین مثلاً انبیائے کرام وصدیقین وصالحین کے سوا کوئی نہیں پا سکتا اِس لئے اُن کے خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے حقائقِ کائنات کی جو تسخیر اُن کے لئے عمل میں آئی اُس کی نوعیت بالکل جُداگانہ ہے۔ ہر مُطیع اور مُسخر پر تصرف کی اُنہیں پُوری قُدرت عطا فرمائی گئی تاکہ وُہ سب کے منافع پُوری طرح حاصل کر سکیں۔

رہا یہ امر کہ بسا اوقات وُہ اپنے اِختیارات کو استعمال نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وُہ بے اِختیار ہیں بلکہ کمالِ عبدیت پر پہنچ کر وُہ اپنے علم و قُدرت اور اپنے ارادے و اختیار کو اللہ تعالیٰ کے علم و قُدرت اور اُس کی مشیت اور اِختیار کے تابع کر دیتے ہیں اور حکمت و مشیتِ الٰہیہ کے خلاف اپنی قُدرت و اختیار کو استعمال نہیں کرتے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقاتِ ارضی و سماوی کو اُن کے لیے مُسخر اور مُطیع بنا دیا تو وُہ بھی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا مطیع اور تابعِ فرمان بنا دیتے ہیں اور اُس کی رضا کے بغیر کوئی تصرف نہیں کرتے جیسا کہ بخاری اور مُسلم کی متفق علیہ حدیث میں وارد ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اہلِ طائف کے طرزِ عمل سے مغموم ہو کر میں واپس آ رہا تھا کہ راستہ میں ملک الجبال نے آواز دے کر مجھے سلام پیش کیا اور کہا، اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آپ سے حکم لینے کے لئے حاضر ہُوا ہُوں۔ آپ جو چاہیں مجھے اَمر فرما دیں۔ اگر آپ کا حکم ہو تو میں آپ کے دشمنوں پر دونوں پہاڑ رکھ دُوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں ایسا نہیں چاہتا، مجھے اُمید ہے کہ ان مُشرکوں سے اللہ تعالیٰ ایسے لوگ پیدا فرما دے گا جو اللہ ہی کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے (بُخاری، ج: ۱، ص: ۴۵۸)۔ (مُسلم، ج: ۲، ص: ۱۰۹) نیز امام احمد بن حنبل اور امام ترمذی نے حضرت ابُو اُمامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا، میرے رب نے یہ بات مجھ پر پیش فرمائی کہ وُہ میرے لئے بطحاءِ مکہ کو سونا بنا دے، میں نے عرض کیا نہیں اے میرے رب! میں تو اسی بات کو پسند کرتا ہُوں کہ کسی دن شکم سیر ہُوں اور کسی دِن بھُوکا رہوں (مشکوٰۃ، ص؟؟؟، ترمذی، ج: ۲، ص ۵۸) اور شرح السنۃ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وُہ فرماتی ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اے عائشہ! اگر میں چاہوں تو سونے کے پہاڑ میرے ساتھ چلیں۔ (بحوالہ مشکوٰۃ ص: ۵۲۱) اِن احادیث سے روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے خلیفۂ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان یہی تھی کہ حکمتِ الٰہیہ

کے پیشِ نظر اپنے اختیارات کو استعمال نہیں فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ہر خلیفہ خلیفۃ اللہ الاعظم ہی کے نقشِ قدم پر چلتا ہے اور حکمتِ الٰہیہ کے خلاف وُہ کوئی کام نہیں کرتا مگر یہ کہ بلا قصد بظاہر ان سے لغزش سرزد ہو جائے تو وُہ بھی اللہ تعالیٰ کی کسی حکمتِ عظیمہ ہی سے متعلق ہو گی جیسا کہ خُود حضرت آدم علیہ السلام سے بھُول کر بلا قصد نہیِ الٰہی کی خلاف ورزی سرزد ہُوئی، لیکن یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آگئی کہ اسی لغزش کے باعث وُہ زمین میں آئے اور "اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً" (بقرہ: آیت ۳۰)۔ کی حکمتِ جلیلہ پُوری ہُوئی۔ جن لوگوں نے خُونریزی اور فساد کو خلیفہ کی صفت قرار دیا وہ غلطی پر ہیں۔ فساد اور خُونریزی کرنے والے انسانی افراد ہرگز اللہ کے خلیفہ نہیں، جیسا کہ ہم سابقاً بیان کر چکے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ غضب اور شہوت کی دو قوتیں فساد اور خُونریزی کا سبب ہیں لیکن خلیفۃ اللہ کی قوتِ شہوت اللہ کے عشق و محبت سے بدل جاتی ہے اور اُس کی قوتِ غضب نفسِ امّارہ اور کفار و مُشرکین کے خلاف جہاد کی قوت میں تبدیل ہو جاتی ہے اِس لئے خلیفۃ اللہ کے حق میں یہ دونوں قوتیں مَعصیت کی بجائے طاعت کا مُوجب قرار پاتی ہیں جیسا کہ تفسیر عزیزی میں حضرت شاہ عبدالعزیز مُحدّثِ دہلوی نے بھی اس کی وضاحت فرمائی ہے (تفسیر عزیزی، ج: ۱، ص: ۱۵۸)۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے صرف جسمِ خاکی کے لئے سجدے کا حُکم نہیں دیا تھا بلکہ فرمایا تھا کہ جب میں آدم کے جسم کو دُرست کر دوں اور اُس میں رُوح پھُونک دوں تو اس کے لئے تُم سجدہ کرتے ہُوئے گر جانا۔ فرشتوں نے جسم و رُوح دونوں کو پیشِ نظر رکھا اور سجدے میں گر گئے مگر شیطان نے صرف جسمِ خاکی اور وصفِ بشریت کو دیکھا، رُوح کو نظر انداز کر دیا اور آدم کو سجدہ نہ کیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اُس سے فرمایا کہ تُو نے سجدہ کیوں نہیں کیا تو اُس نے جواب دیا اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ "مَیں آدم سے بہتر ہُوں"۔ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ۔ (ص، آیت ۷۶) "تُو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے بنایا"۔ حالانکہ محض مٹی کا نام آدم نہ تھا۔ جسم مٹی کا ضرور تھا مگر رُوح تو مٹی سے مخلُوق نہیں ہُوئی تھی، جسم کا لائقِ تعظیم

ہونا محض رُوح کی وجہ سے تھا اگر وُہ اُسے ملحوظ رکھتا تو یہ جواب ہرگز نہ دیتا۔ معلوم ہوا کہ رُوحانیت کو نظر انداز کر کے محض جسمانیت اور وصفِ بشریت کو سامنے رکھ لینا اور اللہ تعالیٰ کے خاص مقربین کی تعظیم و تکریم کا انکار کر دینا گمراہی ہے۔ شیطان کا مٹی پر آگ کو مطلقاً فضیلت دینا صحیح نہیں بیشک اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بے کار نہیں بنائی، آگ میں بھی بیشمار فوائد رکھے ہیں لیکن اس کے باوجود مٹی آگ سے افضل ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اُس کی کثافت بھی آگ کی لطافت کے مقابلے میں مُوجبِ فضیلت ہے، مٹی اپنی کثافت کی وجہ سے ان تجلیات کو اپنے اندر روک سکتی ہے جو اُس پر وارد ہوتی ہیں۔ بخلاف آگ کے، کہ وُہ کسی تجلی کو اپنے اندر نہیں روک سکتی۔ مٹی سے پیدا ہونے والی مخلوقاتِ ارضیہ کی فراوانی اور اُن کے بیشمار فوائد کسی سے مخفی نہیں۔ مٹی آلۂ طہارت بھی ہے اور جائے سجود بھی۔ عاجزی اور تواضع اس کی امتیازی شان ہے۔ سرسبزی و شادابی اُس کی تواضع کا نتیجہ ہے۔ اگر اُس کے سینے پر ہل چلا کر اُس میں کاشت کی جائے اور کاشت کار اُس میں گندگی بھی ڈال دے تو اُس کے بدلے میں وُہ پھُول اور پھل ہی اُگائے گی۔ اشرف المخلوقات کی تخلیق اُسی سے ہُوئی، یہ بھی اُس کے لئے شرف ہے بلکہ خلیفۃ اللہ کا مٹی سے پیدا ہونا اُس کی شرافت کی چمکتی ہُوئی دلیل ہے۔ زندگی میں عادتاً انسان کا مستقر مٹی ہے اور مرنے کے بعد بھی اُس کا ٹھکانا یہی مٹی ہے اِسی مٹی سے قیامت کے دن اُٹھایا جائے گا اور اپنے رب کی بارگاہ میں وہ پیش ہوگا۔ اِس کے علاوہ بیشمار فضائل ہیں جو ادنیٰ تامل کے بعد سمجھ میں آسکتے ہیں، لہٰذا شیطان کا آگ کو مُطلقاً مٹی سے بہتر قرار دینا کسی طرح دُرست نہیں بلکہ سراسر تکبر و غرور پر مبنی ہے۔ اس مقام پر منکرینِ قیاس کہتے ہیں کہ ابلیس نے آدم کو سجدہ نہ کرنے کے لئے قیاس سے کام لیا تھا لہٰذا قیاس جائز نہیں۔ یہ لوگ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بھی کہتے ہیں کہ اُنہوں نے بعض اشعار میں فرمایا کہ سب سے پہلا قیاس کرنے والا شیطان تھا۔ حیرت ہے یہ لوگ اِتنی بات بھی نہیں سمجھتے کہ شیطان کا قیاس اللہ کے صریح حکم کے مقابلہ میں تھا۔ یقیناً ایسا قیاس اللہ تعالیٰ کے ساتھ کُھلی بغاوت ہونے کی وجہ سے قطعاً مردُود ہے۔ مولانا روم

رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اگر اُن اشعار کی نسبت صحیح ہو تو اُن کا مفہوم بھی یہی ہے۔ جہاں نصِ صریح موجود ہو وہاں نص کے خلاف قیاس سے کام لینا یقیناً اتباعِ شیطان ہے۔ ایسا قیاس جو نصوصِ شرعیہ کے مقابلہ میں ہو، آج بھی مَردُود اور قیامت تک مَردُود ہی رہے گا۔ "اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْہُ" خوب سمجھ لیجئے اللہ تعالیٰ کی محکم وحی کے خلاف قیاس سے کام لینا کُفر صریح ہے۔ قیاس اُن مسائل کے لئے ہوتا ہے جہاں وحیِ صریح نازل نہ ہُوئی ہو۔ ایسے قیاس کے ناجائز ہونے پر شیطانی قیاس سے دلیل لانا خُود ناجائز و مَردُود ہے۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ
وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا
هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

اور ہم نے فرمایا اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور اس سے بافراغت کھاؤ جہاں چاہو اور اس درخت کے قریب نہ جانا کہ حد سے بڑھنے والوں میں سے ہو جاؤ گے ۳۹

۳۹ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ : بامرِ الٰہی تخلیقِ آدم کے لئے فرشتے زمین سے مٹی کے اجزاء آسمان پر لے گئے۔ آدم علیہ السلام کے مخلوق ہونے کے بعد حضرت آدم کی بائیں پسلی سے حضرت حوا پیدا ہُوئیں۔ حوا کی پیدائش بعض مفسرین کے نزدیک جنت میں آنے کے بعد ہے۔ لیکن ظاہر آیت "يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ" سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ جنت میں جانے سے پہلے اُن کی پیدائش ہُوئی۔ پہلے حضرت آدم اور حوا کا نکاح ہُوا اس کے بعد فرشتے اُنہیں جنت میں لے گئے۔ حضرت حوا کو لفظ "زَوْجُكَ" سے تعبیر فرمانا بھی اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سکونت فی الجنۃ سے پہلے حضرت آدم کے ساتھ اُن کی تزویج ہو چکی تھی۔ مفسرین کا قول ہے کہ حضرت آدم کا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی آل پاک پر دس مرتبہ درُود پڑھنا حضرت حوا

کا مہر قرار پایا اور فرشتے نکاح کے گواہ بنے۔

اَلْجَنَّۃَ: بعض لوگوں نے کہا کہ یہ جنت زمین میں تھی لیکن جمہور مفسرین کا قول ہے کہ وہ آسمانی جنت ہے۔ جیسا کہ تفسیر بحر محیط میں ہے: "قَالَتِ الْجُمْهُوْرُ هِيَ فِي السَّمَاءِ" (تفسیر بحر محیط، ج:۱، ص:۱۵۷) تفسیر مدارک میں ہے: "هِيَ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ" (تفسیر مدارک، ج:۱، ص:۴۲) تفسیر خازن میں ہے: "اَلْقَوْلُ الصَّحِيْحُ اَنَّهَا الْجَنَّةُ الَّتِيْ هِيَ دَارُ الْجَزَاءِ وَالثَّوَابِ" (تفسیر خازن، ج:۱، ص:۴۲) معتزلہ بھی اس جنت کے سماوی ہونے کے منکر ہیں (مدارک، ج:۱، ص:۴۲، قرطبی، ج:۱، ص:۳۰۲، روح المعانی، ج:۱، ص:۲۱۴ وغیرہ)

وَلَا تَقْرَبَا: آدم وحوا کو خطاب ہے کہ اس درخت کے قریب نہ جانا۔ لفظ "هٰذِهٖ" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ درخت دونوں کے سامنے موجود تھا جسے وہ دیکھ رہے تھے رہا یہ امر کہ وہ کونسا درخت تھا؟ تو قرآن مجید میں اس کی تشریح نہیں آئی، نہ کسی صحیح حدیث میں اس کی صراحت پائی گئی۔ ہاں کتابوں میں مختلف اقوال مذکور ہیں۔ مثلاً۔ گندم، انگور، کھجور، کافور، انجیر، اور بعض کتب تفاسیر میں قائلین کے نام بھی مذکور ہیں۔ جیسے عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، قتادہ۔ مگر وحی الٰہی میں جب اس کی کوئی وضاحت نہیں پائی گئی تو ہمارے لئے اس بحث میں پڑنا فضول ہے۔ ابن جریر (ج:۱۱، ص:۱۶۹) ابن کثیر (ج:۱، ص:۷۹) و دیگر مفسرین نے بھی یہی فرمایا۔ بعض ملحدین نے کہا کہ یہاں درخت سے جنسی اور نفسانی خواہش مراد ہے لیکن "هٰذِهٖ" کا لفظ کلام عرب میں اس چیز کے لئے بنایا گیا ہے جو کسی کے سامنے موجود ہو اور وہ اسے دیکھتا ہو۔ سب جانتے ہیں کہ جنسی اور نفسانی خواہش ایسی چیز نہیں جو کسی کے سامنے موجود ہو اور وہ اسے دیکھتا ہو۔ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ کسی لفظ کو دلیل کے بغیر اس کے اصل معنیٰ سے پھیرنا درست نہیں۔ لہٰذا۔ "هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" سے جنسی اور نفسانی خواہش مراد لینا قطعاً باطل بلکہ تفسیر بالرائے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق ایسی تفسیر کرنے والے کا ٹھکانا جہنم ہے۔

فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ: آدم وحوا دونوں اس درخت کے قریب گئے اور اللہ تعالیٰ کی ممانعت کے باوجود انہوں نے اس سے کھالیا۔ ایسی صورت میں آیت کریمہ کا

بظاہر مفاد یہی ہوگا کہ (معاذ اللہ) آدم و حوا دونوں ظالم ہو گئے مگر یاد رہے کہ آدم علیہ السلام اللہ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کے پہلے خلیفہ اور اُس کے نبی ہُوئے۔ اللہ کا خلیفہ اور اللہ کا نبی کبھی ظالم نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی بندہ حضرت آدم کو ظالم کہے گا تو وُہ خُود ظالم و کافر قرار پائے گا۔ ظُلم کے معنیٰ ہیں: "وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَوْضِعِہٖ" یعنی کسی چیز کو اُس کی اصل جگہ کی بجائے کسی دُوسری جگہ رکھ دینا (قرطبی ج: ۱، ص: ۳۰۹) قُرآن کریم میں شرک کے لیے بھی لفظ ظلم" وارد ہے۔ حق تلفی اور حاکم کے فرمانِ حق کی نافرمانی کو بھی ظُلم کہتے ہیں بلکہ ہر معصیت و گناہ ظُلم ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کو جس کام کا حکم دے اُس کی خلاف ورزی یقیناً گناہ ہے لیکن اُس کا قانُون یہ ہے کہ وہ بندے کو اُسی کام کا حُکم دیتا ہے جو بندے کے اختیار میں ہو۔ دیکھئے قُرآن کریم نے فرمایا۔ "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا۔" یعنی "اللہ تعالیٰ کسی کی طاقت و اختیار سے باہر اسے کوئی حُکم نہیں دیتا۔" (پ۳، سُورۃ البقرہ، آیۃ: ۲۸۶) ظاہر ہے کہ بھُول کر کسی کام کا کرنا یا نہ کرنا بندے کے اختیار میں نہیں۔ ایسی صُورت میں "وَلَا تَقْرَبَا ہٰذِہِ الشَّجَرَۃَ" کی نہی کے معنیٰ یہ نہیں ہو سکتے کہ تُم بھُول کر بھی اِس درخت کے قریب نہ جانا۔ بلکہ اُس کے معنیٰ یہی ہیں کہ اے آدم و حوا، قصداً (جان بُوجھ کر) اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تُم دونوں ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ اَب اس بات کا فیصلہ کہ آدم علیہ السلام قصداً اس درخت کے قریب گئے۔ یا بھُول کر بلا قصد؟ خُود قُرآن مجید ہی سے سُن لیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَقَدْ عَہِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا۔ "اور بیشک ہم نے اِس سے پہلے آدم سے درخت کے قریب نہ جانے کا عہد لیا تو وُہ بھُول گئے اور ہم نے اُن کا کوئی قصد نہ پایا۔" (سُورۂ طٰہٰ، آیت ۱۱۵، پ۱۶)۔ ثابت ہُوا کہ آدم علیہ السلام سے کسی قسم کا کوئی ظُلم سرزد نہیں ہُوا نہ اُنہوں نے کوئی شرک کیا نہ اُن سے کوئی حق تلفی ہُوئی نہ اُن سے کسی معصیت اور گناہ کا صدُور ہُوا۔ جیسے روزے دار کا روزے کی حالت میں بھُول کر کھانا پینا گُناہ نہیں اسی طرح آدم علیہ السلام کا اس درخت سے بھُول کر کھا لینا بھی گُناہ نہیں۔ یقیناً وُہ گناہوں سے پاک اور نبی

ہونے کی وجہ سے معصوم ہیں۔ شیطان اُن سے جس ظاہری لغزش کے صادر ہونے کا سبب بنا وہ حقیقتاً معصیت نہیں بلکہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حکمتیں متعلق ہیں۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کا "رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا" کہنا بھی اُن کے ظالم ہونے کی دلیل نہیں بلکہ اُن کے کمالِ عبدیت اور ربِ کریم کی بارگاہ میں انتہائی تواضع اور انکساری پر مبنی ہے جیسا کہ انشاءاللہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ اس مقام پر اگر یہ شبہ وارد کیا جائے کہ "سہو و خطا" پر اُمتیوں سے تو مواخذہ نہیں ہوتا مگر ایک قول کے مطابق انبیاء علیہم السلام سے مواخذہ ہوتا ہے۔ دیکھئے بحرِ محیط میں ہے:

وَقِيْلَ يَمْتَنِعَانِ عَلَيْهِمْ اِلَّا عَلٰى جِهَةِ السَّهْوِ وَالْخَطَاءِ وَهُمْ مَاخُوْذُوْنَ بِذٰلِكَ وَاِنْ كَانَ مَوْضُوْعًا عَنْ اُمَّتِهِمْ (البحر المحیط، ج: ۱، ص: ۱۶۲) یعنی "ایک قول یہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے کسی صغیرہ یا کبیرہ گناہ کا صادر ہونا ممکن نہیں بجز اس کے کہ سہو یا خطا کے طور پر ایسا کوئی کام اُن سے ہو جائے۔ ایسی صورت میں انبیاء علیہم السلام کا مواخذہ ہوتا ہے۔ اگرچہ اُن کی اُمتوں کا کوئی مواخذہ اس پر نہیں ہوتا۔" لیکن اس قول سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ مؤاخذہ عصمتِ انبیاء کے خلاف ہے یا اس کی وجہ سے ان کی عظمت و فضیلت میں کوئی نقص پیدا ہوتا ہے، ایسا نہیں بلکہ اس کے برعکس یہ مؤاخذہ ان کے کمالِ عظمت اور فضیلت کی دلیل ہے کیونکہ اس کا باعث بارگاہِ الوہیت میں انبیاء علیہم السلام کا کمالِ قرب اور اُن کی کمالِ محبوبیت ہے۔ ع۔ جن کے رُتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے۔ ○ سچ ہے "حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ" مخفی نہ رہے کہ سہو و خطا معصیت نہیں۔ ابھی ہم نے بحرِ محیط سے جو قول نقل کیا کہ "انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں کا سہو و خطا پر کوئی مؤاخذہ نہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کے حق میں یہ مؤاخذہ برقرار ہے"۔ اس کی بنیاد معصیت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ مواخذے کے خوف سے اُن کی گریہ و زاری، توبہ و استغفار رب تعالیٰ کے حضور اُن کی عاجزی و انکساری اُن کے اجر و ثواب میں زیادتی اور رفعِ درجات کا موجب ہے۔ نیز یہ کہ گناہ کئے بغیر اُن کی گریہ و زاری اور توبہ و استغفار اُن کی اُمت کے گنہگاروں کے لئے ایک نمونہ ہو جائے اور

وہ اُسے اختیار کر کے اپنے رب سے اپنے گناہوں کی مُعافی چاہیں کیونکہ نبی کی ذات صرف نیکوں اور پاکبازوں کے لئے نمونہ نہیں ہوتی بلکہ مجرموں اور گنہگاروں کے لئے بھی اُسوۂ حسنہ کا پہلو اپنے اندر رکھتی ہے۔ نیک کام خود انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے کئے اور نیکوں کے لئے وہ نمونہ قرار پائے لیکن معصوم ہونے کی وجہ سے ممکن نہ تھا کہ گنہگاروں کے لئے وہ اپنے آپ کو اس طرح نمونہ بنائیں کہ پہلے خود جرائم اور گناہوں کا ارتکاب کریں پھر توبہ و استغفار کر کے لوگوں کو بتائیں کہ تم بھی ایسا کیا کرو۔ منع کئے ہوئے درخت سے آدم علیہ السلام کا بھول کر کھا لینا یقیناً معصیت نہیں جیسا کہ ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اگر ان کے جنت سے زمین پر آنے کو مؤاخذہ ہی قرار دیا جائے تو یہ محض صورۃً مؤاخذہ ہوگا۔ مقربین کے درجات باقی نیک لوگوں سے بہت بلند ہوتے ہیں اُن کی ادنیٰ سی لغزش بھی بہت اہمیت رکھتی ہے اسی لئے اُنہیں مؤاخذہ جیسی صورت پیش آجاتی ہے جو اُن کے کمالِ قرب اور رفعِ درجات کی دلیل ہوتی ہے۔ جنت سے زمین پر آنے سے قبولیتِ توبہ تک آدم علیہ السلام کے لئے بھی یہی صورت پیش آئی لیکن اس دلیلِ قرب کے قائم ہو جانے کے بعد حقیقت اس طرح ظاہر ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے "ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى" (طٰہٰ: آیت ۱۲۳) فرما کر اُن کے برگزیدہ ہونے کا اعلان اور اعلیٰ مراتب قُرب کی راہیں اُن پر کشادہ فرمانے کا اظہار فرما دیا۔ لہٰذا یہ صورتِ مؤاخذہ بھی ان حکمتوں سے متعلق قرار پائے گی جن کا ہم نے ذکر کیا۔ علاوہ ازیں اور بھی بے شمار حکمتیں ہیں جن میں سے بعض کا ذکر انشاء اللہ عنقریب آئے گا۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا
فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا
بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى
الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

تو شیطان نے انہیں اس درخت کے ذریعے پھسلایا اور جہاں وہ رہتے تھے وہاں سے انہیں الگ کر دیا اور ہم نے فرمایا تم (سب) نیچے اُترو بعض تمہارے بعض کے دشمن ہوں گے اور تمہارے لئے ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھکانا اور فائدہ اُٹھانا ہے۔ ۴۰

---

۴۰ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا : یہاں "عَنْ" تعلیلیہ ہو تو ضمیر مجرور "اَلشَّجَرَةَ" کی طرف راجع ہے۔ یعنی شیطان نے آدم و حوا کو اس درخت کی وجہ سے پھسلا دیا۔ اس کی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں جیسے : مَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ (سورۂ توبہ، آیت ۱۱۴) "ابراہیم کے باپ کے لئے ان کے استغفار کا سبب صرف ان کا وعدہ تھا جو وہ اس سے کر چکے تھے"۔ نیز خضر علیہ السلام کا قول وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ (الکہف : آیت ۸۲) "اور میرے اس کام کا سبب میرا امر نہ تھا"۔ اگر "عن" یہاں تعلیل کے لئے نہ ہو تو ضمیر کا مرجع "اَلطَّاعَةَ" ہو سکتا ہے جو سابق کلام سے مفہوم ہے اس کے علاوہ "جنت" کی طرف بھی یہ ضمیر راجع ہو سکتی ہے یعنی شیطان نے آدم و حوا کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت یا جنت سے پھسلا دیا۔ (بحر محیط : ص ۱۹۲ ج ۱، روح المعانی : ص ۲۱۶ ج ۱، خازن ص ۴۳ ج ۱، مدارک ص ۴۲ ج ۱، فتح العزیز، ص ۱۹۲ ج ۱) فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ : یعنی شیطان نے آدم و حوا کو نعمت و کرامت کے مقام یا جنت الخلد یا ان کے لباس سے محروم کر دیا۔ آدم علیہ السلام کے مسجود ملائک ہونے کے بعد جب انہیں اور ان کی بیوی کو جنت میں رہنے کا حکم ہوا اور ارشاد ہوا کہ آپ یہاں جو چاہیں جہاں سے چاہیں بافراغت کھائیں لیکن اس درخت کے قریب نہ جائیں تو اسی منع کئے ہوئے درخت کی وجہ سے شیطان نے دونوں کو پھسلا دیا اور انہیں خوشحالی، بے فکری اور عیش و عشرت کے ماحول یعنی جنت سے دور کر دیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے سجدے سے شیطان کے انکار اور غرور و تکبر کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ : فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ (حجر، آیت ۳۴) "تو مردود ہے یہاں سے نکل جا"۔ تو شیطان آتش بغض و حسد سے جل اُٹھا اور کہنے لگا کہ جس طرح میں ذلیل و خوار کر کے نکالا گیا ہوں، آدم و حوا

اور اُن کی نسل کو اُسی طرح جنت سے نکالوں گا اور اُنہیں اسی طرح گمراہ کروں گا جس طرح مجھے گمراہ کیا گیا یعنی میں اُن سے اپنا پورا بدلہ لوں گا۔ شیطان اپنے آپ کو بدلہ لینے کے قابل سمجھتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ مجھے اتنی طاقت ملی ہے کہ جہاں سے مجھے کوئی نہ دیکھ سکے وہاں سے میں اپنے کنبے کے ساتھ بنی آدم کے ہر فرد کو دیکھ سکتا ہوں خواہ وہ کہیں بھی ہوں۔ "اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ" (اعراف آیت ۲۷)۔ اور ہر انسان کے اندر اپنے شیطانی اثرات اس طرح جاری و ساری کر سکتا ہوں جیسے آدمی کی رگوں میں خون جاری ہوتا ہے: اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ۔ (صحیح بخاری۔ ص: ۲۷۲، ۲۷۳، ۴۷۴، ۴۶۴، ۹۱۸، ۱۰۶۳، ابو داؤد: ص ۳۲۵ ج ۱۱، ابن ماجہ: ص ۱۲۸، مسند احمد ص ۱۵۱ ج ۳)۔ چنانچہ اس نے آدم و حوا اور اُن کی نسل سے بدلہ لینے کے لئے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگی جو ایک وقتِ معین تک اسے دے دی گئی۔ شیطان نے مہلت پا کر اُسی طاقت کو استعمال کیا اور آدم و حوا کو پھسلایا۔ قرآن مجید میں آدم و حوا سے اُس کی جو گفتگو مذکور ہے وہ اُنہیں وساوسِ قویہ کے ذریعے ہوئی۔ وہ آدم و حوا سے جو کچھ کہنا چاہتا تھا اُس نے زمین ہی سے سب کچھ وسوسے کی زبان میں اُن سے کہہ دیا۔ تفسیر بحرِ محیط (ص ۱۶۱ ج ۱۱) میں ہے: "وَقِيْلَ خَاطَبَهُمَا مِنَ الْاَرْضِ وَكَمْ يَصْعَدْ اِلَى السَّمَاءِ بَعْدَ الطَّرْدِ وَاللَّعْنِ وَكَانَ خِطَابُهُ وَسْوَسَةً"۔ قرآن مجید یا کسی حدیث صحیح میں وارد نہیں ہوا کہ شیطان آدم و حوا کے پاس جنت میں پہنچا ہو۔ قرآن پاک میں صرف یہی الفاظ وارد ہیں کہ "فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ"۔ (اعراف آیت ۲۰) اور سورۃ طٰہٰ (آیت ۱۲۰) میں ہے: فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ"۔ شیطان کے کسی کو دیکھنے یا وسوسہ ڈالنے کے لئے ہرگز ضروری نہیں کہ وہ جسمانی طور پر اس کے پاس آئے۔ آیت کریمہ اور حدیث صحیح کی عبارتِ منقولہ کی روشنی میں اس کے بغیر بھی وہ اپنا کام کر سکتا ہے۔ جن اقوال میں مور اور سانپ کے ذریعے شیطان کے جنت میں داخل ہونے کا ذکر وارد ہے یا از خود جنت کے دروازے تک اُس کا پہنچ جانا مذکور ہے وہ سب از قبیل اسرائیلیات اور ناقابل التفات

ہیں۔ ابن کثیر نے کہا: "قَدْ ذَكَرَ الْمُفَسِّرُوْنَ.... هٰهُنَا اَخْبَارًا اِسْرَائِيْلِيَّةً" (تفسیر ابن کثیر، ص ۸۰۱، ج ۱)۔ اور امام رازی فرماتے ہیں: اِعْلَمْ اَنَّ هٰذَا وَاَمْثَالَهٗ مِمَّا يَجِبُ اَنْ لَّا يُلْتَفَتَ اِلَيْهِ۔ "ضروری ہے کہ ایسی روایات کی طرف قطعاً التفات نہ کیا جائے۔" (کبیر ج ۱ ص ۴۶۲)۔ اِس قسم کے جو اقوال بعض صحابہ یا تابعین کی طرف منسوب ہیں، بر تقدیر تسلیم وہ مذکورہ اسرائیلی روایات کے نقل و حکایت پر محمول ہوں گے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ بعض مفسرین نے ان کو صحیح مانے بغیر محض بر سبیلِ حکایت نقل کر دیا ہے۔

زَلّت کی تشریح : آدم و حوّا علیہما السّلام کے لیئے فرمان تھا کہ اس درخت کے قریب نہ جانا۔ شیطان نے ان سے اس فرمانِ الٰہی کی نافرمانی کرانا چاہی۔ اِسی لئے وسوسے کی زبان میں دونوں سے کہا کہ میں تمہیں ایسا درخت نہ دکھاؤں جس کے کھانے سے تم ہمیشہ جنت میں رہو اور تمہیں ایسی بادشاہی نصیب ہو جائے جس میں کبھی کسی قسم کی کمزوری پیدا نہ ہو۔ شیطان نے ان کے دلوں میں بار بار وسوسہ پیدا کیا اور وسوسہ کی زبان میں قسم کھا کر اُن کو کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ اس درخت کے کھانے سے تمہارے رب نے صرف اِس لئے تمہیں روکا ہے کہ تم فرشتہ نہ ہو جاؤ، یا ہمیشہ تمہیں جنت میں رہنا نصیب نہ ہو جائے۔ بالآخر دھوکہ سے انہیں اس درخت کے کھانے پر آمادہ کر لیا۔ اور آدم و حوّا نے درخت سے کھا لیا اور کھاتے ہی اُن کا جنتی لباس اُن سے اُتر گیا اور وہ جنت سے زمین کی طرف اُتار دیئے گئے۔ یہاں تک تو شیطان کی خواہش پوری ہو گئی لیکن اصل مقصد میں وہ کامیاب نہ ہوا۔ اس کی اصل خواہش یہ تھی کہ آدم علیہ السّلام اللہ کی نہی کو یاد رکھتے ہوئے قصداً اس درخت سے کھائیں اور اس طرح عاصی اور نافرمان ہو کر جنت سے نکالے جائیں۔ اِسی لئے اُس نے وسوسہ کی زبان میں "مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ" (اعراف آیت ۲۰) کہہ کر اللہ کی نہی بھی انہیں یاد دِلا دی لیکن عصمتِ الٰہیہ نے معصیت سے انہیں بچا لیا اور اس درخت کے کھانے سے پہلے نہی الٰہی کا اُنہیں نسیان ہو گیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَنَسِيَ وَلَمْ

نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ (طٰہٰ: آیت ۱۱۵) "آدم بھول گئے ہم نے اُن کا قصد نہ پایا۔" اور آدم علیہ السلام قصداً فرمانِ الٰہی کی خلاف ورزی سے بچ گئے اور شیطان اپنے اصل مقصد میں ناکام ہوگیا یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "اَزَلَّ" کی بجائے "اَضَلَّ" نہیں فرمایا، یعنی یہ فرمایا کہ شیطان نے اُن کو پھسلا دیا یہ نہیں فرمایا کہ اُنہیں گمراہ کر دیا۔ اِس تقریر سے ظاہر ہو گیا کہ سورۂ طٰہٰ میں آدم علیہ السلام کے لئے لفظ "عَصٰی" اور "غَوٰی" سے حقیقتِ عصیان اور غوایت قطعاً مُراد نہیں بلکہ شجرِ ممنوعہ سے آدم علیہ السلام کے کھا لینے اور اُس کے نتیجے میں اُن کے جنت سے زمین پر آجانے کو محض صُورۃً "عَصٰی" اور "غَوٰی" سے تعبیر فرمایا گیا۔ یعنی آدم علیہ السلام کا درخت سے کھانا اور جنت سے زمین پر آنا صُورۃً عصیان اور غوایت کے مشابہ ہیں معصیت و غوایت کی حقیقت "عَصٰی" اور "غَوٰی" میں نہیں پائی جاتی۔ جیسا کہ آیت کریمہ "جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔" (شوریٰ: آیت ۴۰) بُرائی کے بدلے کو محض مشابہتِ صُوریہ کی وجہ سے سَيِّئَةٌ فرمایا گیا حقیقت میں بُرائی کا بدلہ بُرا نہیں کیونکہ کسی بُرے کام کو جائز قرار دینا اللہ تعالیٰ کی شان کے قطعاً خلاف ہے۔ ارشادِ الٰہی "اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ" (بنی اسرائیل، آیت ۶۵) بھی شیطان کے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے کی روشن دلیل ہے۔ آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور اُس کے نبی ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے خاص بندے ہیں جن پر اِس آیتِ کریمہ کی رُو سے شیطان کا غلبہ پانا محال ہے اِس لئے آدم علیہ السلام کو معصیت اور غوایت میں مُبتلا کرنا شیطان کے لئے ممکن نہ ہُوا۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ : صدورِ زلت کے ساتھ صُورت مؤاخذہ اس طرح پیش آگئی کہ دونوں کا جنتی لباس اُن کے بدن سے اُتر گیا اور جنت کے پتے وہ اپنے جسم پر چپکانے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے جنت سے اُتر جانے کا حکم دیا۔ بعض علماء نے کہا ہے یہ خطاب آدم و حوّا کو ہے۔ تثنیہ کو تشریعاً جمع سے تعبیر فرمایا گیا۔ مخاطب صرف آدم و حوّا ہیں، جس کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ طٰہٰ میں "اِهْبِطَا" تثنیہ کا صیغہ وارد ہے، جس کے مخاطب

صرف آدم و حوا ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اُن کی ذرّیت بھی مُراد ہے۔ چونکہ اصل آدم و حوا ہیں اس لئے سورۂ طٰہٰ میں "اِهْبِطَا" فرمایا اور تبعاً ان کی ذرّیت بھی شامل ہے اس لئے اس آیت میں "اِهْبِطُوْا" فرمایا گیا۔ ایک قول کے مُطابق آدم و حوا، اُن کی ذُرّیت اور شیطان سب مخاطب ہیں، بعض نے سانپ کو بھی اس خطاب میں شامل کیا۔ ہمارے نزدیک دلائلِ شرعیہ کی روشنی میں صحیح یہ ہے کہ اصالۃً آدم و حوا اور تبعاً اُن کی ذُرّیت "اِهْبِطُوْا" کا مخاطب ہیں کیونکہ شیطان کا اُس وقت جنّت میں ہونا کسی دلیلِ شرعی سے ثابت نہیں اور سانپ وغیرہ سے متعلقہ روایات از قبیلِ اسرائیلیات ہیں جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا ہے۔ بعض کا بعض کے لئے دُشمن ہونا کچھ مُفسّرین کے نزدیک اِس بات پر محمُول ہے کہ زمین پر انسان شیطان کا دُشمن اور شیطان انسان کا دُشمن ہوگا۔ مفسّرین کی ایک جماعت نے کہا کہ اولادِ آدم کا ایک دُوسرے کے لئے دُشمن ہونا مُراد ہے۔ دلائلِ شرعیہ کی روشنی میں یہی دُرست معلُوم ہوتا ہے۔ شیطان کا آدم و بنی آدم کے لئے دُشمن ہونا پہلے ہی ظاہر فرما دیا گیا تھا جیسا کہ سورۂ اعراف (آیت ۲۲) میں فرمایا: "اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ"۔ پھر یہ کہ "بَعْضُكُمْ"، کی ضمیرِ خطاب میں شیطان شامل نہیں، وُہ تو پہلے ہی مَردُود کر کے جنّت سے نکال دیا گیا تھا لہٰذا کتاب و سُنّت کے مطابق یہی قول راجح ہے کہ "بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ" (بقرہ، آیت ۳۶) کے مخاطب بنو آدم ہیں۔ "اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا" (بقرہ: آیت ۳۰) بھی اسی قول کی مؤید ہے کیونکہ باہمی فساد و خُونریزی ہی آپس کی دُشمنی کی بُنیاد ہے۔

بنی آدم کا ٹھکانا زمین کو قرار دیا گیا اگر اس سے حیاتِ دُنیوی کا استقرار مُراد ہو جیسا کہ لفظ "مَتَاعٌ" اس کا مؤید ہے کیونکہ کسی چیز سے دُنیوی فائدہ اُٹھانا حیاتِ دُنیا ہی سے متعلق ہے تو ایسی صُورت میں لفظ "حِيْنٍ" سے مُدّتِ طویلہ یعنی موت کا وقت مُراد ہوگا کیونکہ زمین پر رہ کر دُنیاوی فائدہ حاصل کرنا موت کے بعد ممکن نہیں اور اگر استقرار بعد الموت بھی اس میں شامل ہو تو پھر "حِيْنٍ" سے مُراد قیامت ہے اور آیتِ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ زمین تمہارا ٹھکانا ضرور ہے لیکن وُہ ابدی ٹھکانا نہیں۔ زمین کو مرنے کے بعد

اور قبر کو قیامت کے دن پھوڑنا پڑے گا۔ لہٰذا زمین پر ہمیشہ رہنے کا خیال دُرست نہیں

"اِهْبِطُوْا" "هُبُوْطٌ" سے ماخوذ ہے۔ "ہُبُوط" کے معنیٰ ہیں "اُترنا"، "اُوپر سے نیچے آنا"، "کسی چیز کا اُوپر سے نیچے گر جانا"۔ قرطبی (ج: ۱، ص: ۳۱۹) میں ہے: اَلْهُبُوْطُ اَلنُّزُوْلُ مِنْ فَوْقٍ اِلٰى اَسْفَلَ۔ "اُوپر سے نیچے اُترنے کو ہُبُوط کہتے ہیں"۔ اگر کہا جائے کہ "اِهْبِطُوْا مِصْرًا" میں "ہبوط" کے معنیٰ نیچے اُترنا مفہوم نہیں ہوتے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ "ہُبُوط" کبھی مکانی ہوتا ہے اور کبھی مرتبی۔ بنی اسرائیل جہاں مصر پہنچے تھے ہو سکتا ہے کہ وہ جگہ مصر سے اُونچی ہو وہاں سے نیچے اُتر کر وُہ مصر پہنچے ہوں، ورنہ "ہُبُوطِ مرتبی" تو متعین ہے کہ مصر پہنچتے ہی وہ ذلت و مسکنت میں مُبتلا ہو کر اپنے مرتبے سے نیچے آ گئے، یہ بھی ہُبُوط ہے۔ اِسی آیت کے تحت صاحب رُوح المعانی نے ارقام فرمایا: اَلْهُبُوْطُ يَجُوْزُ اَنْ يَّكُوْنَ مَكَانِيًّا بِاَنْ يَّكُوْنَ اَلْتِيْهِ اَرْفَعَ مِنْ مِصْرَ وَاَنْ يَّكُوْنَ مَرْتَبِيًّا وَهُوَ الْاَنْسَبُ بِالْمَقَامِ۔ یعنی "اِس آیت میں ہبوطِ مکانی بھی مُراد ہو سکتا ہے بایں طور کہ وادیٔ تیہ مصر سے اُونچی ہو اور ہبوطِ مرتبی مُراد ہونا بھی ممکن ہے اور وہی یہاں زیادہ مناسب ہے"۔ کیونکہ ذلت و مسکنت کا شکار ہو جانا اُن کے مرتبے کی پستی ہے اور آدم علیہ السلام پستیٔ مرتبہ سے پاک ہیں۔ ہبوط کے اس حکم کو ذلتِ آدم کی سزا قرار دینا صحیح نہیں جیسا کہ اِسی آیت کے تحت علامہ قرطبی نے لکھا: وَلَمْ يَكُنْ اِخْرَاجُ اللّٰهِ اٰدَمَ مِنَ الْجَنَّةِ وَاِهْبَاطُهٗ مِنْهَا عُقُوْبَةً لَّهٗ لِاَنَّهٗ اَهْبَطَهٗ بَعْدَ اَنْ تَابَ عَلَيْهِ وَقَبِلَ تَوْبَتَهٗ۔ کہ "اللہ تعالیٰ کا آدم علیہ السلام کو جنت سے اُترنے اور باہر جانے کا حکم اُن کی سزا کے لئے نہ تھا، اِس لئے کہ اُن کی توبہ اور قبولِ توبہ کے بعد اُنہیں جنت سے اُتارا گیا"۔ کیونکہ وُہ خلافتِ ارضیہ پر فائز ہونے کے لئے زمین پر اُترے تھے لہٰذا واضح ہو گیا کہ اُن کا ہبوط مکانی تھا اور وُہ آسمانی جنت سے زمین پر نازل ہوئے تھے۔ جمہور مُفسرین اور عُلماء اُمت کا یہی مسلک ہے کہ آدم علیہ السلام جس جنت میں تھے وُہ زمین پر نہیں بلکہ آسمان پر تھی۔ بعض ملحدین اس بات کے قائل ہیں کہ وُہ جنت ارضِ فلسطین کا ایک باغ تھا کیونکہ آسمانی جنت دار التکلیف نہیں

جب کہ آدم علیہ السلام ایک درختِ خاص کے قریب نہ جانے کے مکلف تھے نیز یہ کہ آسمانی جنت دار الخلد ہے، اس میں داخل ہونے کے بعد نکلنا ممکن نہیں لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں اس لئے کہ جنت کے دار التکلیف نہ ہونے کے معنیٰ ہیں کہ حیات بعد الموت کی صورت میں بطور جزا جنت میں داخل ہونے والا شخص مکلف نہ ہوگا جب کہ آدم علیہ السلام حیات بعد الموت کی صورت میں جنت میں داخل نہیں کئے گئے تھے۔ اس لئے اُن کا وہاں مکلف ہونا ممنوع نہیں۔ اسی طرح ان کا جنت میں داخل ہونا بھی بعد الموت بطور جزا نہ تھا اس لئے وہاں سے ان کا نکلنا بھی عین ممکن تھا۔

رہا اس مقام پر بعض ملحدین کا یہ کہنا کہ آدم و بنی آدم کا مستقر زمین ہے۔ ایسی صورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا کسی انسان کا آسمانوں پر جانا اور وہاں اُن کا ٹھہرنا خواہ تھوڑے وقت کے لئے ہو یا طویل زمانہ کے لئے، ممکن نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں عادتِ الٰہیہ اور عام قانون بیان فرمایا گیا لیکن اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے حکم سے خرقِ عادت کے طور پر قانون خاص کے مطابق تھوڑی مدت یا طویل زمانہ کے لئے آسمانوں پر ٹھہرا رہے تو اس میں کوئی استحالہ لازم نہیں آتا جب کہ خرقِ عادت اور قانونِ خاص دلیلِ شرعی سے ثابت ہو۔ جیسا کہ سورۂ مومنون میں تخلیقِ انسانی کے بیان میں وارد ہے، انسانی پیدائش کے لئے عادتِ الٰہیہ اور قانونِ عام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا فرمایا پھر اُسے اُس کی ماں کے پیٹ میں نطفہ بنا کر رکھا پھر نطفہ کو عَلَقہ بنایا پھر عَلَقہ کو مُضغہ (گوشت کی بوٹی) بنا کر اُس میں ہڈیاں مخلوق فرمائیں پھر ہڈیوں پر گوشت پہنایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی انسان ہیں لیکن وہ کسی کے نطفہ سے پیدا نہیں ہوئے۔ قرآن مجید میں حضرت مریم کا مقولہ: "وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ" اس پر شاہد ہے۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام بھی انسان ہیں مگر وہ نطفہ سے مخلوق نہیں ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت سے انہیں مٹی سے پیدا فرمایا تو اُن کے جسم میں روح پھونک دی۔ حضرت حوا بھی انسان ہونے کے باوجود نطفہ سے پیدا نہیں ہوئیں قرآن مجید میں ہے: وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا۔ یعنی "اللہ تعالیٰ نے آدم کی ایک جان سے اُن کی زوجہ کو پیدا فرمایا"

معلوم ہوا کہ قانونِ عام قانونِ خاص کی نفی نہیں کرتا۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا آسمان پر جانا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا معراج کی رات آسمانوں پر جلوہ گر ہونا اسی قبیل سے ہے۔ عیسٰی علیہ السلام کے لئے فرمایا: "بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ"۔ اور عیسٰی علیہ السلام کے رفع کے بعد اُن کے نزول کا ذکر بھی احادیثِ صحیحہ میں وارد ہوا مثلاً یَنْزِلُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ "عیسٰی ابن مریم تم میں نازل ہوں گے"۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے زبانِ اقدس سے اپنی آسمانی معراج کا ذکر فرمایا۔ قرآن وحدیث، وحی الٰہی اور حجتِ شرعیہ ہیں لہٰذا خرقِ عادت اور قانونِ خاص کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا آسمانی معراج اور عیسٰی علیہ السلام کا رفع اور اُس کے بعد نزول من السماء "وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ" کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

پھر سیکھ لئے آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمے تو اللہ تعالیٰ ان پر رجوع برحمت ہوا بیشک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔ ۴۱

۴۱ تَلَقِّیْ استقبال کو کہتے ہیں یعنی آدم علیہ السلام نے آنے والے باوقار مہمانوں اور معظم احباب کی طرح محبت واکرام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے کلمات کا استقبال کیا۔ وہ کلمات کیا تھے؟ علامہ ابوحیان نے فرمایا: وَلَمْ يُخْبِرْنَا اللّٰهُ بِهَا اِلَّا مُبْهَمَةً۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر وہ کلمات نہیں بتائے بلکہ "فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ" فرما کر ہمیں صرف کلماتِ مبہمہ کی خبر دی۔ اسی لئے اُن کی تعیین میں اہلِ علم سے چند اقوال منقول ہیں:

۱۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور بعض دیگر علماء نے کہا کہ وہ کلمات ہیں: "رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا" ۲۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ کلمات یہ ہیں: سُبْحَانَكَ

اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَ تَعَالٰی جَدُّکَ وَلَآ اِلٰہَ غَیْرُکَ. ۳۔ وہب اور محمد بن کعب سے منقول ہے وہ یہ کلمات ہیں: سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ عَمِلْتُ سُوْٓءً وَّظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ اِنَّکَ خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَ. یہ قول عبداللہ بن عباس کی طرف بھی منسوب ہے. ۴۔ قتادہ اور سدی کے قول میں وہ کلمات اس طرح ہیں: اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ کچھ تغیر کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے قول میں بھی یہی کلمات منقول ہیں. ۶۔ ایک قول یہ ہے کہ آدم علیہ السلام نے ساقِ عرش پر "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" لکھا ہوا دیکھا تو انہوں نے اسی اسم مبارک کو اپنی شفاعت کا ذریعہ بنایا۔ یہ آخری قول حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بروایت طبرانی، بیہقی، حاکم، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے تفسیر عزیزی میں نقل کیا۔ یہاں تفسیر عزیزی میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں: اَسْئَلُکَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ "اے اللہ! میں تجھے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ دے کر معافی چاہتا ہوں"۔ اسی تفسیر عزیزی میں حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم سے بھی بروایت ابن المنذر منقول ہے: اَللّٰھُمَّ اَسْئَلُکَ بِجَاہِ مُحَمَّدٍ عَبْدِکَ وَکَرَامَتِہٖ عَلَیْکَ اَنْ تَغْفِرَ لِیْ خَطِیْئَتِیْ۔ علامہ سید محمود الوسی حنفی بغدادی نے فرمایا: وَقِیْلَ رَاٰی مَکْتُوْبًا عَلٰی سَاقِ الْعَرْشِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ فَتَشَفَّعَ بِہٖ وَاِذَا اُطْلِقَتِ الْکَلِمَۃُ عَلٰی عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ فَلْتُطْلَقِ الْکَلِمَاتُ عَلَی الرُّوْحِ الْاَعْظَمِ وَالْحَبِیْبِ الْاَکْرَمِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ فَمَا عِیْسٰی بَلْ وَمَا مُوْسٰی بَلْ وَمَا وَمَا اِلَّا بَعْضٌ مِّنْ ظُہُوْرِ اَنْوَارِہٖ وَزَہْرَۃٌ مِّنْ رِّیَاضِ اَنْوَارِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ۔ یعنی "ایک قول یہ ہے کہ آدم علیہ السلام نے ساقِ عرش پر "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" لکھا دیکھا تو حضور کو انہوں نے اپنی شفاعت کا ذریعہ بنایا، یعنی وہ کلمات "محمد رسول اللہ" ہیں۔ علامہ الوسی فرماتے ہیں کہ جب قرآن مجید میں عیسیٰ علیہ السلام پر کلمۃ اللہ کا اطلاق ہوا تو روحِ اعظم حبیبِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کلمات اللہ"

کا اطلاق بطریقِ اولیٰ کیا جا سکتا ہے۔ نہ عیسیٰ ہیں، نہ موسیٰ بلکہ عالمِ امکان میں کوئی نہیں اور واقعی کوئی نہیں لیکن سب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہورِ انوار کے جلوے اور آپ ہی کے گلزارِ حسن کے مہکتے ہوئے پھول ہیں۔" اھ

فَتَابَ عَلَيْهِ: آدم علیہ السلام نے ان کلمات کے ذریعے توبہ کی، اللہ تعالیٰ اُسی وقت اُن پر رجوع برحمت ہوا اور اُن کی توبہ قبول فرمالی۔ بعض علما کے نزدیک آدم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے کلمات لینا اور اُن کے ذریعے توبہ کرنا اور اُن کی توبہ کا قبول ہونا جنت سے اُترنے کے بعد ہوا اور توبہ بھی کئی سو سال بعد قبول ہوئی۔ دو سو بلکہ تین سو سال آہ و بکا، گریہ و زاری اور ندامت کے حال میں اُن پر گزرے۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر عزیزی (ص ۱۰۲ ج ۱) میں یہی فرمایا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ جنت سے باہر آنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو وہ کلمات عطا فرما دیئے تھے اور اُسی وقت اُنہوں نے توبہ کی جو قبول ہو گئی اور اُسی وقت اللہ تعالیٰ نے اُن کی خطا معاف فرما دی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ معافی کے باوجود آدم علیہ السلام اپنی لغزش کو یاد کر کے ندامت کے طور پر سالہا سال تک گریہ و زاری میں مشغول رہے ہوں جو خوف و خشیتِ الٰہیہ کا تقاضا اور کمالِ عبدیت کی دلیل ہے۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

ہم نے فرمایا تم سب جنت سے اُتر جاؤ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جن لوگوں نے میری ہدایت کی پیروی کی تو اُن پر نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

۴۲ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا: "اِهْبِطُوْا" کے مخاطب کون ہیں؟ اس کی تفصیل اِس سے

پہلے "اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ" کے تحت گزر چکی ہے۔ راجح یہی ہے کہ اصالۃً آدم و حوا اور تبعاً اُن کی ذرّیت بھی اس کے مخاطب ہیں۔ "اِهْبِطُوْا" کا حکم بحوالہ مذکور ہوا۔ اِس تکرار کی توجیہ میں متعدد اقوال ہیں ایک یہ کہ اِس سے پہلے "اِهْبِطُوْا" کا حکم جنت سے آسمانوں پر اُترنے کے لئے تھا، دُوسرا حکم آسمانوں سے زمین پر آنے کے لئے۔ مگر یہ قول ضعیف ہے۔ کیونکہ حکم اوّل کے ساتھ "وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ" کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ حکم زمین پر ہی اُترنے کے لئے تھا۔ ایک معاصر نے معارف کے انداز میں کہا کہ آدم و حوا کو جنت سے نکلنے کا پہلا حکم بطورِ سزا کے تھا اور دُوسرا حکم اِس لئے تھا کہ آدم علیہ السلام زمین پر اُتر کر خلافتِ الٰہیہ قائم کریں۔ لیکن آدم علیہ السلام کے اُترنے کو سزا کہنا صحیح نہیں، جیسا کہ اس سے پہلے ہم علامہ قرطبی کی عبارت نقل کر چکے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو جنت سے اُترنے کا حکم اُن کے لئے سزا کے طور پر نہ تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ جنت سے اُترنے کے حکم کو مضبوط اور پختہ کرنے کے لئے بطور تاکید "اِهْبِطُوْا" کو مکرر فرمایا، جیسے کسی کو کھڑا ہونے کے لئے کہا جائے اور تاکید کے لئے "قُمْ قُمْ" کھڑا ہو، کھڑا ہو مکرر کہہ دیا جائے۔ (ظاہر ہے کہ اس سے دوبارہ کھڑا ہونا مُراد نہیں۔ قرطبی ج: ۱ ص: ۳۲۷)۔ بعض علمائے کہا کہ "اِهْبِطُوْا" کا حکم پا کر آدم علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ سے کلمات سیکھ کر اُن کے ذریعہ توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے وہ توبہ قبول فرمالی تو آدم علیہ السلام کے دِل میں یہ خیال پیدا ہُوا کہ جب میری توبہ قبول ہو گئی تو ہو سکتا ہے کہ جنت سے اُترنے کا حکم بھی باقی نہ رہا ہو۔ اِس خیال کو دُور فرمانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے "اِهْبِطُوْا" کی تکرار فرمائی تاکہ آدم علیہ السلام پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ جنت سے اُترنے کا حکم بطورِ سزا کے نہ تھا جو خطا مُعاف ہونے کے بعد باقی نہ رہے۔ بلکہ یہ حکم اس بات پر مبنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں خلافتِ ارضی کے منصبِ جلیل پر فائز کرنے کے لئے پیدا فرمایا تھا جیسا کہ اُن کی پیدائش سے پہلے ہی فرشتوں سے فرما دیا تھا: "اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةً" (میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں، بقرہ، آیت ۳۰) نیز یہ کہ رُوئے زمین پر قیامت تک اُن کی نسل پھیلتی رہے

اور اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں اُس کی جو حکمتیں اس سے وابستہ تھیں، وُہ پوری ہوں. اگر یہاں یہ شُبہ وارد کیا جائے کہ زلّت ونسیان پر انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں سے مواخذہ نہیں ہوتا لیکن انبیاء علیہم السلام سے ضرور مواخذہ ہوتا ہے. اگر آدم علیہ السلام کا جنّت سے زمین پر اُترنا اُن کے حق میں سزا نہ تھی اور اُن کا جنّت سے زمین پر آنا مؤاخذہ نہ تھا تو پھر کس چیز کو اُن کا مؤاخذہ قرار دیا جائے گا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ شجرِ ممنوعہ سے اُن کا کھانا اُن کی زلّت تھی جو بطورِ نسیان اُن سے سرزد ہُوئی جس پر اُن کا فوری مؤاخذہ اس طرح ہُوا کہ اُن کے جسم سے جنّت کا لباس اُتر گیا اور وُہ ایک دُوسرے کے سامنے عُریاں ہو گئے. بس یہی صُورت مؤاخذہ تھی جسے بعض مفسّرین نے لفظ "عتاب" سے بھی تعبیر فرمایا ہے لیکن یاد رہے کہ یہاں بھی "عتاب" کے وہی معنیٰ ہیں جو حواشی "سُورتِ فاتحہ" کے ضمن میں ہم مدلّل ومفصّل بیان کر چکے ہیں، یعنی "محبُوب کی ادنیٰ بے توجہی پر محبت بھری خفگی کا اِظہار" جو ان کے جسم سے جنّت کا لباس اُترنے کی صُورت میں سامنے آیا اور پھر اُسی وقت اللہ تعالیٰ نے اُنہیں کلمات کی تلقین فرمائی جن کے ذریعے اُنہوں نے توبہ کی اور قبُولِ توبہ کے بعد اُنہیں اعزاز واکرام کے ساتھ زمین پر اُتارا جہاں وہ خلافتِ الٰہیہ کے منصبِ عظیم پر فائز ہُوئے اور اس طرح ان کی حکمتِ تخلیق عمل میں آئی. اب مفسّرین کی وُہ عبارات ملاحظہ فرمائیں جن میں واضح طور پر مذکور ہے کہ آدم علیہ السلام کے جنّت سے زمین پر اُترنے سے پہلے ہی اُن کی توبہ قبُول ہو گئی تھی. جنّت سے زمین پر اُتارنے کو آدم علیہ السلام کی سزا قرار دینے والوں کی تردید کرتے ہُوئے امام قرطبی نے فرمایا: وَالصَّحِيحُ فِي إِهْبَاطِهِ وَسُكْنَاهُ فِي الْأَرْضِ مَا قَدْ ظَهَرَ مِنَ الْحِكْمَةِ الْأَزَلِيَّةِ فِي ذٰلِكَ وَهِيَ نَشْرُ نَسْلِهِ فِيهَا لِيُكَلِّفَهُمْ وَيَسْتَخْلِفَهُمْ وَيُرَتِّبَ عَلٰى ذَالِكَ ثَوَابَهُمْ وَعِقَابَهُمُ الْأُخْرَوِيَّ إِذِ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ لَيْسَتَا بِدَارِ تَكْلِيفٍ فَكَانَتْ تِلْكَ الْأَكْلَةُ سَبَبَ إِهْبَاطِهِ مِنَ الْجَنَّةِ وَلِلّٰهِ أَنْ يَفْعَلَ مَا يَشَاءُ وَقَدْ قَالَ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً وَهٰذِهِ مَنْقَبَةٌ عَظِيمَةٌ وَفَضِيلَةٌ كَرِيمَةٌ شَرِيفَةٌ یعنی آدم علیہ السلام

کا جنت سے اُتارنا اور اُن کا زمین پر ٹھہرانا اللہ تعالیٰ کی اُس حکمتِ ازلیہ کا تقاضا تھا جو ظاہر ہُوئی اور وُہ یہی ہے کہ وہ زمین میں اُن کی نسل پھیلائے تاکہ اپنے احکام کا مکلّف بنا کر انہیں آزمائے اور اس پر ان کا اُخروی ثواب و عقاب مرتب فرمائے۔ کیونکہ جنت و دوزخ دار التکلیف نہیں اِس لئے ان کا ممنوعہ درخت سے کُچھ کھا لینا اُن کے جنت سے اُترنے کا سبب ہُوا اور اللہ کو حق ہے کہ وُہ جو چاہے کرے۔ اُس نے پہلے ہی فرما دیا تھا "میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہُوں" اور یہ آدم علیہ السلام کی منقبتِ عظیمہ اور اُن کی اِنتہائی بزرگی اور شرف والی فضیلت ہے" اھ۔ تفسیر بحرِ محیط میں ہے: وَاَمَرَهٗ بِالْهُبُوْطِ اِلَى الْاَرْضِ بَعْدَ اَنْ تَابَ عَلَيْهِ۔ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اُترنے کا حکم اُن کی توبہ قبول فرمانے کے بعد دیا۔" امام رازی نے فرمایا: اِنَّ اٰدَمَ وَحَوَّاءَ لَمَّا اُتِيَا بِالزَّلَّةِ اُمِرَا بِالْهُبُوْطِ فَتَابَا بَعْدَ الْاَمْرِ بِالْهُبُوْطِ وَوَقَعَ فِيْ قَلْبِهِمَا اَنَّ الْاَمْرَ بِالْهُبُوْطِ لَمَّا كَانَ بِسَبَبِ الزَّلَّةِ فَبَعْدَ التَّوْبَةِ وَجَبَ اَنْ لَّا يَبْقَى الْاَمْرُ بِالْهُبُوْطِ فَاَعَادَ اللّٰهُ تَعَالٰى الْاَمْرَ بِالْهُبُوْطِ مَرَّةً لِيُعْلَمَا اَنَّ الْاَمْرَ بِالْهُبُوْطِ مَا كَانَ جَزَاءً عَلَى ارْتِكَابِ الزَّلَّةِ حَتّٰى يَزُوْلَ بِزَوَالِهَا بَلِ الْاَمْرُ بِالْهُبُوْطِ بَاقٍ بَعْدَ التَّوْبَةِ لِاَنَّ الْاَمْرَ بِهٖ كَانَ تَحْقِيْقًا لِلْوَعْدِ الْمُتَقَدِّمِ فِيْ قَوْلِهٖ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (تفسیر کبیر ج: ۱، ص: ۴۷۶) یعنی آدم و حوا علیہما السلام سے جب لغزش صادر ہُوئی اُن کو نیچے اُترنے کا حکم دیا گیا ان دونوں نے یہ حکم پاتے ہی فوراً توبہ کر لی (جو قبول ہو گئی) تو ان کے دل میں خیال پیدا ہُوا کہ یہ حکم جب لغزش کی بنا پر تھا تو توبہ کے بعد ضروری ہے کہ یہ باقی نہ رہے۔ ان کے اس خیال کو دُور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے جنت سے اُترنے کے اس حکم کو مکرر ذکر فرمایا تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ یہ حکم لغزش کے ارتکاب کی سزا کے طور پر نہ تھا جو توبہ قبول ہونے کے بعد باقی نہ رہے بلکہ توبہ کے بعد بھی یہ حکم اس لئے باقی ہے کہ اس کی بنیاد اس وعدے کو پورا کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً فرما کر کیا تھا۔ اھ۔ تفسیر نیشاپوری میں

بھی یہی مضمون مذکور ہے۔ تفسیر ابو سعود میں ہے۔ (فَتَابَ) اَلْفَاءُ لِلدَّلَالَةِ عَلٰی اَنَّ التَّوْبَةَ حَصَلَتْ عَقِيْبَ الْاَمْرِ بِالْهُبُوْطِ قَبْلَ تَحَقُّقِ الْمَاْمُوْرِ بِهٖ (تفسیر ابو سعود علی ہامش کبیر للرازی ج ۱، ص ۴۹۵، ۴۹۶)۔ "فَتَابَ عَلَيْهِ" میں حرف "فا" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آدم علیہ السلام نے زمین پر اترنے کا حکم پاتے ہی توبہ کر لی جو زمین پر اترنے سے پہلے ہی قبول ہو گئی تھی۔

جو امور حکمت سے متعلق ہیں اُن کا ظہور علم و قدرت کے منافی نہیں ہوتا

بعض آریہ اور دہریہ قسم کے لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کا علم و قدرت ہر چیز کو محیط ہوتا تو نہ وہ شیطان کو پیدا کرتا نہ آدم کو بناتا کیونکہ شیطان نے سرکشی، طغیان اور عصیان کا جو طوفان برپا کیا، اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہزاروں، لاکھوں نبی بھی آج تک اُسے نہ روک سکے بلکہ آدم کو بھی اللہ تعالیٰ نافرمانی سے (معاذ اللہ) نہ روک سکا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم و قدرت کسی چیز کو محیط نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش اور جنت میں ان کی رہائش سے لے کر زمین پر آنے تک جو حالات پیش آئے وہ سب اللہ کی حکمتوں پر مبنی تھے حکمت سے متعلقہ امور کے لئے اسباب کا مہیا فرمانا بھی عین حکمت ہے اسی طرح شیطان کا پیدا کرنا اور قیامت تک اغوائے بنی آدم کی اسے مہلت دینا بھی بے شمار حکمتوں پر مبنی ہے۔ جو اہل بصیرت سے مخفی نہیں اللہ تعالیٰ کا علم بھی محیط ہے اور اس کی قدرت بھی۔ لیکن اس کا ظہور حکمت کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ وہ "علیم و قدیر" ہونے کے ساتھ "حکیم" بھی ہے۔ وہ اپنی قدرت کا اظہار ہمیشہ حکمت کے موافق کرتا ہے۔ اگر کبھی قدرت کا اظہار نہ ہو تو اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ قدرت نہیں ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ حکمت اس کے اظہار کی متقاضی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی مثالیں ہمارے اندر بھی پیدا فرمائیں ہیں۔ بسا اوقات ہم دشمن سے انتقام لینے کی قدرت رکھتے ہیں مگر نہیں لیتے کیونکہ معاف کر دینا کمالِ انسانیت ہے، اس سے ہماری قدرت کی نفی نہیں ہوتی بلکہ کمالِ انسانیت کا ثبوت مہیا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ حکمت کے بغیر اپنی قُدرت کا اظہار نہیں فرماتا اس سے علم و قُدرت کی نفی نہیں ہوتی بلکہ صفتِ حکمت ثابت ہوتی ہے اگر حکمت کے خلاف اللہ تعالیٰ اپنی قُدرت کا اظہار فرماتا تو نظامِ کائنات کب کا درہم برہم ہو کر رہ گیا ہوتا معلوم ہُوا کہ خلافِ حکمت قُدرت کے ظاہر نہ ہونے سے ہرگز قُدرت کی نفی نہیں ہوتی نہ اسے نفیِ علم کی دلیل کہا جا سکتا ہے۔ دینِ متین میں یہ اصل عظیم ہے۔

واضح رہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام منصب نبوت و رسالت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہونے کی حیثیت سے جو کچھ فرماتے ہیں یا جو کام کرتے ہیں وُہ سب اللہ کی طرف منسُوب ہوتا ہے۔ مثلاً رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اصحابِ "بئرِ معُونہ" کو بھیجنا اور ان کا وہاں شہید ہو جانا اور تقریباً پندرہ سو صحابہ کے ساتھ عُمرے کا احرام باندھ کر طوافِ بیت اللہ کے لئے تشریف لے جانا اور مقام حدیبیہ پر حضُور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا روک لیا جانا اور وہیں عُمرے کا احرام کھول کر مدینہ منورہ واپس تشریف لے آنا اور اسی قسم کے دیگر پیش آمدہ واقعات کے بارے میں رسُول اللہ صلی علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرام سے جو کچھ فرمایا اور جو کام کئے وُہ سب اللہ تعالیٰ کے امر اور اُس کی وحی کے عین مطابق تھے اور ان سب کی بنیاد بھی یہی اصلِ عظیم تھی۔ جیسے ہم نے بیان کیا کہ علم و قُدرت کے آثار کا ظہُور حکمت کے خلاف نہیں ہوتا۔ یہ تمام واقعات علم و قُدرت کی نفی کی دلیل نہیں بلکہ اللہ اور اُس کے رسُول کی حکمتوں کو ظاہر کرتے ہیں انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کمالِ علم کی نفی پر محمُول کرنا نُورِ بصیرت سے محرومی کی دلیل ہے۔ اس مقام پر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصب نبوت پر فائز ہو کر تشریف لائے ہیں۔ شیطان کو اللہ تعالیٰ نے کوئی منصب نہیں دیا بلکہ اغوائے بنی آدم کے لئے شیطان کے مہلت مانگنے پر اسے مہلت دی گئی۔

سورۂ اعراف کا مضمُون جو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں اس میں واضح طور پر موجُود ہے کہ اغوا کے لئے "شیطان اور اُس کا کُنبہ بنی آدم کے ہر فرد کو دیکھتا ہے"۔ اور صحیح بخاری شریف کی

حدیث (ج: ۲، ص ۱۰۶۲) میں صاف مذکور ہے کہ شیطان تمام بنی آدم کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے"۔ وہ اپنی یہ علمی و عملی قوت بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے ایسی صورت میں یہ بات آفتاب سے زیادہ روشن ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام جو منصب ہدیٰ پر فائز ہو کر جن و انس کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے ان کی قوت علمیہ و عملیہ کا مقام کتنا بلند ہوگا؟۔ اتنا بلند اور اونچا مقام کہ اُن کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ شیطان تو بنی آدم ہی کے ہر فرد کو دیکھتا ہے لیکن اللہ کے نبی کی شان یہ ہے کہ اللہ کے دکھانے سے وہ آسمانوں اور زمینوں کی ہر چیز کو دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرَاهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۔ (انعام، آیت ۷۵) ملکوت السموات اور ملکوت الارض کا کوئی حصہ نہیں جو نگاہِ ابراہیمی پر روشن نہ ہو۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" سب کچھ اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا جیسا کہ خود زبانِ رسالت نے فرمایا۔ "فَعَلِمْتُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (ترمذی شریف طبع مدینہ منورہ۔ ج: ۵، ص: ۴۵) اور دوسری حدیث میں فرمایا فَتَجَلّٰى لِيْ كُلُّ شَيْءٍ وَعَرَفْتُ (جامع ترمذی۔ ج: ۵، ص: ۴۷ طبع مدینہ منورہ) رہی قوتِ عملیہ تو اس میں بھی انبیاء علیہم السلام کا جواب نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مومنین کی جانوں سے زیادہ قریب بنایا جیسا کہ ارشاد فرمایا۔ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (الاحزاب، آیت ۶) شیطان تو بنی آدم کی رگوں تک ہی پہنچتا ہے۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کی جانوں سے زیادہ قریب ہیں۔

عیسائیوں کے عقیدۂ کفارہ کا رد۔ اس مقام پر عیسائی یہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا علیہما السلام دونوں کو درخت کھانے سے منع فرمایا تھا آدم نے اس درخت سے پھل کھانے کی جرأت نہیں کی یہ گناہ حوا نے کیا اور اُسی نے آدم کو وہ درخت کھلا دیا۔ اصل گناہ عورت کا ہے جو بطورِ میراث اس کی نسل میں چلا اور آدم و حوا کی اولاد کے ہر فرد کو وہ گناہ

میراث میں پہنچا پوری نسلِ آدم گنہگار قرار پائی۔ ایک گنہگار دوسرے گنہگار کے لئے کفارے کا ذریعہ نہیں ہو سکتا اِس لئے اللہ تعالیٰ نے مریم کے پیٹ سے پیدا ہونے والے اپنے اکلوتے بیٹے یسوع مسیح کو آدم و حوا کی پوری نسل کے گناہوں کے لئے کفارہ بنا دیا اور یسوع نے سب انسانوں کو نجات دے دی۔

عقلِ سلیم کی روشنی میں کسی طرح بھی یہ بات درست نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جب گناہ کا اصل مرکز عورت ہوئی تو جو نر باپ کے بغیر صرف عورت سے پیدا ہو وہ ان سے زیادہ گناہ گار قرار پائے گا جو ماں باپ سے پیدا ہوئے۔ پھر دوسروں کے لئے اس کا نجات دہندہ ہونا کیوں کر ممکن ہوگا۔ علاوہ ازیں اِسلام نے اس نظریہ کا بڑی سختی سے رد کیا ہے کہ ایک کا گناہ دوسرے کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے۔ ہر شخص کا گناہ وہی ہے جو اُس نے خود کیا پھر یہ بات تو بالکل ہی خلافِ عقل ہے کہ دوسروں کے گناہوں کی سزا ایک بے گناہ کو دے دی جائے۔ قرآن نے فرمایا: "لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" (انعام، آیت ۱۶۴) "کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔" کیونکر ہو سکتا ہے کہ بے گناہ مسیح کے سر پر سب انسانوں کے گناہوں کا بوجھ رکھ دیا جائے۔ بیشک انبیاء علیہم السلام اپنی قوموں کے لئے نجات کی راہیں کشادہ کرنے کے لئے آئے ہیں لیکن نجات اسی کو ملتی ہے جو اُن کے پیغام کو قبول کر کے نجات کی راہوں پر گامزن ہو۔

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی۔ زمین پر رہنے والے اللہ تعالیٰ کے سب عبادِ مکلفین اس خطاب میں شامل ہیں خواہ اِنسان ہوں یا جن۔ کیونکہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کا پیغام نہ آئے خلافت الٰہیہ کا نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت جس طرح اِنسانوں کے پاس آئی کہ وہ نبی اور رسول ہوئے۔ جنات کے پاس بھی اسی طرح بلا واسطہ ہدایت آئی اور جنات میں بھی رسول پیدا ہوئے یا نہیں۔؟ ضحاک وغیرہ نے کہا کہ جنات میں رسول ہوئے۔ اُنہوں نے اِس آیت سے

استدلال کیا۔ یَامَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ۔ الآیہ۔ لیکن یہ استدلال صحیح نہیں اگرچہ اس آیت میں جن و انس دونوں کا ذکر ہے لیکن "مِنْکُمْ" میں جن شامل نہیں اس کا مصداق صرف انسان ہیں اس لئے جنات میں سے رسولوں کا آنا اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ آیت کریمہ "یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ" (سورۂ رحمٰن: آیت ۲۲) میں دو دریا مذکور ہیں لیکن مراد صرف ایک کھاری دریا ہے اسی سے لؤلؤ اور مرجان نکلتے ہیں اسی طرح "مِنْکُمْ" سے صرف انسان مراد ہیں انہیں میں سے رسول پیدا ہوتے رہے۔ جن مراد نہیں اس لئے جنات میں سے رسولوں کا ہونا اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ کا کوئی نبی جنات کے کچھ افراد کو اپنا پیغام دے کر ان کی قوم کی طرف انہیں بھیج دے۔ مگر وہ اللہ کا رسول نہیں بلکہ وہ نبی کے رسول (فرستادہ) ہوتے ہیں جنات کے ایسے ہی افراد کو "نُذُرٌ" کہا گیا ہے جیسا کہ مجاہد وغیرہ سے منقول ہے۔

بعض نے کہا کہ جنات میں سے رسول نہ ہونے پر اجماع ہے لیکن یہ صحیح نہیں اس کی بجائے یہ کہنا چاہیئے کہ جمہور علمائے امت اور اکثرین کے نزدیک جنات میں سے رسول نہیں ہوئے۔

تنبیہ ضروری: آدم علیہ السلام کے قصے میں جس طرح یہاں "اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ" فرمایا گیا اسی طرح سورہ اعراف آیت ۳۵ میں بھی آدم علیہ السلام کے اسی واقعے کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ" الآیۃ۔ دونوں آیتیں ایک ہی قصے سے متعلق ہیں اور دونوں کا مفاد ایک ہے۔ یعنی خلافتِ الٰہیہ کا نظام اللہ کی ہدایت آئے بغیر قائم نہیں ہو سکتا جس کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ رسول آئیں اور اللہ کی آیات کی تلاوت فرمائیں اور اس کی ہدایت اس کے بندوں کو پہنچائیں۔ ان آیتوں میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کہ معاذ اللہ قیامت تک وحی نبوت آتی رہے گی اور ہمیشہ رسول پیدا

ہوتے رہیں گے۔ ان دونوں آیتوں میں اللہ کی طرف سے ہدایت اور رسُولوں کے آنے کا ذکر ہے یہ نہیں کہ یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ "اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی" اور "اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ" دونوں آیتوں کے یہ جملے محلِ شرط میں ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین اور آخر النبیین کی حیثیت سے رسُول بنا کر بھیجا تو کسی مومن کے دِل میں یہ وہم بھی پیدا نہیں ہو سکتا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد وحیِ نبوت کی صُورت میں کوئی نئی ہدایت یا جدید رسُول کا آنا ممکن ہے۔

فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ الایۃ۔ بتقاضائے بشریت اِنسان کو دو چیزیں لاحق ہوتی ہیں آنے والی مصیبت کی طرف سے خوف اور جو مصیبت آچکی اُس کے نتیجے میں غم۔ خوف اور غم سے بچنا ہر شخص کا فطری تقاضا ہوتا ہے اور خوف و غم سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکومت و خلافت کا نظام اور اس کے لئے قواعد و قوانین بنائے جو انبیاء علیہم السلام اور وحیِ نبوت ہی کے ذریعہ مل سکتے ہیں۔ اللہ کی وہ وحی آچکی اور نبوت و رسالت کی تعلیمات ہر ایک کو پہنچ چکیں اور وہ قیامت تک موجُود رہیں گی۔ جہاں تک خوف اور حُزن سے بچنے کا تعلق ہے اس کا ذریعہ نبوت کے ارشادات اور ان کی اتباع ہی ہے۔ قُرآن پاک کا دعویٰ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اتباع کریں گے انہیں کوئی غم اور کوئی خوف نہ ہوگا اور ابدی امن کی آغوش راحت انہیں کو نصیب ہوگی۔

اگر کوئی کہے کہ دُنیا میں ایمان والوں کو خوف اور غم لاحق ہوتا ہے اور آخرت میں بھی خوف طاری ہوگا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ "لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ" میں اس غم اور خوف کی نفی ہے جس کا انجام ذلت و رُسوائی اور ضرر محض ہو۔ ایسا خوف و غم کسی مومن کو دُنیا و آخرت میں لاحق نہ ہوگا۔ جن آیات و احادیث میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و بعض دیگر انبیائے کرام، اہل بیت اطہار، صحابہ کرام، مجاہدین اسلام، شہدائے کرام، مجروحین مقتولین اور مومنین مظلومین فی سبیل اللہ پر دُنیا میں خوف اور غم طاری ہونے کا ذکر ہے۔ اس کا انجام

ان سب کے حق میں عزت و اکرام، رضائے الٰہی اور نعمائے جنت کی صورت میں متحقق ہوگا۔ لہٰذا وہ اس آیت کریمہ کے منافی نہیں۔ کیونکہ بالآخر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ارشاد فرمائے گا۔ "یٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (زخرف: آیت ۶۹) اے میرے بندو! آج تم پر کچھ خوف ہے اور نہ تم کبھی غمگین ہوگے۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ
اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیتیں جھٹلائیں وہ دوزخی ہیں وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے ۴۳

۴۳ روئے زمین پر رہنے والا کوئی بھی انسان ہو۔ ہر ایک کی طبعی اور نفسیاتی خواہش یہی ہے کہ وہ خوف اور غم سے نجات حاصل کرے۔ عارضی تکالیف کا طاری ہونا قانونِ فطرت ہے جس سے کسی کو مفر نہیں لیکن انجام کار کے لحاظ سے بے خوف اور بے غم ہونا اور ان دونوں سے ابدی نجات حاصل کرنا قرآنی تعلیمات اور اسلام ہی کی آغوشِ رحمت میں ممکن ہے۔ اسی لئے اسلام کو دینِ فطرت کہا گیا جیسا کہ فرمایا۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (سورۂ روم: آیت ۳۰) لوگو! اللہ کی فطرت (دین اسلام) کو لازم پکڑو اللہ کی پیدا کی ہوئی سرشت میں کچھ ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ یہی ہے سیدھا دین۔

جنہوں نے قرآن اور اسلام کا انکار کیا اور اللہ کی چمکتی ہوئی آیتوں کی تکذیب کی انہوں نے ابدی راحتوں اور نعمتوں سے منہ موڑ لیا۔ ان کا آخری انجام یہی ہے کہ وہ دوزخی ہیں اور اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ

اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ
بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾

اے اولادِ یعقوب یاد کرو میرا وہ انعام جو میں نے تم پر کیا اور پورا کرو میرے عہد کو میں تمہارا عہد پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرو۔ ۴۴ھ

۴۴ھ. بنی اسرائیل سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد مراد ہے یعقوب علیہ السلام، اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے اور ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ہیں۔ "اِسْرَائِیْل" ان کا لقب ہے۔ "اِسْرَائِیْل" اسم عجمی ہے۔ "اِسْرَا" اور "اِیْل" سے مرکب ہے۔ "اِسْرَا" کے چار معنی مفسرین نے لکھے ہیں۔ "عَبْد، صفوۃ" (برگزیدہ) اِنسان اور مہاجر۔ یعقوب علیہ السلام پر یہ چاروں معنیٰ صادق آتے ہیں۔ وہ عبداللہ بھی ہیں اور اللہ کے برگزیدہ بھی نیز وہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے (مقدس) اِنسان ہیں اور اس کی طرف ہجرت کرنے والے بھی۔

بعض نے کہا کہ یہ لفظ عربی اور عبرانی سے مرکب ہے۔ عربی میں رات کے وقت لیجانے کو "اِسْرَا" کہتے ہیں اور عبرانی زبان میں "اِیْل" کے معنی ہیں اللہ! یعقوب علیہ السلام کو رات کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف ہجرت کرائی گئی اس لیے ان کا لقب "اِسْرَائِیْل" قرار پایا (قرطبی: پ۱، ص: ۳۳۱) اس مقام پر امام قرطبی نے "مَہْدَوِی" کا یہ قول بھی نقل فرمایا کہ "اِسْرَا" کے معنی ہیں شدت و قوت۔ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام کو قوت عطا فرمائی تھی اور ان کی خلقت میں پختگی اور مضبوطی رکھی تھی۔

بعض علماء نے لفظ "اِسْرَائِیْل" کو لقب کی بجائے یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام قرار دیا۔ جیسا کہ علامہ قرطبی نے ابنِ جوزی سے نقل کیا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے علاوہ نبیوں میں صرف یعقوب علیہ السلام کے دو نام ہیں "اِسرائیل و یعقوب"۔
امام قرطبی نے اس مقام پر فرمایا دیکھو یعقوب علیہ السلام کی خصوصیت نہیں بلکہ اُن کے علاوہ
اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بھی دو یا اس سے زیادہ نام ثابت ہیں جیسے عیسیٰ علیہ السلام
کے چار نام ہیں "مسیح، عیسیٰ، کلمۃ اللہ، روح اللہ"۔ اسی طرح یونس علیہ السلام
کا دوسرا نام ذوالنون اور الیاس علیہ السلام کا دوسرا نام ذوالکفل ہے "بنین" ابن کی جمع ہے اضافت
کی وجہ سے یہاں نون ساقط ہو گیا۔ "ابن" بیٹے کو کہتے ہیں بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ
حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو زید بن محمد کہا جاتا تھا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے
بامرِ الٰہی ان کی مطلقہ بیوی سے بعد مرورِ عدت نکاح فرمایا تو مخالفوں نے کہا اپنے حقیقی
بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ"
فرما کر نہایت بلیغ انداز میں اس کی نفی فرمائی یعنی جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم میں سے
کسی بالغ مرد کے بلاواسطہ جسمانی باپ نہیں تو تم میں کوئی بلاواسطہ حضور کا جسمانی بیٹا
نہیں ہو سکتا خواہ زید بن حارثہ ہوں یا کوئی اور۔ حسنین کریمین حضور کے بیٹے ضرور ہیں
مگر بالواسطہ ہیں بلاواسطہ نہیں اس لئے اُن کا بیٹا ہونا اس آیت کے خلاف نہیں۔
لفظ "ابن" سے ہمیشہ بیٹا ہی مراد نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات بیٹے کی طرح لاڈلے اور پیارے
کو بھی لفظِ ابن سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ یہود و نصاریٰ کا مقولہ۔ "نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ
اَحِبَّآؤُهٗ" اسی قبیل سے ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ وہ اپنے لئے اللہ کے بیٹے ہونے
کے اس معنی کا دعویٰ نہیں کرتے تھے جس کے وہ عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں مدعی تھے۔
معلوم ہوا کہ یہاں یہود و نصاریٰ کے مقولہ "اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ" کے معنی اللہ کے بیٹے نہیں
بلکہ بیٹوں کی طرح لاڈلا اور محبوب ہونا مراد ہے۔ لفظ "بَنِیْ" جب مضاف ہو تو عرفاً
اس سے صرف بیٹے نہیں بلکہ مطلقاً اولاد مراد ہوتی ہے اس لئے یہاں "بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ"
سے بلاامتیاز مرد و عورت۔ بنو قریظہ، بنو نضیر وغیرہ یعقوب علیہ السلام کی تمام اولاد بلکہ

سب اہل کتاب یہود و نصاریٰ مُراد ہیں۔

تنبیہِ ضروری: اِس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے وُہ سب پر غالب ہے کوئی اس پر غالب نہیں۔ اگر کسی کا یہ اِعتقاد ہو کہ اللہ اپنے کسی محبُوب بندے کی بات ماننے پر مجبُور ہے اور اس کے ٹالنے پر قادر نہیں تو لاریب ایسا اِعتقاد شرکِ جلی اور کُفرِ خالص ہے اور یہ اِعتقاد رکھنے والا کافر و مُشرک اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ بطریقِ فضل و احسان بھی اپنے محبُوبوں کی دُعائیں قبُول نہیں فرماتا۔ بُخاری شریف (ج: ۲، ص: ۹۶۳) پر حدیث قُدسی میں وارد ہے۔

وَاِنْ سَئَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّہٗ وَ لَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّہٗ "یعنی میرا محبُوب بندہ اگر مجھ سے مانگے تو یقیناً میں اُسے ضرور عطا کروں گا اور اگر وُہ مجھ سے پناہ طلب کرے تو یقیناً میں اسے ضرور پناہ دوں گا۔ دونوں جُملوں میں "لام" تاکید اور "نُون" تاکید سے یہ بات نہایت مؤکّد اور یقینی ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی محبُوب کی دُعا ہرگز رد نہیں فرماتا۔

اُذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ: دل کی یاد ذکرِ قلبی ہے اور زبان سے یاد کرنا ذکرِ لسانی۔ زبان کی خاموشی ذکرِ لسانی کی نفی ہے اور دِل سے بھُول جانا ذکرِ قلبی کی ضِد مطلب یہ ہے کہ میری نعمتوں کو دِل سے نہ بھلاؤ اور زبان سے بھی اس کا ذکر کرتے رہو۔ لفظ "نعمۃ" مُفرد ہے لیکن اسم جنس ہونے کی وجہ سے یہاں جمع کے معنیٰ میں ہے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو جو مخصُوص نعمتیں عطا فرمائیں اُنہوں نے اُن کو بُھلا دیا جو عظیم ناشکری ہے۔ بنی اسرائیل کی مخصُوص نعمتوں میں سے دریا کا چیرنا فرعون کا غرق کرنا اور اُنہیں اس سے نجات دینا، مَنّ و سَلْویٰ کا اتارنا۔ اُن میں نبوت اور بادشاہت کا رکھنا، میدانِ تیہ میں بادلوں کا ان پر سایہ کرنا، تُورات نازل فرمانا جس میں حضرت محمد رسُول اللہ کی صفت و تعریف اور آپ کی رسالت کا بیان ہے اس

کے علاوہ بکثرت نعمتیں ہیں جو بنی اسرائیل کو خاص طور پر عطا فرمائی گئیں۔ آباء کی نعمتیں ابناء کے حق میں بھی نعمتیں ہوتی ہیں آباء کا شرف ابناء کا شرف ہے۔ اس لئے شکرِ نعمت سب پر لازم ہے۔ علاوہ ازیں ابنائے بنی اسرائیل کو ایک ایسی نعمت بھی ملی جس سے اُن کے آباء محروم تھے وہ نعمت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوۃ کا زمانہ ہے جس کی بناء پر اُن سے شکرِ نعمت کا مطالبہ بہت زیادہ اہم اور قوی ہو جاتا ہے۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ: "اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ" میں عہد سے مُراد ایمان اور طاعت کا التزام ہے۔ امام ابن جریر اور علامہ قرطبی نے جہاں متعدد اقوال نقل فرمائے۔ ان میں ایک قول یہ بھی ہے کہ شریعت موسوی اور تورات پر عمل کرنے اور نبی آخر الزمان حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کا جو عہد بنی اسرائیل نے کیا تھا اُسے پورا کرنے کا حکم اُنہیں دیا جا رہا ہے (قرطبی، ج:۱، ص: ۳۳۲) "اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ" سے مُراد یہ ہے کہ تمہیں اِس ایفائے عہد کی بہترین جزاء عطا فرماؤں گا اور جنت میں داخل کروں گا۔ "وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ": یعنی تمہارا رب میں ہوں اِس لئے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے میں تمہیں صرف مجھ سے ڈرنا چاہیئے (قرطبی، ج:۱، ص: ۳۳۳) دُنیا میں یہ خوف تمہارے لئے آخرت میں بے خوفی کا باعث بنے گا۔ جو لوگ دُنیا میں اللہ سے نہیں ڈرتے وہ آخرت میں اللہ کے غضب اور اُس کے عذاب سے ضرور خائف ہوں گے۔ مروی ہے کہ قیامت کے دن اہل محشر کو فرشتہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنائے گا کہ میری عزت اور جلال کی قسم میں اپنے کسی بندے پر دو خوف یا دو امن جمع نہیں کروں گا جو دُنیا میں مجھ سے بے خوف رہا قیامت کے دن اسے خوفزدہ کروں گا اور جو دُنیا میں مجھ سے خائف رہا آخرت میں اسے بے خوف کردوں گا۔ (مراح لبید، ص: ۱۲۰۱)

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ

وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۪ وَلَا تَشْتَرُوْا
بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۫ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

اور ایمان لاؤ اس (قرآن) پر جو میں نے اُتارا تصدیق کرتا ہُوا اس چیز کی جو تُمہارے پاس ہے (اصل آسمانی کتابوں سے) اور تُم سب سے پہلے اس کے مُنکر نہ بنو اور (دُنیا و مافیہا سب) میری آیتوں کے بدلے میں قلیل ہے لہٰذا) میری آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لو اور مجھ ہی سے ڈرو۔ ۴۵ھ

۴۵ھ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ : ایمان امن سے ماخوذ ہے۔ امن بے خوفی کو کہتے ہیں تصدیق کو بھی اس لئے ایمان کہتے ہیں کہ تصدیق سبب ہے تکذیب سے بے خوفی کا۔ بندہ جب ضروریاتِ دین پر ایمان لاتا ہے تو وہ اس حیثیت سے مومن ہے کہ اس نے اپنے آپ کو دائمی عذاب سے بے خوف کر دیا۔ ضروریاتِ دین سے وُہ دینی اُمور مُراد ہیں جنہیں خواص اور اُن کے ساتھ تعلق رکھنے والے عوام اس حیثیت سے جانتے ہوں کہ اُن پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جیسے دوزخ، جنت، روزِ قیامت اور فرشتوں کے وجُود کو تسلیم کرنا اسی طرح رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آخری نبی ہونے پر یقین رکھنا ضروریاتِ دین سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں لفظ مومن وارد ہے کہ اس نے دُنیاوی تکالیف سے بے خوف کرنے کے لئے اسباب امن پیدا فرمائے اور کلمہ توحید کی وجہ سے ایمان والوں کو آخرت میں دائمی عذاب جہنم سے بے خوف فرما دیتا ہے۔ بے خوفی کا لحاظ کئے بغیر اللہ تعالیٰ مُصَدِّق کے معنیٰ میں بھی مؤمن ہے کیونکہ اس نے مخلُوقات کو پیدا فرما کر اپنی ذات کی تصدیق فرمائی اور معجزات و خوارق عادات عطا فرما کر انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بھی تصدیق فرمائی۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بحیثیت رسُول جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے دِل سے اُسے سچا ماننا اصل ایمان ہے۔

أُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ۔" (پ۲۸، المجادلہ ۲۲)۔ اور ایمان کے احکام شرعیہ نافذ ہونے کے لئے زبان سے اقرار کرنا شرط ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھ بعض دوسرے ائمہ کا مذہب ہے۔ اصحابِ حدیث کا قول ہے کہ تصدیقِ قلبی اور اقرارِ لسانی کے ساتھ باقی جوارح کا عمل بھی ایمان کا رکن ہے۔ ان کی مراد ایمان کامل ہے جس کا تحقق تقویٰ اور اعمالِ صالحہ کے بغیر نہیں ہو سکتا جن نصوص میں اصحابِ عصیاں کے ایمان کی نفی وارد ہے اُن سے کامل ایمان ہی مراد ہے مطلق ایمان مراد نہیں۔ خوارج کے نزدیک مرتکب کبیرہ کافر ہے اور معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ایمان سے خارج ہو گیا مگر کفر میں داخل نہیں ہوا۔ اہلِ سنت کے نزدیک ایمان و کفر کے درمیان کوئی درجہ نہیں۔ وہ مومن فاسق ہے کافر نہیں۔ کرامیہ کہتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ معصیت مضر نہیں جیسا کہ کفر کے ساتھ طاعت مفید نہیں۔ اہلِ سنت کے نزدیک اُن کا یہ مذہب باطل ہے۔ اہلِ سنت کا مذہب یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ معصیت یقیناً مضر ہے اور کرامیہ کا کہنا کہ کفر کے ساتھ طاعت مفید نہیں مغالطہ ہے۔ اس لئے کہ کفر کی حالت میں کوئی کام طاعت اور نیکی نہیں ہو سکتا نیکی اور طاعت کی بنیاد ایمان ہے۔ مرجۂ ضالہ کہتے ہیں کہ ایمان کے ہوتے ہوئے عمل صالح کا ہونا کوئی ضروری نہیں۔ اہلِ سنت کا مذہب یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ کا ہونا بالخصوص جن اعمال کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض، واجب یا کسی اعتبار سے ضروری قرار دیا ہے یقیناً ضروری ہے۔ البتہ وہ نفس ایمان میں شامل نہیں کیونکہ نفسِ ایمان امرِ بسیط ہے ماہیتِ ایمان میں اعمال کو شامل کرنا معتزلہ و خوارج کا مذہب ہے جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔

ایمان میں کمی بیشی: بیان سابق سے واضح ہو چکا کہ نفسِ ایمان امرِ بسیط ہے۔ اس میں کمی بیشی متصور نہیں۔ البتہ ایمان کامل جو تصدیق قلبی و اقرارِ لسانی کے ساتھ اعمالِ صالحہ کا مجموعہ ہے اس میں ضرور کمی بیشی واقع ہوتی ہے۔ وہ نصوص شرعیہ جن میں ایمان کی کمی بیشی

کا ذکر وارد ہے وُہ سب ایمانِ کامل پر محمول ہیں یا وُہ کمی بیشی مؤمن بہ کے اعتبار سے مُراد ہے جو نزول وحی کے زمانے میں متحقق تھی اب متصور نہیں۔ اِسی طرح وہ احادیث جن میں نفسِ ایمان رکھنے والے افراد سے مومن ہونے کی نفی مذکور ہے سب ایمان کامل کے معنی پر محمول ہیں۔ اگر اعمالِ صالحہ کو نفس ایمان کا جزو تسلیم کیا جائے اور صدورِ معصیت کو نفس ایمان کے منافی قرار دیا جائے تو معتزلہ اور خوارج کے مذہب کی تائید ہوگی اور بے شمار نصوصِ شرعیہ کا خلاف لازم آئے گا۔ مثلاً "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ" بیشک اللہ تعالیٰ شرک کو نہیں بخشتا اور اس کے سوا جسے چاہے بخش دیتا ہے۔ معتزلہ و خوارج کا اپنے مذہب کی تائید میں آیت کریمہ "وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا۔ الآیۃ سے استدلال دو وجوہ سے باطل ہے۔ ایک یہ کہ "جَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ" کے معنی ہیں "اِنْ جَازَاهُ" مومن کے قاتل عمد کو اگر اللہ اُس کے اس گناہ کا بدلہ دے تو وہ خلود فی النار ہے۔ لیکن سورۂ فرقان کی یہ آیت "اِلَّا مَنْ تَابَ" اور سورۂ نساء کی آیت ۴۸، ۱۱۶ "وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ" دونوں اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ اس کو یہ بدلہ نہیں دے گا۔ دُوسرا یہ کہ خلود سے طویل مُدت تک دوزخ میں رہنا مُراد ہے، ہمیشگی مراد نہیں۔ رہا یہ امر کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ اس کی توبہ نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ عبداللہ بن عباس سے اس کے خلاف بھی روایت ہے کہ اِس کی توبہ مقبول ہوگی۔ اس کے علاوہ پہلی تاویل "جَزَآؤُهٗ" بمعنی ان جازاہ بھی عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے اور ان کا قولِ اوّل تشدید و تغلیظ پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے[1]۔

قوت و ضعفِ ایمان: کمی بیشی چونکہ مقدار سے متعلق ہے اس لئے وُہ نفس ایمان میں نہیں پائی جاتی۔ البتہ قوت و ضعف جو از قبیلِ کیفیت ہے نفسِ ایمان میں ضرور پایا جاتا ہے۔ اور اِس اعتبار سے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام، صدیقین، شہداء، صالحین، اولیاء کاملین و عامۃ المؤمنین کے ایمان میں حسب درجات تفاوت حقیقتِ ثابتہ ہے جو محتاج بیان

نہیں۔ محدثین نے ایمان کی زیادت و نقصان پر جو کلام کیا ہے اس سے نفس ایمان مُراد نہیں کمال ایمان ہی مُراد ہے جو اعمال صالحہ کی کمی بیشی کے اِعتبار سے کم و بیش ہوتا ہے۔

اسلام اور ایمان : اِسلام کے لغوی معنی انقیاد ظاہری ہیں یعنی جسمانی ظاہری اعضا سے طاعت بجالانا اور اسلام شرعی میں ایمان کے معنی معتبر ہیں۔ اہلِ سُنّت کا مسلک ہے "الاسلام والایمان واحد" فرق صِرف اتنا ہے کہ اصل ایمان صِرف تصدیقِ قلبی ہے اور اسلام میں تصدیقِ قلبی کے ساتھ احکامِ شرعیہ کا بجالانا اور انقیادِ ظاہری بھی معتبر ہے۔ آیت کریمہ: "قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ" (حجرات، آیت ۱۴) میں چونکہ ایمان کی نفی ہے اس لئے یہاں اِسلام سے اسلام لغوی بمعنی استسلام مُراد ہے اور آیت کریمہ "اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ" (آل عمران آیت ۱۹) اور "اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (سورہ انعام، آیت ۱۶۳)، اور "هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (سورۂ الحج، آیت ۷۸) میں لفظ اِسلام۔ اسلام شرعی کے معنی میں ہے یعنی ایمان مع الانقیاد الظاہری۔ امام بُخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایمان کی زیادت اور نقصان کی بحث میں ایمان، اِسلام، دین، تقویٰ اور ہُدیٰ کو تقریباً مترادف قرار دے کر ان سب نصوص سے استدلال کیا ہے جن میں ان کی زیادت و نُقصان کا ذکر ہے۔ اُنہوں نے اصلِ ایمان میں زیادت و نُقصان کو ثابت نہیں کیا بلکہ کمالِ ایمان میں زیادت و نقصان ثابت کر کے خوارج، معتزلہ، کرامیہ اور مرجیۂ ضالہ کا رد فرمایا ہے۔ ورنہ لازم آئے گا کہ اُنہوں نے خوارج اور معتزلہ کے مذہب کی تائید کی ہو حالانکہ امام بُخاری اور دیگر اجلّہ محدثین اس سے پاک ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ : ایمان کی حقیقت تصدیقِ قلبی ہے جو محض فعلِ قلب ہے اور قلب انسان کے اختیار میں نہیں حدیث شریف میں ہے۔ "لَيْسَ اٰدَمِيٌّ اِلَّا وَقَلْبُهٗ بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ اللّٰهِ" (جامع ترمذی، جلد ۲، ص ۱۹۰) قلب اِنسانی جب انسان کے اِختیار میں نہیں تو اس کا فعل بھی اِنسانی اِختیار سے باہر ہوگا اور غیر اختیاری فعل کا مکلف

ہونا۔ "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔" کے خلاف ہے۔ ایسی صورت میں "امنوا" فرما کر بنی اسرائیل کو ایمان لانے کا مکلف فرمانا کیوں کر صحیح ہوگا۔؟ اس کا جواب یہ ہے کہ صرف قلب ہی نہیں بلکہ انسان کا ہر جزو اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے قلب کی خصوصیت صرف اس بنا پر ہے کہ باقی تمام اعضا قلب کے تابع ہیں۔ انسان اور اُس کے قلب کا اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہونا انسان کے اس اختیار کی نفی نہیں کرتا جو اللہ تعالیٰ نے خلقۃً انسان کو عطا فرمایا ہے اور جو شرعاً مدارِ تکلیف ہے ورنہ انسان اور جماد میں کوئی فرق نہ رہے گا جو بداہتہً باطل ہے۔ فعلِ قلب کا انسان کے اختیار میں ہونا امرِ بدیہی ہے جو محتاجِ دلیل نہیں۔ البتہ بطور تنبیہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح تصدیق فعلِ قلب ہے اسی طرح نیت اور قصد بھی فعلِ قلب ہے اور ظاہر ہے کہ نیت اور قصدِ قلب انسان کے اختیار میں ہے مثلاً انسان کو اختیار ہے کہ کوئی نیک کام بقصدِ رضائے الٰہی کرے یا صرف لوگوں کو دکھانے کے لئے۔ یہی نیت اور قصدِ قلب عبادات کی اصل ہے بغیر نیت کے نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، روزہ رکھنا، حج کرنا عبادت نہیں اور نیتِ عبادت کے ساتھ یہ سب کام عبادت ہیں۔ جس طرح یہ نیت اور قصد انسان کے اختیار میں ہے اسی طرح تصدیق قلبی بھی انسان کے دائرہ اختیار میں داخل ہے۔ البتہ بعض کیفیات غیر اختیاری بھی ہوتی ہیں جیسے طبعی محبت کہ بے اختیار کسی کی طرف دل مائل ہو جائے جس کی بیویاں ایک سے زیادہ ہوں بسا اوقات اس کا دل غیر اختیاری طور پر کسی ایک بیوی کی طرف زیادہ مائل ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی مواخذہ نہیں۔ البتہ حقوق کی ادائیگی میں مساوات قائم نہ رکھنا ضرور موجب مواخذہ ہوگا۔ کیوں کہ یہ امر اختیاری ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کا دل امرِ حق کو قبول نہیں کرتا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عقلِ سلیم سے انہوں نے صحیح طور پر کام نہیں لیا اور اس وجہ سے شیطان کو ان پر غلبہ پانے کا موقع مل گیا۔ اگر وہ عقل سلیم سے کام لیں تو یقیناً انہیں شیطانی اثرات سے نجات مل سکتی ہے اور حق ان پر واضح ہو سکتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے تدبر و تفکر کی دعوت دی ہے۔

اور عقلِ سلیم سے کام لینے کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قائم کئے ہوئے دلائل آفاقی و انفسی میں صحیح طور پر غور و فکر کیا جائے تو ممکن نہیں کہ ان پر حق واضح نہ ہو اور اسے قبول کرنے کے لئے ان کا دل آمادہ نہ ہو جائے البتہ جو لوگ انتہائی کفر و طغیان اختیار کر کے اپنی سب صلاحیتوں سے یکسر محروم ہو گئے وہ "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ" کے مصداق ہیں جو اُن کی اپنی اختیاری سرکشی اور کفر و طغیان کا نتیجہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ تصدیقِ قلبی غیر اختیاری اُمور سے نہیں بلکہ نیت اور قصدِ قلبی کی طرح اُمورِ اختیاریہ سے ہے اسی لئے یہود کو "اٰمِنُوْا" فرما کر ایمان لانے کا حکم دیا گیا۔

بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ۔ "مَآ اَنْزَلْتُ" سے قرآن مجید مراد ہے یعنی اے اہلِ کتاب اس قرآن پر ایمان لاؤ جو اس چیز کا مصدق ہے۔ جو تمہارے پاس اصل توراۃ و انجیل سے ہے تفسیر ابن کثیر میں ہے مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (ج: ۱ ص: ۸۳) یعنی "قرآن (اصل) توراۃ اور (اصل) انجیل کی تصدیق کرتا ہے" یہی نہیں بلکہ وہ تمام کتبِ الٰہیہ کا مصدق ہے تفسیر مظہری میں ہے لِمَا مَعَكُمْ مِنَ الْكُتُبِ الْاِلٰهِيَّةِ التَّوْرٰىةِ وغيرها" (جلد: ۱، ص: ۶۱) یعنی قرآن تمام کتبِ الٰہیہ (آسمانی کتابوں) کی تصدیق کرتا ہے توراۃ ہو یا انجیل یا ان کے علاوہ اور کوئی آسمانی کتاب۔

اہلِ کتاب کا اعتراض: یہود و نصاریٰ کہا کرتے ہیں کہ قرآن اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر چیز کے مصدق ہیں جو اُن کے سامنے اور اہلِ کتاب کے ساتھ ہے۔ قرآن میں بار بار کہا گیا ہے "مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ" "مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ" اگر توراۃ و انجیل کو محرّف کہا جائے تو اس کی تصدیق کیونکر ہو سکتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید ہر اس چیز کی تصدیق نہیں کرتا جو اہلِ کتاب کے پاس اور اُن کے ساتھ ہے بلکہ صرف اسی چیز کی تصدیق کرتا ہے جو اُن کے پاس اصل توراۃ اور اصل انجیل سے ہے جیسا کہ سورۃ المائدہ پ ۶ آیت ۴۸ میں ہے وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ

بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ" اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے حق کے ساتھ آپ کی طرف یہ کتاب اُتاری تصدیق کرتی ہوئی اس چیز کی جو اس کے سامنے ہے کتاب سے یہاں لفظ "ما" ذوالحال ہے اور لفظ "مِنَ الْكِتَابِ" اس سے حال (الاُمامن بہ الرحمٰن ج:۱، ص:۲۱) ذوالحال، حال کی قید کے ساتھ مقید ہوتا ہے یعنی قرآن جس چیز کی تصدیق کرتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کی کتاب سے ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ "لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ" میں لفظ "ما" کا بیان "مِنَ الْكِتَابِ" ہے (روح المعانی طبع دیوبند۔ پ:۶، ص:۱۱) یعنی قرآن مجید جس چیز کی تصدیق کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ عام اس سے کہ وہ پوری کتاب ہو یا اس کا کچھ حصہ۔ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ اصل کتاب کے علاوہ یہود و نصاریٰ کی جو تحریفات ہیں قرآن مجید کا ان کی تصدیق کرنا قرآن مجید کے کسی لفظ سے ثابت نہیں ہوتا۔

وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ: لغت میں کفر کا معنی ہے "ستر النعمۃ والتغطیۃ" یعنی نعمت کو چھپانا اور ڈھانپ دینا۔ شرع میں کفر ایمان کی ضد ہے (مظہری ج:۱، ص:۲۲، قرطبی، ج:۱، ص:۱۸۳) لفظ کفر کا اطلاق کبھی لغوی معنی پر ہوتا ہے کبھی شرعی معنی پر نصوص شرعیہ میں کفر حقیقی کے علاوہ بعض اعمال معصیت کے لیے بھی لفظ کفر وارد ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سِبَابُ الْمُؤْمِنِ فُسُوقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ (بخاری، ج:۲، ص:۸۹۳) کفرِ عملی قابلِ مغفرت ہے اور کفرِ اعتقادی (حقیقی) قابلِ مغفرت نہیں نیز کفرِ لزومی اور کفرِ التزامی، کفرِ فقہی اور کفرِ کلامی کی اصطلاحات اور ان کے احکام کا تفاوت بھی کتب فقہ و کلام میں مشہور و متعارف ہے۔ توحید یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول کا لایا ہوا کوئی اور ایسا امر جس کی تصدیقِ قلبی پر بندے کا مؤمن ہونا موقوف ہو اسے دل سے سچا ماننا حقیقت ایمان ہے۔ خواہ بوجہ اکراہ وہ زبان سے تکذیب ہی کیوں نہ کرے۔ "إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ" اور دل سے اس کی تکذیب حقیقتِ کفر ہے خواہ زبان سے اقرار ہی کیوں نہ کرتا ہو۔ "وَلَٰكِن مَّن شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللَّهِ" بعض علما نے کفرِ اعتقادی کی چار قسمیں بیان کی

ہیں۔ اگر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسُول ہونے کی معرفت نہ ہو اور تصدیقِ قلبی بھی نہ پائی جائے اُس وقت زبان سے انکار کرنا کفرِ انکاری ہے۔ اگر معرفت ہے مگر تصدیقِ قلبی نہیں تو زبان سے انکار کرنا کُفرِ جحودی ہے۔ اگر زبان اور دل کا اِنکار رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت سے دُشمنی اور عناد پر مبنی ہے تو کُفرِ عنادی ہے اور دِل سے رسُول کی تکذیب کر کے زبان سے اقرار کرنا کُفرِ نفاقی ہے۔ فرمانِ الٰہی "وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ" کا مطلب یہ ہے کہ تُم اہلِ کتاب ہو آسمانی کتابیں تمہارے پاس موجُود ہیں جنہیں تُم پڑھتے ہو تُم خُوب جانتے ہو کہ نبی آخرالزمان کے جو اوصاف توراۃ و انجیل میں پائے جاتے ہیں ان کا مصداق حضرتِ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی نہیں جن پر قُرآن کریم نازل ہُوا جو اُن کی رسالت کی روشن دلیل ہے اور خُود ان کی ذات گرامی قُرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کی برہان قاطع ہے۔ ایسی صُورت میں قرآن اور صاحبِ قُرآن پر سب سے پہلے ایمان لانا تمہارا فرض تھا مگر تُم نے اس کا انکار کیا لہٰذا پہلے کافر تُم ہی قرار پائے۔ تمہیں چاہیئے کہ اپنی آسمانی کتابوں کی روشنی میں اِس حقیقت کو تسلیم کرو اور حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو مان کر قُرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے پر ایمان لاؤ اور پہلے کافر نہ بنو۔ بعض مفسرین کے نزدیک "بہ" کا مرجع قرآن ہے اور ابو العالیہ، حسن بصری، سدی اور ربیع بن انس کے نزدیک اس کا مرجع رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا۔ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے بدلے میں تھوڑی قیمت لینے کی جو ممانعت وارد ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ زیادہ قیمت لینا جائز ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے مقابلے میں ساری دُنیا کا مال و دولت قلیل و حقیر ہے اس لیئے اگر سونے چاندی کے خزانے بھی لے لیئے جائیں تو وُہ سب قلیل ہی قرار پائیں گے۔ کیونکہ وُہ سب فانی ہیں اور آیاتِ الٰہیہ اور اُن کے منافع ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں۔ اہلِ کتاب کے مذہبی پیشواؤں کا طریقہ یہی ہو گیا تھا کہ وُہ اُجرت لے کر لوگوں کو دین کی تعلیم دیتے تھے حالانکہ ان کی کتابوں میں لکھا تھا کہ اے ابنِ آدم تو لوگوں کو مُفت بلا اُجرت

دین سکھا جس طرح تجھے بغیر کسی اُجرت کے مفت دین سکھایا گیا۔ نیز وُہ لوگوں کو خُوش کرتے اور اپنے دنیوی مفادات کے لیئے اللہ کی کتاب اور اُس کی آیات میں ردّ و بدل کر کے احکامِ الٰہیہ کو چُھپا لیتے تھے، حق کو باطل کے ساتھ ملاتے اور اپنی نفسانی خواہشات کو پُورا کرنے میں دین فروشی سے ذرّہ بھر دریغ نہ کرتے ان کے دل اللہ تعالیٰ کے خوف سے خالی اور حُبِّ دُنیا سے لبریز تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی سخت مذمّت فرمائی اور اِس طرح مُسلمانوں کو اُن کی راہ پر چلنے سے روکا۔

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے قُرآن مجید کو کسی دُنیاوی مفاد کا عوض کبھی قرار نہیں دیا۔ البتہ مُسلمان مَردوں اور عورتوں کے لیئے قُرآن یاد کرنے کو اُن کی فضیلت کا معیار بنایا۔ قرآن پڑھنا اور اس کا یاد کرنا عبادت ہے۔ عبادت کے بدلے دُنیا کا کوئی نفع حاصل کرنا جائز نہیں۔

بُخاری کی حدیث کے مطابق سفر کے موقع پر صحابہؓ کے ایک گروہ کا ایک قبیلے کے سردار پر جسے بچھو نے کاٹا تھا سُورۃ فاتحہ دم کر کے تیس بکریاں لینے سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُنہوں نے اللہ کی آیتوں کو بیچا بلکہ اُنہوں نے عِلاج کی اُجرت وصُول کی اور علاج کے لیئے دم کرنے کی نیت سے سُورۃ فاتحہ پڑھی (بخاری، ج: ۱، ص: ۳۴۴ اور ج: ۲، ص: ۸۵۴)۔ سُورۃ فاتحہ کا نام سُورۃ رُقیہ بھی اِسی لیئے ہے کہ علاج کے لیئے دم کرنے کی نیت سے اس کا پڑھنا جائز ہے اس تلاوتِ فاتحہ میں عبادت مقصُود نہ تھی۔ لہٰذا واضح ہو گیا کہ قبیلے کے سردار پر صحابہ کا سُورۃ فاتحہ دم کر کے تیس بکریاں لینا اللہ کی آیتوں کو بیچنا نہ تھا محض علاج کی اُجرت حاصل کرنا تھا۔

کتاب اللہ کی تعلیم اور دین کی تبلیغ، طاعت و عبادت ہے۔ جس پر اُجرت لینا قطعاً جائز نہیں قُرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ" (سورۃ الانعام ۹۱) یعنی اے محبُوب محمّد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم! فرما دیجئے میں

اس پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا یہ تو تمام جہانوں کے لیے نصیحت ہی ہے۔ شرائع سابقہ میں سے بھی کسی شریعت میں یہ اُجرت جائز نہ تھی۔ قرآن مجید میں ہے نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام، صالح علیہ السلام، لوط علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام سب نے یہی کہا۔ "وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" (سورۃ الشعرا: ۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴، ۱۸۰) یعنی میں اس پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا۔ میرا اجر اللہ رب العلمین ہی پر ہے۔ احادیث نبویہ سے بھی تعلیم قرآن پر کچھ لینا ناجائز ثابت ہوتا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اُنہوں نے فرمایا۔ میں نے اہلِ صفہ کے کچھ لوگوں کو قرآن سکھایا تو اُن میں سے ایک شخص نے بطورِ ہدیہ مجھے ایک کمان بھیجی۔ میں نے کہا یہ کوئی خاص مال نہیں اور میں اللہ کی راہ میں اِس سے تیر اندازی کروں گا۔ میں نے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اگر تو چاہتا ہے کہ تجھے آگ کا طوق پہنایا جائے تو اسے قبول کرلے۔ رواہ ابوداؤد وابن ماجہ والحاکم فی المستدرک وقال صحیح الاسناد (مشکوٰۃ، ص: ۲۵۸، مستدرک۔ ج: ۲، ص: ۳۵۶)

امام بدرالدین عینی نے بحوالہ ابن ابی شیبہ حضرت عبدالرحمٰن بن شبل رضی اللہ عنہ کی بھی ایک حدیث نقل کی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن شبل نے فرمایا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا کہ تم قرآن سیکھو اور اُس کے عوض کچھ نہ کھاؤ (عمدۃ القاری ص: ۱۸۷، ج: ۱۰)

کتاب وسُنّت کی تعلیم اور تبلیغِ دین پر کسی صحابی نے کبھی کوئی اُجرت نہیں لی۔ اسلافِ کرام و تابعین نے اس اُجرت کو ناجائز قرار دیا۔ امام عینی نے عبداللہ بن شقیق، الاسود بن ثعلبہ، ابراہیم نخعی، عبداللہ بن زید، شریح القاضی اور حسن بن حی سب کو قائلین عدم جواز میں شمار کیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب بھی عدم جواز ہی نقل کیا (عمدۃ القاری

ج: ۱۰، ص: ۱۸۶، ۱۸۷)۔ علامہ ابن عابدین شامی نے اجماع اور قیاس سے بھی اس کے عدم جواز پر استدلال فرمایا (رسائل ابن عابدین، ص: ۱۸۲) اس کے باوجود متاخرین فقہاء نے بر بنائے ضرورت اس کے جواز کا قول کیا۔ غور و تامل کے بعد یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ متقدمین اور متاخرین کا یہ اختلاف نزاع لفظی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ متقدمین نے طاعت و عبادت اور قربت پر اُجرت لینے کو ناجائز قرار دیا اور متاخرین نے بلا نیت ثواب محض تعلیم قرآن اور تدریس علوم دینیہ کے فعل پر جواز اُجرت کا قول کیا اور ظاہر ہے کہ قربت و ثواب کی نیت کے بغیر کوئی فعل طاعت و عبادت قرار نہیں پاتا۔ لہٰذا دونوں میں حقیقی نزاع نہیں پایا گیا اسی لئے میت کو ثواب پہنچانے کے لئے اجرت پر قرآن پڑھنا بالاتفاق ناجائز ہے اور بلا اُجرت حسبۃً للہ قرآن پڑھنے کا ثواب ضرور میت کو پہنچتا ہے۔

وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ : بنی اسرائیل کے اذہان مسخ اور ان کے قلوب سخت ہو چکے تھے خصوصاً ان کے علماء خوفِ خدا سے ناآشنا ہو کر صرف لوگوں سے ڈرتے تھے اُنہیں اپنی ریاست کے زوال اور دنیوی منافع کے ضیاع کا خطرہ لاحق رہتا تھا اسی لئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کو چھپاتے اور احکام میں تغیر و تبدل کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر تشدید فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ حبِ جاہ اور خواہشاتِ نفس کے پیشِ نظر لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ فلاحِ اُخروی اور ابدی نعمتوں کی خاطر مجھ سے ڈرو۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور حق سے باطل کو نہ ملاؤ اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ ﴿۴۲﴾

۴۶ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ : حق کے معنی ہیں "الثابت" باطل اس کی نقیض ہے یعنی غیر ثابت۔ کسی سبب کے ساتھ بتقاضائے حکمت شئ کے ایجاد کرنے والے کو حق کہتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا نام حق ہے۔ قرآن مجید میں ہے "ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ" (الحج: ۶) اور بر بنائے حکمت ایجاد کی ہوئی شئ کو بھی حق کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے "وَاِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ" (البقرہ: ۱۴۹) کوئی شی فی نفسہٖ جیسی ہے اس کے مطابق اس شی کے متعلق اعتقاد رکھنے کو بھی حق کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ" (البقرہ: ۲۱۳) اس قول و فعل کو بھی حق کہا جاتا ہے جو اسی طرح واقع ہو جیسا واجب ہے اسی قدر ہونا واجب ہے اور اسی وقت میں ہو جس وقت میں واجب ہے۔ جیسے۔ فِعْلُكَ حَقٌّ وَقَوْلُكَ حَقٌّ" (مفردات امام راغب ص ۱۲۴)

حق ایسے کلام کو بھی کہتے ہیں جس میں کلام کے لئے واقع کی مطابقت کا اعتبار کیا جائے اور صدق کے معنی میں بھی لفظ حق مستعمل ہے اور حق اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو کسی کے لئے کسی کے ذمہ ہو۔

آیت کریمہ میں لفظ "حق" سے مراد باطل کی نقیض ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت اور نعت پاک جو تمہاری کتابوں میں حق اور ثابت ہے اسے ان غیر ثابت یعنی باطل امور کے ساتھ نہ ملاؤ جو تم اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ثابتہ کی نفی کرتے ہو۔

اگر اس مقام پر یہ اشکال وارد کیا جائے کہ لبید شاعر نے اپنے کلام "اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ" میں اللہ کے سوا ہر چیز کو باطل کہا اور متفق علیہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اس کلام کو پسند فرمایا (بخاری، ج: ۱، ص: ۵۴۱، ج: ۲، ص: ۹۰۸، مسلم، ج: ۴، ص: ۱۷۶۸ طبع مصر علاوہ ازیں امام احمد نے اپنی مسند میں اور امام ابن ماجہ نے بھی اپنی سنن میں اس حدیث کو روایت کیا) تو گویا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اللہ کے سوا ہر چیز کو غیر ثابت قرار دیا جب کہ اللہ تعالیٰ کی ایجاد فرمودہ اشیاء ثابت ہیں اور اہل سُنّت کا مذہب ہے۔ "حَقَائِقُ الْاَشْیَاءِ ثَابِتَۃٌ"۔

اس کا حل یہ ہے کہ بے شک ہر چیز ثابت ہے مگر کسی چیز کا ثبوت، ذاتی اور مستقل نہیں۔ اس شعر کا اگلا مصرعہ ہے "وَکُلُّ نَعِیْمٍ لَا مَحَالَۃَ زَائِلٌ" جو چیزیں زائل ہو جانے والی اور فنا پذیر ہوں ان کا وجود تو موجد کی ایجاد اور اس کی مشیت و ارادہ کے تحت ہی ہے مستقل نہیں۔ وجود مستقل صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کو بالاستقلال غیر ثابت ماننا اور وجود مستقل کی نفی کرتے ہوئے "لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ" کہنا عین حق ہے۔ وَفِیْہِ لُمْعَۃٌ اِلٰی وَحْدَۃِ الْوُجُوْدِ۔

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: یعنی تم جانتے ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت و نعت حقیقتِ ثابتہ ہے جو تمہاری آسمانی کتابوں میں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی۔ جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ تمہاری یہ حق پوشی شدید ترین کفر عنادی ہے۔ اس سے باز آؤ اور ما انزل اللہ پر ایمان لا کر مسلمان ہو جاؤ۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ
وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ﴿۴۳﴾

اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو[۴۷]

۴۷ وَاَقِیْمُوْا: یہاں لفظ "اَقِیْمُوْا" خاص طور پر اس امر پر متنبہ کرنے کے لئے ارشاد فرمایا گیا کہ نماز پڑھنے کا مقصد اس کے حقوق و شرائط کو پورا کرنا ہے یہ نہیں کہ نماز کی صرف حرکات و سکنات کو ادا کر دیا جائے بلکہ نماز کا اہتمام اس طرح کیا جائے

کہ نماز سے متعلق جتنے اُمور ہیں ان سب کی مکمل رعایت ہو مثلاً مساجد ہوں۔ اذانیں ہوں جماعت کا انتظام ہو۔ ہر مُسلمان ادب، خشوع اور خضوع کے ساتھ نماز کا پابند ہو اور صلوٰۃ کا نظام اِس طرح مستحکم ہو جائے کہ اِس میں ضعف و خلل کو راہ نہ مِلے۔ صِرف نماز پڑھ لینے سے اس حکم کی تعمیل نہیں ہو سکتی بلکہ حقُوق و شرائطِ مذکورہ کے ساتھ نماز کی پابندی کرنا اقامۃ الصلوٰۃ کے حُکم پر عمل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ چُنانچہ مروی ہے "اِنَّ الْمُصَلِّیْنَ کَثِیْرٌ وَالْمُقِیْمِیْنَ لَهَا قَلِیْلٌ" یعنی نماز پڑھنے والے بہت ہیں لیکن نماز قائم کرنیوالے تھوڑے۔

الصَّلٰوۃ: لُغت میں الصلوٰۃ کے معنی دُعا ہیں اور شرع میں ایک خاص عبادت کو "الصلوٰۃ" کہتے ہیں جو ہیئت مخصُوصہ کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ اِس کا نام "الصلوٰۃ" اِس لئے رکھا گیا کہ دُعا اس کا جزو اعظم ہے۔ اس عبادت مخصُوصہ کا نام دُعا از قبیل تسمیۃ الکل باسم الجزء ہے یعنی کل کو جزء کے نام سے تعبیر کیا گیا۔ حدیث شریف "اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ" اسی حقیقت کا بیان ہے۔ صلوٰۃ سے دُعا کو خارج کر دینا ایسا ہے جیسے ہڈی سے مغز کو نکال دینا۔ ایک اور حدیث میں وارد ہے "اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ" یعنی دُعا ہی عبادت ہے۔ اِس حدیث کے یہ معنی نہیں کہ عبادت مطلقاً دُعا میں منحصر ہے کہ دُعا کے علاوہ کوئی چیز عبادت ہی نہیں بلکہ یہاں الف لام عہدی ہے اور دُعا سے وُہ خاص دُعا مُراد ہے جو صلوٰۃ کا جُزو اعظم ہے جس پر نماز کا عبادت ہونا موقوف ہے۔ اگر وہ دُعا نہ ہو تو نماز عبادت قرار نہ پائے۔

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ: زکوٰۃ کے اصل معنی زیادت اور طہارت ہیں۔ زکوٰۃ زیادۃ برکت اور طہارت کا مُوجب ہے جس مال کی زکوٰۃ ادا کی جائے اِس میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے برکت ہوتی ہے۔ وُہ بڑھتا ہے اور اس میں پاکیزگی آتی ہے۔ زکوٰۃ فرض ہونے کے بعد زکوٰۃ نہ دینا مال میں ناپاکی اور خبث پیدا ہونے کا موجب ہے۔ زکوٰۃ

دینے سے صرف مال ہی پاک نہیں ہوتا بلکہ زکوٰۃ دینے والا بھی گناہ اور بخل سے پاک ہو جاتا ہے۔ زکوٰۃ دینے کے سبب اس میں صفتِ کرم اور سخاوت پیدا ہو کر اسی طرح بڑھتی رہتی ہے جس طرح مال بڑھتا ہے۔ قرآن مجید میں ستر سے زیادہ مقامات پر صلوٰۃ کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر ہوا۔ ان دونوں میں بوجوہ کثیرہ مناسبت پائی جاتی ہے لیکن وصف طہارت میں ان دونوں کی مناسبت نہایت قوی ہے جس طرح نماز ظاہری اور باطنی پاکیزگی کا موجب ہے اسی طرح زکوٰۃ بھی طہارتِ نفس اور پاکیزگیٔ اخلاق کا سبب ہے بشرطیکہ صحیح معنیٰ میں ان کی ادائیگی عمل میں آئے۔

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ : یعنی رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو لغت میں رکوع کے معنی ہیں خشوع، خضوع، دولت مندی کے بعد مفلس ہونا۔ بڑھاپے کی وجہ سے کمر کا جھک جانا۔ پھسلنا، گرنا، مرتبہ میں کمی آنا، تنزل ہونا، بت پرستی سے نفرت کرنا، تواضع اور انکساری کے ارادہ سے سر کا جھکانا اور عبادت کی نیت سے کمر کو دہرا کرنا (لسان العرب ج: ۸، ص: ۱۳۳) شرع میں لفظ رکوع حسب ذیل معانی میں مستعمل ہے۔ نماز، نماز کی جماعت، خشوع، خضوع، حسنِ انقیاد، تکبر کا ترک کرنا، ارکانِ صلوٰۃ، ثوابِ جماعت، سجدہ، عبادت، جزء نماز اور انحنا یعنی جھکنا۔ وَمِنَ الرُّكُوْعِ بِمَعْنَى الْخُضُوْعِ قَوْلُهٗ تَعَالٰى وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ. (شیخ زادہ علی البیضاوی، ج: ۱، ص: ۲۹۱، طبع رحیمیہ) احادیثِ نبویہ میں لفظ رکوع کے لئے یہ سب معانی وارد ہیں (مجمع بحار الانوار ج: ۲، ص: ۳۴) (کامل) شرعی رکوع یہ ہے کہ آدمی اپنی پیٹھ اور گردن کو جھکاؤ میں ہموار رکھے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو کھلا رکھ کر اپنے دونوں گھٹنوں کو پکڑے پھر اسی حالت میں اتنی دیر رہے کہ بدن میں اطمینان آجائے۔[1] رکوع نماز کا جزو ہے۔ آیت کریمہ میں پوری نماز کو رکوع سے تعبیر فرمانا تسمیۃ الکل باسم الجزء کے قبیل سے ہے۔ نماز کے اجزا میں قیام، قعود اور سجود بھی شامل ہیں لیکن

یہاں رکوع کی تخصیص اور اس کے ساتھ "مَعَ الرّٰکِعِیْنَ" کی قید اس لئے ہے کہ مسلمانوں کی نماز یہود کی نماز سے ممتاز ہو جائے۔ کیونکہ ان کی نماز میں رکوع تھا نہ جماعت روح المعانی میں ہے۔ لَا رُکُوْعَ فِیْھَا۔ یہود کی نماز میں رکوع نہیں (پ: ۱، ص: ۲۲۶) عنایہ شرح ہدایہ میں ہے۔ وَالْجَمَاعَۃُ مِنْ خَصَائِصِ الدِّیْنِ فَاِنَّھَا لَمْ تَکُنْ مَشْرُوْعَۃً فِیْ دِیْنٍ مِنَ الْاَدْیَانِ (عنایہ بہامش فتح القدیر، ج: ۱، ص: ۳۰۰ طبع کوئٹہ) یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا اس دین یعنی شریعت محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے۔ کیونکہ پہلے کسی دین میں جماعت نہیں تھی۔ یہاں رکوع کی اس خصوصیت کی طرف بھی لطیف اشارہ ہے کہ اگر کوئی نمازی قیام میں امام کے ساتھ نہ مل سکا اور "وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ" کا مصداق ہو کر رکوع میں امام کے ساتھ شامل ہو گیا تو اس نے اس رکعت کو پا لیا۔ احادیث متعددہ سے یہ مسئلہ ثابت ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: "مَنْ اَدْرَکَ الْاِمَامَ رَاکِعًا فَرَکَعَ قَبْلَ اَنْ یَّرْفَعَ الْاِمَامُ رَاْسَہٗ فَقَدْ اَدْرَکَ تِلْکَ الرَّکْعَۃَ (بیہقی، ج: ۲، ص: ۹۰) یعنی جس نے امام کو رکوع میں پایا پھر اس کے سر اٹھانے سے پہلے اس نے رکوع کر لیا اس نے رکعت کو پا لیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ مَنْ لَمْ یُدْرِکِ الْاِمَامَ رَاکِعًا لَمْ یُدْرِکْ تِلْکَ الرَّکْعَۃَ (بیہقی، ج: ۲، ص: ۹۰) جس نے امام کے ساتھ رکوع نہ پایا اس نے وہ رکعت نہ پائی۔ یہ بات کہ "امام کے ساتھ رکوع پا لینا اس رکعت کو پا لینا ہے" ایسی نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بغیر سنے کوئی صحابی اپنی عقل سے کہہ دے اس لئے باتفاقِ محدثین صحابہ کی یہ موقوف حدیثیں حکماً مرفوع ہیں۔ متعدد احادیث مرفوعہ میں بھی صراحۃً وارد ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اگر تم امام کو رکوع میں پاؤ تو رکوع میں شامل ہو جاؤ اور اگر سجدہ میں پاؤ تو سجدہ میں شامل ہو جاؤ مگر رکوع میں شامل ہوئے بغیر محض سجدہ میں امام کے ساتھ شامل ہونے سے وہ رکعت شمار نہ ہوگی۔ اگرچہ ان مرفوع حدیثوں کو بعض علماء نے ضعیف کہا ہے مگر تعددِ طرق کے باعث انہیں تقویت حاصل

ہو جاتی ہے پھر احادیثِ صحیحہ موقوفہ بھی ان احادیث مرفوعہ کی مؤید ہیں۔ علاوہ ازیں احادیث صحیحہ مرفوعہ و موقوفہ میں وارد ہے کہ مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلٰوةِ فَقَدْ اَدْرَكَ الصَّلٰوةَ۔ جس نے نماز کی رکعت پائی تو بے شک اس نے نماز کر پالیا۔ اور۔ مَنْ اَدْرَكَ الرَّكْعَةَ فَقَدْ اَدْرَكَ السَّجْدَةَ۔ جس نے رکعت پالی (یعنی امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہو گیا) اس نے سجدہ پالیا (موطا مالک، ص: ۴۰، طبع مجتبائی دہلی) صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً مروی ہے۔ مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الصَّلٰوةِ مَعَ الْاِمَامِ فَقَدْ اَدْرَكَ الصَّلٰوةَ (ج: ۱ ص: ۲۲۱) جس نے امام کے ساتھ رکعت پالی اس نے نماز کو پالیا۔ نسائی میں مرسلاً وارد ہے۔ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنْ صَلٰوةٍ مِّنَ الصَّلَوَاتِ فَقَدْ اَدْرَكَهَا اِلَّا اَنَّهٗ يَقْضِيْ مَا فَاتَهٗ (نسائی۔ ج: ۱، ص: ۹۵، طبع قدیمی کتب خانہ) جس نے نمازوں میں سے کسی نماز کی رکعت کو پالیا اس نے اس نماز کو پالیا۔ مگر اس کی جو رکعتیں فوت ہو گئیں وہ انہیں قضا کرے گا۔ اگر ان تمام احادیث میں لفظ رکعۃ کے معنی رکوع ہوں اور لفظ صلوٰۃ سے پوری رکعت مراد ہو تو ان سب سے واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ جس نے امام کے ساتھ رکوع پالیا اس نے وہ رکعت پالی۔ لفظ رکعۃ کا استعمال رکوع کے معنی میں حدیث میں وارد ہے دیکھئے (مسلم، ج: ۱، ص: ۱۸۹) میں ہے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رَمَقْتُ الصَّلٰوةَ مَعَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَجَدْتُ قِيَامَهٗ فَرَكْعَتَهٗ فَاعْتِدَالَهٗ بَعْدَ رُكُوْعِهٖ فَسَجْدَتَهٗ فَجِلْسَتَهٗ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ قَرِيْبًا مِّنَ السَّوَاءِ۔ ..... میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو دیکھا تو میں نے حضور کا قیام، رکعت، اعتدال بعد رکوع، سجدہ، جلسہ بین السجدتین ..... تقریباً برابر پایا۔ اس حدیث میں رکوع کو لفظ رکعۃ سے تعبیر کیا گیا اور رکعت بول کر رکوع مراد لیا گیا ہے۔ اس لفظ رکعت بمعنی رکوع کے ساتھ یہ حدیث

مسند امام احمد بن حنبل (ج: ۴، ص: ۲۹۴) میں بھی موجود ہے۔

لفظ رکعت بمعنی رکوع نسائی میں اس زیادت کے ساتھ وارد ہے "اَلَا اَنَّہٗ یَقْضِیْ مَا فَاتَہٗ" یعنے امام کے ساتھ رکوع پالینے سے وُہ رکعت کو پالے گا۔ مگر اس کی جو رکعتیں فوت ہوگئیں اُنہیں قضا کرے گا۔ اگرچہ یہ زیادت مرسل ہے مگر فقہاء اُمت خصوصاً حنفیہ و مالکیہ کے نزدیک مراسیل معتبر ہیں اور رکعت کا صلوٰۃ ہونا تو اظہر من الشمس ہے۔ بنا بریں ان احادیث مرفوعہ صحیحہ سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امام کے ساتھ رکوع پالینا پوری رکعت کو پالینا ہے۔ جمہور علماء و فقہا کا مذہب بھی یہی ہے۔ احادیث منقولہ کی روشنی میں مذہب جمہور کے مطابق مقتدی کا امام کے ساتھ رکوع پاکر رکعت کو پالینا احناف کے اس قول کی بھی روشن دلیل ہے کہ امام کی قرأۃ حکماً مقتدی کی قرأۃ ہے۔ کیونکہ رکوع میں امام کو پانے والے نے حقیقۃً قرأۃ نہیں کی۔

نماز باجماعت: فرائض کی جماعت مَردوں کے لئے احناف کے نزدیک سُنّت مؤکدہ یعنی واجب کے قریب ہے۔ عیدین اور جُمعہ کی نماز کے لئے جماعت شرط ہے اور تراویح میں سُنّت کفایہ۔ ایک قول کے مطابق رمضان کے وتر میں جماعت مستحب ہے اور رمضان کے علاوہ وتر میں اور اِسی طرح نفل نماز میں بطور تداعی یعنے خاص اہتمام کے ساتھ مکروہ ہے (درمختار علی ہامش رد المحتار، ج: ۱، ص: ۴۰۸) محلّہ کی مسجد میں جہاں امام مقرر اور نمازی متعیّن ہوں اذان اور اقامت کے ساتھ تکرار جماعت مکرُوہ ہے ورنہ مکروہ نہیں (شامی، ج: ۱، ص: ۴۰۸) بعض اصحاب امام شافعی، امام احمد بن حنبل، داؤد، عطا ابُو ثور کے نزدیک فرض نماز کو باجماعت پڑھنا فرض عین ہے۔ ان کے نزدیک اگر کسی نے بلا عُذر تنہا نماز پڑھی تو جائز نہ ہوگی بعض دیگر علمائے شافعیہ نیز امام کرخی اور امام طحاوی فرائض کی جماعت کو فرض کفایہ کہتے ہیں بعض مشائخ حنفیہ کا قول ہے کہ واجب ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس مسئلہ میں چار قول ہیں۔ فرضِ عین، فرضِ کفایہ، واجب اور سُنّتِ مؤکدہ۔ اگر کہا

جائے کہ آیت کریمہ "وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ" سے جماعت کی فرضیت ثابت ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ "اِرْکَعُوْا" امر کا صیغہ وجوب کے لئے ہے یا استحباب کے لئے دُوسرا یہ کہ معیت سے معیت حقیقیہ یعنی جماعت مُراد ہے یا محض موافقت۔ یعنی رکُوع کرنے والوں کے موافق رکُوع والی نماز پڑھو لہٰذا اس آیت سے فرضیتِ جماعت پر استدلال صحیح نہیں۔ جن احادیث میں جماعت کی تاکید اور ترکِ جماعت پر تشدید و تہدید وارد ہے۔ ان سے وجوب پر استدلال کرنا بھی صحیح نہیں۔ ان سب احادیث سے جماعت کی تاکید اور اس کے ترک پر زجر و توبیخ مُراد ہے کیونکہ جماعت کی فضیلت میں جو حدیثیں وارد ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی شخص بلا عُذر تنہا نماز پڑھ لے تو گنہگار ضرور ہوگا مگر اس کی نماز ہو جائے گی۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صَلٰوةُ الْجَمَاعَةِ اَفْضَلُ مِنْ صَلٰوةِ الْفَذِّ بِسَبْعٍ وَعِشْرِيْنَ دَرَجَةً (مُسلم، ج: ۱، ص: ۲۳۱) جماعت کی نماز تنہا آدمی کی نماز سے ستائیس درجہ افضل ہے اور حضرت ابُو ہریرہ کی روایت ہے "صَلٰوةُ الْجَمَاعَةِ اَفْضَلُ مِنْ صَلٰوةِ اَحَدِكُمْ وَحْدَهٗ بِخَمْسَةٍ وَعِشْرِيْنَ جُزْءً" (مُسلم، ج: ۱، ص: ۲۳۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جماعت کی نماز تُمہارے اکیلے کی نماز سے پچیس حصہ فضیلت رکھتی ہے۔ تنہا نماز اگر جائز ہی نہ ہو تو پچیس یا ستائیس درجے فضیلت متحقق نہیں ہو سکتی۔ معلُوم ہُوا کہ بلا عُذر ترکِ جماعت کی معصیت کے باوجُود تنہا نماز پڑھنے والے کی نماز ہو جاتی ہے ورنہ جماعت کی نماز کا پچیس یا ستائیس درجے اس سے افضل ہونا (معاذ اللہ) بے معنی قرار پائے گا۔ صرف احناف نہیں بلکہ جمہُور عُلمائے اُمت مثلاً مالکیہ وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔ علامہ قرطبی نے بھی حضرت ابن عمر اور حضرت ابُو ہریرہ رضی اللہ عنہم کی ان حدیثوں کو اسی قول کی تائید میں پیش کیا ہے۔ (دیکھئے تفسیر قرطبی، ج: ۱، ص: ۲۵۰)

عورتوں کا جماعت میں حاضر ہونا: رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو ان کے مَردوں کی اجازت سے مسجدوں میں جانے اور جماعت میں حاضر ہونے کی اجازت دی تھی اور صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا تھا: "لَا تَمْنَعُوْا اِمَاءَ اللّٰهِ مَسَاجِدَ اللّٰهِ" (بخاری، ج: ۱، ص: ۱۲۳) یعنی اگر تمہاری عورتیں تم سے اجازت طلب کریں تو انہیں اجازت دے دو۔ اللہ کی باندیوں کو اللہ کی مسجدوں سے نہ روکو۔ یہ بات رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہدِ مُبارک میں فرمائی جب کہ عورتوں کے مسجدوں میں جانے کی وجہ سے بعد میں پیدا ہونے والے فتنوں کی طرح کسی فتنے کا اندیشہ نہ تھا اس کے بعد جب حالات تغیّر پذیر ہوئے اور فتنوں کا ظہور ہُوا تو عُلماء نے عورتوں کے مسجدوں میں جانے کو مکروہ سمجھا۔ جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے۔ لَوْ اَدْرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَحْدَثَ النِّسَاءُ لَمَنَعَهُنَّ الْمَسْجِدَ" یعنی عورتوں نے اس زمانے میں جو نئے طریقے اِختیار کر لیے ہیں اگر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو پالیتے تو اُنہیں مسجدوں میں جانے سے ضرور منع فرما دیتے۔ حضرت عُمر رضی اللہ عنہ بھی اِنہیں حالات میں فتنہ کے خوف سے عورتوں کے مسجدوں میں جانے کو مکرُوہ سمجھتے تھے چُنانچہ اُنہیں اپنی زوجہ حضرت عاتکہ رضی اللہ عنہا کا صُبح اور عشا کی جماعت میں جانا بہت ناگوار تھا۔ مگر چُونکہ اُنہوں نے حضرت عاتکہ سے اِسی وعدہ پر نکاح کیا تھا کہ میں تمہیں مسجد جانے سے نہ روکوں گا۔ اس لیے وُہ انہیں نہ روکتے تھے (حاشیہ بخاری، ج: ۱، ص: ۱۲۳) قسطلانی ج: ۲، ص: ۱۷۰)

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ

أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾

کیا لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو؟ اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تم نہیں سمجھتے؟۔ ۴۸ے

۴۸ے أَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ : یہ "استفہام" توبیخ یعنی جھڑکنے کے معنی میں ہے۔ یہاں علمائے یہود مخاطب ہیں حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا مدینہ منورہ میں بعض یہودی ایسے تھے جن کے قریبی رشتہ دار مسلمان ہو گئے تھے وہ ان سے کہتے تھے کہ جس دین کو تم نے اختیار کر لیا اسی پر قائم رہو اور محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہیں جو حکم دیتے ہیں اس کی تعمیل کرتے رہو۔ کیونکہ وہ جو کچھ فرماتے ہیں حق ہے۔ لوگوں کو اسلام پر قائم رہنے اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بجالانے کا مشورہ دیتے تھے لیکن خود اس پر عمل نہ کرتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں جھڑکا اور ان کی مذمت فرمائی کہ تم کیسے نالائق ہو۔ لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود نیکی نہیں کرتے۔ اس آیت کریمہ میں تَنْسَوْنَ کے معنی تَتْرُکُوْنَ ہیں یعنے اپنے آپ کو چھوڑ کر دوسروں کو نیکی کا حکم دینا نہایت مذموم ہے۔

وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ : توراۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت یعنی صدقِ نبوت کی علامتوں کا بیان موجود ہے اور اس میں حق سے عناد کی مذمت بھی کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حق کو چھپانے اور دوسروں کو نیکی کا حکم دے کر خود نیکی نہ کرنے کی ممانعت بھی مذکور ہے۔

أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ : کیا تم اپنی آسمانی کتاب کی روشنی میں اپنے اس مذموم طرزِ عمل کی قباحت نہیں سمجھتے اگر ایسا ہے تو پھر عقل و خرد کے مدعی کیوں بنے پھرتے ہو۔

سے مدد چاہنے کا مفہوم یہی ہے کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ پر ایمان لاکر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور ان کی تعلیمات کو دل سے سچا مان لو اور اس راہ میں تمہارے لئے جو رکاوٹیں ہیں ان کے دُور ہونے میں صبر و صلوٰۃ کے ذریعے قوت حاصل کرو۔ یہ قوت پیش آمدہ تمام مصائب و آلام اور شدائد و موانع کے مقابلے میں معاون ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ فرماکر قیامت تک پیدا ہونے والے مسلمانوں کے لئے اس ایمانی و روحانی قوت کے حصول کی راہیں کشادہ فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی قوتوں میں سب سے بڑی قوت ایمان ہے اگرچہ نفس ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی لیکن اعمالِ صالحہ کے بڑھنے سے ایمان کی قوت بڑھتی رہتی ہے۔ صبر اور صلوٰۃ اعمال صالحہ کی اصل رُوح اور اُن کی بنیاد ہیں۔ اعمال صالحہ کا بڑھنا کمال ایمان کا موجب ہے اور کمال ایمان ہی مومن کی قوت کا سرچشمہ ہے جس کے ذریعہ اوائل اُمت نے طاغوتی قوتوں کو نیست و نابود کرکے کُفر کو ذلیل کیا اور اسلام کی عظمت کے جھنڈے لہرائے۔ ارشاد خداوندی: "وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ" کے مطابق ان مسلمانوں نے کُفر کی مضبوط طاقتوں کے خلاف جو ظاہری اور مادی قوت تیار کی وہ بھی ان کی اسی ایمانی قوت کا مقتضیٰ تھا۔

وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ: نماز اور صبر جو مسلمانوں کی قوت کی بنیاد ہے ایمان والوں پر جن کے دل اللہ تعالیٰ کے لئے جھکے ہوئے ہیں اور وہ اپنے رب کی بارگاہ میں حاضری پر یقین رکھتے ہیں کس طرح شاق ہوسکتی ہے وہ تو ان لوگوں پر شاق ہے جو حقیقت ایمان سے محروم ہیں۔ تفسیر قرطبی میں ہے ایک قول کے مطابق آیت کریمہ میں صبر سے مُراد صوم ہے یعنی روزہ اور اِنَّھَا میں ضمیر منصوب کا مرجع لفظ صلوٰۃ بھی ہوسکتا ہے اس لئے کہ صلوٰۃ جامع العبادات ہے۔ اس میں صبر بھی شامل ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ ضمیر صبر اور صلوٰۃ دونوں کی طرف راجع ہے۔ لیکن صلوٰۃ اغلب ہے اس لئے بطور تغلیب اس کی رعایت فرمائی گئی جیسے "وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" میں وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا کی ضمیر ذہب وفضہ یعنی سونا اور چاندی دونوں کی طرف راجع ہے لیکن استعمالِ عام میں چاندی سونے پر غالب ہے اس لئے اس کی رعایت رکھی گئی (قرطبی۔ ج: ۱، ص: ۳۰۷، ۳۱)

اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ : یہاں ظن یقین کے معنی میں ہے مفرداتِ امام راغب میں ہے فَقَوْلُهٗ اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ۔ وَکَذَا۔ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا اللّٰہِ۔ فَمِنَ الْیَقِیْنِ۔ (ص ۳۱۹) یعنی ان دونوں آیتوں میں ظن بمعنی یقین ہے۔

اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ : یہاں دو تاویلیں ہیں ایک یہ کہ وہ اپنے رب کی جزا سے ملاقی ہوں گے۔ دوسری یہ کہ وہ اپنے رب سے ملاقی ہوں گے۔ (قرطبی، ج: ۱، ص: ۳۷۶) تفسیر مظہری میں ہے۔ ای معاینوہ یرونہ فی الآخرۃ (ج: ۱، ص: ۶۵) یعنی آخرت میں وہ اپنے رب کا دیدار کریں گے۔

وَاَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ : جن لوگوں کو یقین ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ان کے دل خشوع وخضوع اور عجز وانکساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے جھکے ہوئے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ ان کا رب کمال عدل وانصاف کے ساتھ ان کے اعمال کی انہیں جزا دے گا اپنی نعمتِ دیدار سے انہیں مشرف فرمائے گا۔ صبر وصلوٰۃ پر انہی لوگوں کو استقامت نصیب ہوتی ہے اور ان کا یہ یقین ان کے لئے صبر کی تلخی کو شیرینی سے بدل دیتا ہے وہی لوگ صلوٰۃ میں اپنے دل اور آنکھوں کی ٹھنڈک وراحت محسوس کرتے ہیں۔

یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ
الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ
عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۷﴾

اے اولادِ یعقوب یاد کرو میرا وہ انعام جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ (اس) زمانے والوں پر تمہیں بڑائی دی۔ ۵۰ھ

۵۰ھ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ : اہلِ کتاب جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی مادی اور رُوحانی نعمتیں عطا فرمائیں۔ نبوّت و رسالت اور کُتبِ سماویہ سے انہیں مشرف فرمایا جن کے وُہ خُود بھی مقر تھے بلکہ فخر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ان سب نعمتوں کا دعویٰ کیا کرتے تھے وہ عصیان و طغیان کی رَو میں بہہ گئے۔ نفسانی خواہشات کے سوا ان کے دِلوں میں کچھ نہ رہا خوف و خشیت الٰہیہ سے محروم ہو کر اللہ تعالیٰ کے تمام انعامات اور ہر فضل و احسان کو انہوں نے فراموش کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بار بار اپنی نعمتیں یاد دلائیں۔ اس آیت کریمہ میں بھی تذکیرِ نعمت کا اعادہ فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ: اے بنی اسرائیل ہم نے تمہیں سارے جہانوں پر فضیلت عطا فرمائی۔ سارے جہانوں سے مُراد یہاں ان کے اہلِ زمانہ ہیں۔ تفسیر مظہری میں ہے "اَیْ عَلٰی عَالَمِیْ زَمَانِهِمْ" (ج:۱، ص۶۶)۔ قرطبی میں ہے: "یُرِیْدُ عَلٰی عَالَمِیْ زَمَانِهِمْ وَاَهْلُ كُلِّ زَمَانٍ عَالَمٌ" (ج:۱، ص۳۳۰) یعنی ان کے زمانے کے عالَموں پر اُنہیں فضیلت دی۔ ہر زمانے کے لوگوں کو عالم کہا جاتا ہے۔ آیت کریمہ میں اگرچہ حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مُبارک کے اہلِ کتاب مخاطب ہیں لیکن مُراد ان کے آباء و اجداد ہیں۔ جو حضرت مُوسیٰ علیہ السّلام کے زمانے میں اور ان کے بعد تھے جنہوں نے اپنے دین میں کسی قسم کا تغیّر اور تبدّل کیا تھا نہ اللہ کی کتابوں میں کوئی تحریف کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے عطائے نبوّت و کتاب، علم و ایمان، اعمالِ صالحہ، بادشاہت، عدالت اور انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والسّلام کی مدد و نصرت و دیگر فضائل و مکارم کے ذریعہ ان کے زمانے کے سب جہان والوں پر انہیں فضیلت دی تھی۔ یہ نعمتیں مخاطبین کے حق میں اس لئے نعمت قرار پائیں کہ آباء و اجداد کی فضیلتیں اولاد کے حق میں موجبِ شرف ہوتی ہیں (مظہری)

ج ۱، ص: ۶۶) اس فضل و شرف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر حضور کی اتباع کریں اسی میں موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ کی اتباع ہے کیونکہ توراۃ کی اتباع میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا حکم موجود ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا حکم بھی یہی تھا کہ نبی آخر الزمان پر ایمان لاکر ان کی اتباع کی جائے۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ
عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ
وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور ڈرو اُس دن سے جب کوئی کسی کی طرف سے کچھ بدلہ نہ دے گا اور کسی کی طرف سے (اذنِ الٰہی کے بغیر) کوئی شفاعت قبول نہ کی جائے گی۔ اور نہ اُس سے کوئی فدیہ لیا جائے گا۔ اور نہ اُن کی مدد کی جائے گی۔ [۵۱]

---

[۵۱] وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ: تذکیر کے بعد اہل کتاب کو عذاب آخرت سے اپنے آپ کو بچانے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ آیت کریمہ کا مفاد یہ ہے کہ اے بنی اسرائیل! اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اُس کی دی ہوئی فضیلتوں کے تقاضوں کو پورا نہ کیا اور حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت اور اُس کے عذاب سے تم کسی طرح بچ نہ سکو گے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ کسی کافر کی طرف سے کوئی بدلہ نہ دے سکے گا اور نہ کسی کافر کے لئے کوئی شفاعت قبول کی جائے گی نہ اُس سے کوئی فدیہ و بدلہ قبول کیا جائے گا اور نہ کسی طرح اُن کی مدد کی جائے گی۔ قیامت کے دن ایمان کے بغیر کوئی شفاعت اور نصرت ہو سکے گی اگر عذاب الٰہی سے بچنا چاہتے ہو تو ایمان لاؤ۔ اس آیت کریمہ میں مومنین کے لئے شفاعت کی نفی نہیں بلکہ کافروں کے حق میں شفاعت کی نفی مراد ہے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں: وَلَا تُقْبَلُ

مِنْهَا شَفَاعَةٌ اَیْ مِنَ الْکَافِرِیْنَ (ج:۱، ص: ۸۹) اور مظہری میں ہے۔ لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ کَافِرَۃٍ (ج:۱، ص:۶۶) نیز مظہری میں ہے کہ ایمان والوں کے حق میں شفاعت آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اور اجماع اُمت سے ثابت ہے (ج:۱، ص:۹۶)

وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ ؕ وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ ﴿۴۹﴾

اور (یاد کرو) جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے چھڑایا کہ وہ تمہیں بدترین تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو (بے دردی سے) ذبح کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے۔ اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔ ۵۲ھ

۵۲ھ وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ : اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب یہود کو اپنی عظیم الشان نعمتیں یاد دلاتے ہوئے فرمایا ہماری اس نعمتِ عظیمہ کو بھی یاد کرو کہ ہم نے تمہیں آلِ فرعون سے نجات دی۔ اجلۂ مفسرین نے اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرمایا کہ فرعون نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام اور خادم بنا کر رکھا تھا۔ ان میں جو طاقتور تھے ان سے پہاڑوں کی چٹانیں کاٹنے اور ان چٹانوں کو کاندھوں اور پشتوں پر لاد کر ڈھونے کی محنتِ شاقہ کے کام لیے جاتے تھے جس کی وجہ سے ان کے جسم زخمی ہو جاتے۔ بعض لوگوں سے بڑھئی کا اور بعض سے لوہاروں کا کام لیا جاتا تھا۔ کچھ لوگوں سے کچی اینٹیں بنوائی جاتیں اور بعض لوگوں سے اینٹیں پکوانے کا کام لیا

جاتا۔ کچھ لوگوں سے محلات تعمیر کرائے جاتے۔ کچھ لوگوں سے کھیتی باڑی کرائی جاتی اور کچھ ذاتی خدمت کے لئے مقرر کئے جاتے۔ عورتوں سے سوت کاتنے اور کپڑا بُننے کا کام لیا جاتا اور جو کسی کام کے قابل نہ ہوتے تو اُن پر ٹیکس لگا دیا جاتا جو روزانہ وہ ادا کر دیتے تھے سورج ڈوبنے سے پہلے اگر کوئی ٹیکس ادا نہ کرتا تو اس کا داہنا ہاتھ اُس کی گردن کے ساتھ باندھ دیا جاتا جو ایک مہینے تک بندھا رہتا تھا۔ فرعونی ان کے علاوہ اور بھی مختلف قسم کے عذاب اور تکالیف میں بنی اسرائیل کو مبتلا رکھتے تھے۔ اس آیت کریمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بنی اسرائیل مخاطب ہیں اور مُراد اُن کے وُہ باپ دادا ہیں جنہیں فرعون نے یہ تکالیف پہنچائیں۔ ان کی نجات مخاطبین کی نجات کا باعث ہُوئی۔ اِس لئے ان پر بھی اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت ہے جسے یاد دلانے کے لئے اُنہیں مخاطب فرمایا گیا۔ فرعون کی کوئی اولاد نہ تھی آل فرعون سے مُراد وُہ لوگ ہیں جو اُس کے دین پر تھے اور اس کی اتباع کرتے تھے رُوح المعانی میں ہے کہ لفظ آل کی اصل بعض عُلماء کے نزدیک اہل ہے کیونکہ اس کی تصغیر اُھَیْل آتی ہے اور بعض کے نزدیک اس کی اصل آوْل ہے کیونکہ اہلِ عرب سے اس کی تصغیر اُوَیْل بھی منقول ہے (رُوح المعانی، پ: ۱، ص: ۱۲۱، قرطبی ج ۱ ص: ۳۸۳) علامہ نووی نے شرح مُسلم میں فرمایا آل النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تین قول ہیں۔ ایک قول امام زہری اور ان کے علاوہ دیگر محققین کا ہے ان کے نزدیک ساری اُمت آل میں شامل ہے۔ امام نووی نے اس کو اظہر الاقوال کہا۔ دُوسرا قول یہ ہے کہ وہ بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب ہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ آل سے مُراد حضُور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت یعنی ازواجِ مطہرات ہیں اور حضُور کی ذریتِ طاہرہ (نووی، شرح مُسلم، ج: ۱، ص: ۱۷۵)۔ اِس میں شک نہیں کہ محاورات عرب میں لفظ آل اکثر و بیشتر متبعین کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے لفظ آل محمد سے تمام اُمت کے مُراد ہونے کا قول بھی اہل عرب کے اِسی استعمال پر مبنی ہے۔ لیکن آل النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مزید بالحدیث ہونے کی وجہ سے یہ قول زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے کہ حضُور کی آل سے مُراد حضُور کی ازواجِ مطہرات اور حضُور کی ذریت طاہرہ

ہے۔ تفسیر قرطبی میں ہے وَقَالَتْ طَائِفَةٌ اٰلُ مُحَمَّدٍ اَزْوَاجُهٗ وَذُرِّيَّتُهٗ خَاصَّةً لِحَدِيْثِ اَبِيْ حُمَيْدٍ اِنَّا عِدِيٍّ اَنَّهُمْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ نُصَلِّيْ عَلَيْكَ قَالَ قُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ (قرطبی، ج:۱، ص:۳۸۲) یعنی عُلماء کے ایک گروہ کا قول ہے کہ آلِ محمد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات اور ذریتِ طاہرہ بالخصوص مُراد ہیں۔ جیسا کہ مسلم شریف کی حدیث پر مشتمل قرطبی کی منقولہ بالا عبارت میں آل کی بجائے حضور کی ازواج اور ذریۃ پر درود بھیجنا وارد ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لفظ آل ضمیر کی طرف مضاف نہیں ہوتا۔ اِس لیئے درود شریف میں آلِ محمد کی بجائے آلہ کہنا غلط ہے مگر حق یہ ہے کہ لفظ آل کی اضافت ضمیر کی طرف فصحائے عرب کے کلام میں وارد ہے اس لیئے اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ کہنا بھی جائز ہے (قرطبی، ج:۱، ص:۳۸۲) نحویوں میں اختلاف ہے کہ لفظ آل شہروں کی طرف مضاف ہوتا ہے یا نہیں۔ کسائی کا قول ہے کہ لفظ آل شہر کی طرف مضاف نہیں ہوتا۔ لیکن اخفش کا قول ہے کہ لفظ اہل اور آل شہروں کی طرف بھی مضاف ہوتا ہے۔ اہل عرب سے ہم نے سُنا ہے وُہ اہلِ مدینہ اور آل المدینہ کے الفاظ بولتے ہیں۔ اخفش نے یہ بھی کہا کہ لفظ آل کسی بڑے سردار کی طرف مضاف ہوتا ہے جیسے آلِ محمد (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کُل جہانوں کے سردار ہیں) اور آلِ فرعون (اِس لئے کہا جاتا ہے کہ فرعون گمراہی اور ضلالت میں بڑا سردار ہے[۲]) لفظ فرعون کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ یہ بعینہٖ اس بادشاہ کا نام ہے جس کے زمانے میں موسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے بعض نے کہا کہ یہ بنی عمالقہ کے ہر بادشاہ کا شاہی نام ہے جیسے شاہان فارس کا شاہی نام کسریٰ اور روم کے بادشاہوں کا قیصر اور شاہان حبشہ کا نام نجاشی تھا بقول اہلِ کتاب موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کا نام قابوس تھا۔ وہب کا قول ہے کہ اس کا نام ولید بن مصعب بن ریان تھا اور اُس کی کنیت ابُو مرہ تھی۔ سہیلی کہتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو قوم قبط اور

ملک مصر کا بادشاہ بنا وہ فرعون تھا۔ مسعودی کا قول ہے کہ لفظ فرعون کے معنی عربی زبان میں معروف نہیں ہیں۔ جوہری کہتے ہیں کہ فرعون مصر کے بادشاہ ولید بن مصعب کا لقب ہے اور ہر سرکش کو فرعون کہتے ہیں جیسا کہ حدیث میں ابوجہل کو اس اُمت کا فرعون کہا گیا۔ امام بغوی کے بقول فرعونِ موسیٰ کی عمر چار سو سال سے زیادہ تھی (بغوی۔ ج:۱، ص:۴۸)

یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ : امام قرطبی نے یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ کو یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ سے بدل قرار دیا اور فراء نے کہا ہے کہ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ یَسُوْمُوْنَكُمْ کی تفسیر ہے (قرطبی۔ ج:۱، ص:۳۸۴) حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ فرعون نے خواب دیکھا کہ بیت المقدس سے آگ نکلی اور ملک مصر میں رہنے والے قبطیوں کے گھروں کو جلا دیا اور بنی اسرائیل کے گھر بچ گئے۔ اس کی تعبیر یہ کی گئی کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص کے ہاتھوں قبطیوں کی تباہی ہوگی۔ (ابن کثیر، پ:۱، ص:۹۰)۔ تفسیر بغوی میں ہے کہ فرعون نے اس خواب کے بعد حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے ہر لڑکے کو قتل کر دیا جائے اور جو لڑکی پیدا ہو اسے زندہ رہنے دیا جائے (بغوی۔ پ:۱، ص:۴۸)

وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ : مفسرین نے لفظ بلاء کے دو معنی لکھے ہیں ایک محنت و تکلیف۔ دوسرا نعمت و راحت۔ اللہ تعالیٰ کبھی نعمت اور آرام دے کر اپنے بندوں کو آزماتا ہے کہ وہ شکر کرتے ہیں یا نہیں اور کبھی محنت و مشقت اور مصیبت میں ڈال کر انہیں آزماتا ہے کہ وہ اس پر صبر کرتے ہیں یا نہیں۔ (بغوی، ج:۱، ص:۴۸) قرطبی ج:۱، ص:۳۸۷) اس آیت کریمہ میں بلاء سے نعمت بھی مراد ہو سکتی ہے اور محنت و مشقت بھی۔ اگر یہ آزمائش آلِ فرعون سے نجات دینے کے ساتھ ہو تو نعمت ہے اور نعمتِ نجات پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لانا آزمائش میں کامیابی ہے اور اگر بدترین عذاب یعنے لڑکوں کو ذبح کرنے اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دینے کے ساتھ ہو تو مشقت و محنت ہے جس پر صبر کرنا آزمائش میں کامیاب ہونا ہے۔ لیکن بنی اسرائیل دونوں صورتوں میں ناکام رہے نہ نعمتِ نجات پر

ان سے شکر ادا ہُوا اور نہ تکالیف شاقہ پر وُہ صبر کر سکے۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ
اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور جب ہم نے تمہارے لیئے دریا کو چیر دیا پھر تُمہیں نجات دی اور ہم نے فرعون والوں کو غرق کر دیا اور تُم دیکھ رہے تھے۔ ۵۳ے

۵۳ے وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ : یہ قصہ قُرآن مجید کی سورہ شعراء میں وارد ہے متعدد تفاسیر کی روشنی میں اس کی تفصیل یہ ہے کہ مُوسیٰ علیہ السلام نے سرزمین مصر میں طویل قیام کے دوران فرعون اور اس کی قوم کے سامنے قوی دلائل اور روشن معجزات پیش فرمائے۔ فرعون اور اس کی قوم عناد اور سرکشی سے باز نہ آئی۔ اُنہوں نے اپنے لیئے عذاب و رُسوائی کے سوا کوئی سبیل باقی نہ چھوڑی تو اللہ تعالیٰ نے مُوسیٰ علیہ السلام کو حُکم فرمایا کہ رات کے وقت بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ مصر سے نکال کر وہاں لے جائیں جہاں اُنہیں حُکم دیا گیا ہے۔ مُوسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب عزوجل کے حُکم کی تعمیل کی وُہ بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے گئے جب کہ فرعون کی قوم سے بہت سے زیورات بطور عاریت لیئے ہُوئے تھے۔ اکثر مفسرین کے مطابق مُوسیٰ علیہ السلام ان کو طلوع قمر کے وقت یعنی چاندنی رات میں لے کر نکلے تھے۔ امام مُجاہد سے منقول ہے کہ اس رات چاند گرہن میں آگیا تھا۔ مُوسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے یُوسف علیہ السلام کی قبر دریافت فرمائی تو بنی اسرائیل کی ایک بوڑھی عورت نے اُسکی نشاندہی کی مُوسیٰ علیہ السلام نے خُود بہ نفس نفیس اس تابُوت کو اُٹھایا۔ یُوسف علیہ السلام نے وصیت فرمائی تھی کہ بنی اسرائیل جب مصر سے نکلیں تو اُن کا تابُوت اپنے ساتھ لے جائیں اس بارے میں ابن ابی حاتم

نے ایک روایت بھی نقل کی ہے حضرت ابو موسیٰ اشعری نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دیہاتی کے پاس ٹھہرے جس نے حضور کا اکرام کیا۔ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا تم کبھی کبھی ہمارے پاس آیا کرو تو دیہاتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بتاؤ تمہیں کیا ضرورت ہے اس نے عرض کیا کہ کجاوے کے ساتھ ایک اونٹنی اور ایک شیر دار بکری کہ میرے گھر والے اس کا دودھ پئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تو بنی اسرائیل کی بوڑھی عورت سے بھی گیا گزرا ہو گیا۔ صحابہ کرام نے عرض کیا بنی اسرائیل کی بوڑھی عورت کا کیا واقعہ ہے؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا تو راستہ بھول گئے۔ بنی اسرائیل نے پوچھا یہ کیا ہوا کہ ہم راستہ بھول گئے؟ تو جاننے والوں نے کہا کہ یوسف علیہ السلام نے وفات کے وقت ہم بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا کہ ہم ان کا تابوت اپنے ساتھ لئے بغیر مصر سے ہرگز نہ نکلیں تو موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ تم میں سے کون ہے جو یوسف علیہ السلام کی قبر کو جانتا ہو۔ انہوں نے بتایا کہ ہم میں ایک بوڑھی عورت کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا کہ یوسف علیہ السلام کی قبر کہاں ہے؟ تو موسیٰ علیہ السلام نے اسے بلا کر فرمایا کہ مجھے یوسف علیہ السلام کی قبر بتا۔ اس نے کہا جب تک میری بات پوری نہیں کریں گے میں بتاؤں گی۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تو کیا چاہتی ہے اس نے کہا میں چاہتی ہوں کہ جنت میں آپ کے ساتھ رہوں۔ موسیٰ علیہ السلام پر یہ بات گراں گزری تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اے موسیٰ! جو کچھ مانگتی ہے اسے عطا کر دیجئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اسے عطا فرما دیا اور اس کے ساتھ یوسف علیہ السلام کی قبر کی جگہ پہونچے جب قبر سے ان کا تابوت لے کر چلے تو اندھیری رات میں دن کی طرح راستہ روشن ہو گیا۔ یہ حدیث بہت غریب ہے۔ اقرب یہ ہے کہ روایت صحابی پر موقوف ہو۔ واللہ اعلم (ابن کثیر، ج: ۳، ص: ۳۳۵) جب فرعونیوں نے صبح کی اور وہاں بنی اسرائیل میں سے کسی کو نہ پایا تو سخت غضبناک ہوئے۔ فرعون نے ہر طرف اپنے کارندے دوڑائے تمام لشکروں، فوجوں اور سب حامیوں کو جمع کر لیا اور اعلان کیا کہ بنی اسرائیل چھوٹی سی جماعت ہیں اور ہر وقت ہمارے غیظ و غضب کو بھڑکاتے رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں

ان کی جڑ بنیاد ختم کر دوں۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کے دل میں ایسی ہی بات پختہ فرما دی جو فرعونیوں کے ہلاک ہونے کے متعلق ارادۂ الٰہیہ کے پورا ہونے کا سبب ہوئی۔ فرعون کے تمام ماننے والے اپنی نعمتوں کو چھوڑ کر ہلاکت کی طرف نکلے اُنہوں نے اپنے اعلیٰ درجے کے رہائشی مکانات پھلوں سے لدے ہوئے ہرے بھرے باغات عیش و طرب کا سامان، سونے چاندی اور جواہرات کے خزانے سب چھوڑ دیئے اور فرعون کے بلانے پر اکٹھے ہو گئے اور فرعون کے ساتھ بنی اسرائیل کے تعاقب میں چل پڑے اور صبح ہوتے ہی ان کے پیچھے جا پہنچے جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں (بنی اسرائیل) نے کہا ہم یقیناً پکڑے گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہرگز نہیں میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ ابھی میری رہنمائی فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی وقت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ آپ سمندر پر اپنا عصا ماریں موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارتے ہی سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر حصہ بڑے پہاڑ کی طرح ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرعونیوں کو قریب لے آیا اُنہوں نے سمندر میں خشک راستہ دیکھ کر اپنے گھوڑے دوڑا دیئے جب موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی سمندر کو پار کر گئے اور فرعون کے سب ساتھی سمندر کے درمیان جمع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے سمندر اپنے پہلے حال پر آ گیا۔ اور بنی اسرائیل کی دیکھتی آنکھوں کے سامنے فرعون اور اُس کے سب ساتھی غرق ہو گئے اور جن لوگوں کو فرعون سے نجات ملی اُن میں وہ مرد بھی شامل تھا جسے مومن آلِ فرعون کہا گیا جس کا نام حبیب، شمعان، سمعان، حزقیل، خربیل یا حزبیل لکھا ہے۔ بعض نے اُسے سبطی اور بعض نے فرعون کا چچا زاد بھائی بتایا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے فرعونیوں کے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے منصوبے سے انہیں آگاہ کیا تھا۔ اور جس نے فرعونیوں سے کہا تھا کہ تم اس شخص کو جس کا دامن ہر اعتقادی اور عملی عیب سے پاک ہے جو ایمان و ایقان، صالحیت و عصمت کا حسین نمونہ ہے اسے اس لئے قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے حالانکہ تمہارے رب کی طرف سے وہ روشن دلیل لے کر آیا ہے اگر بالفرض وہ سچا نہیں تو اُس کے کذب کا وبال اُس پر ہو گا اور اگر وہ سچا ہے تو یاد رکھو کہ ہی

کے قتل کے وبال سے تم بچ نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے آیتِ کریمہ میں اپنی یہ نعمتِ عظیمہ بنی اسرائیل کو یاد دلائی جس کا مقصد ان سے شکرِ نعمت کا طلب کرنا ہے جس کی صورت یہی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں۔ موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ کی تعلیمات کا مقتضیٰ یہی ہے۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ کیا پھر اس کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ظالم تھے۔ ۵۴

۵۴ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً : یہاں وَاعَدْنَا، وَعَدْنَا کے معنی میں ہے اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک اور نعمت یاد دلائی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر سمندر پار کر گئے تو ان کی قوم نے ان سے کہا کہ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب آنی چاہیے موسیٰ علیہ السلام جبلِ طور پر تشریف لے گئے اللہ تعالیٰ نے ان سے چالیس راتوں کا وعدہ فرمایا۔ اکثر مفسرین کے قول میں تیس راتیں ذوالقعدہ اور دس راتیں ذوالحجہ کی تھیں (قرطبی، جزو: ۱، ص: ۳۹) موسیٰ علیہ السلام میقات پر جاتے ہوئے اپنے حقیقی بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنا گئے۔ چالیس دن رات کی میعاد پوری ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں توراۃ عطا فرمائی۔ "اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً" میں صرف راتیں مراد نہیں بلکہ چالیس شبانہ روز مراد ہیں۔ چونکہ رات دن سے پہلے آتی ہے اس لیے "اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً" فرمایا گیا۔ سورۂ اعراف کی آیت ۱۴۲ میں ہے "اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور مزید دس راتوں کے

ساتھ ہم نے انہیں پورا کیا تو ان کے رب کا مقرر کیا ہوا وقت چالیس راتیں پورا ہو گیا؛ اس کا مفہوم بھی یہی ہے اور تیس راتوں کا ذکر فرما کر دس راتوں کا ذکر الگ فرمانے کی حکمت یہ ہے کہ اس میقات میں دن کے روزے بھی شامل تھے۔ اگر تیس روزوں کے بعد موسیٰ علیہ السلام مسواک کر کے اپنے دہن مبارک کی وہ بو دور نہ فرما دیتے جو اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ پسندیدہ تھی تو میقات پوری ہو جاتی۔ مگر موسیٰ علیہ السلام نے مسواک کر لی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مزید دس روزوں کا حکم دیا تاکہ منہ کی وہ پسندیدہ بو سابقہ کیفیت پر عود کر آئے اور اس طرح دس شبانہ روز کا اضافہ فرما کر چالیس کے عدد سے اس کو پورا کیا گیا۔[1]

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ: موسیٰ علیہ السلام کے میقات پر تشریف لے جانے کے بعد بنی اسرائیل بچھڑے کی پرستش میں مبتلا ہو گئے جس کا ڈھانچہ سامری نے قبطیوں کے سونے چاندی کے زیورات گلا کر تیار کیا تھا اور جبریل علیہ السلام کی گھوڑی کے سُم تلے کی مٹی اس میں ڈال دی جب کہ وہ غرق فرعون کے موقع پر اپنی گھوڑی پر تشریف لائے تھے۔[2] یا بقول بعض موسیٰ علیہ السلام کو میقات پر لے جانے کے لئے اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر تشریف لاتے تھے۔ سامری نے اُن کی گھوڑی کے سُم تلے کی مٹھی بھر خاک لے کر محفوظ کر لی تھی جس میں اللہ تعالیٰ نے اثرِ حیات رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ ڈھانچہ ذی حیات ہو کر گائے کی طرح آواز نکالتا تھا (روح المعانی پ: ۱۶، ص ۲۵۳) امام قرطبی نے ایک روایت نقل کی ہے جس میں بچھڑے کے ذی حیات ہونے کا سبب بیان کیا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے مصر سے جلتے ہوئے موم لے کر ایک بیل اور ایک گھوڑے کی صورت بنائی اور اُن پر کچھ کلام پڑھ کر سمندر میں ڈال دیا۔ اس کلام کو سُن کر سامری نے یاد کر لیا۔ بیل کی صورت میں جان پڑ گئی وہ سمندر کی گہرائی سے اپنے سینگوں پر یوسف علیہ السلام کا تابوت اُٹھا کر نمودار ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام اس تابوت کو اپنے ساتھ لے گئے۔ سامری نے وہی کلام پڑھ کر بچھڑے کے ڈھانچے میں پھونک دیا جس کی وجہ سے اس میں حیات پیدا ہو گئی (قرطبی جز: ۱۱، ص: ۲۴۰) بعض حضرات کا خیال ہے کہ بچھڑے کے ڈھانچے میں کوئی حیات نہ تھی نہ

بچھڑا از خود کوئی آواز نکالتا تھا بلکہ سامری نے اپنی فنی مہارت سے اس کی مورتی اس طرح بنائی تھی کہ جب ہوا اس میں سے گذرتی تو اس سے بے معنی سی بیں بیں کی آواز نکلتی تھی۔ لیکن قدمائے مفسرین تابعین وغیرہم سے وہی پہلا قول منقول ہے جیسا کہ حضرت علی، عبداللہ بن عباس، حسن بصری، مجاہد اور قتادہ سے صراحۃً مروی ہے کہ سامری نے جبریل علیہ السلام کی گھوڑی کے سم تلے کی خاک بچھڑے میں ڈالی تھی جس کی وجہ سے اس میں اثرِ حیات پیدا ہو گیا اور وہ گائے کی طرح بولنے لگا۔ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۹۶ "بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ" میں نے وہ چیز دیکھی جسے وہ نہ دیکھ سکے اور میں نے رسول کے نشانِ قدم سے مٹھی بھر مٹی اٹھالی۔ اس آیت کی تفسیر میں یہی قولِ اوّل جو قتادہ وغیرہم سے مروی ہے منقول ہوا اور قدماء مفسرین نے اس آیت کے یہی معنی بیان کئے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے کے متعلق سامری سے پوچھا تو اس نے کہا۔ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهٖ۔ الآیہ کہ میں نے وہ دیکھا جو لوگوں نے نہ دیکھا یعنی میں نے جبریل علیہ السلام کو گھوڑی پر سوار ہو کر جاتے دیکھا "فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ" تو میں نے رسول یعنی جبریل کی گھوڑی کے نشانِ قدم کی جگہ سے مٹھی بھر خاک اٹھالی (قرطبی ج: ۱۱، ص ۲۳۹) ابو مسلم اصفہانی معتزلی نے کہا کہ اس آیت کے معنی نہیں بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے موسیٰ آپ کی تعلیمات اور عقیدۂ توحید جسے آپ نے اور آپ کے ساتھ دوسرے لوگوں نے حق مانا۔ میں نے اس میں حقانیت اور صداقت کو نہ دیکھا پھر میں نے رسول یعنی موسیٰ علیہ السلام کی سیرت اور تعلیمات سے کچھ حصہ لے لیا۔ "فَنَبَذْتُهَا" پھر میں نے اسے پھینک دیا۔ (کبیر ج: ۶، ص: ۱۰۰) ابو مسلم اصفہانی نے یہ بھی کہا کہ قرآن کی کسی آیت سے قدماء مفسرین کے قول کی تائید نہیں ملتی۔ حیرت ہے کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوبکر اصم کے ساتھ ابو مسلم اصفہانی کو کبراء معتزلہ میں شمار کرنے کے باوجود اس کے اس قول کو مفسرین متقدمین تابعین وغیرہم کے خلاف اقرب الی التحقیق قرار دیا۔ حالانکہ قرآن مجید کی کسی آیت یا اور کسی دلیل شرعی سے اس کی تائید نہیں ہوتی اور آیت کریمہ کا کوئی لفظ بھی اس مفہوم پر دلالت نہیں

کرتا: "بَصُرْتُ بِمَالَمْ یَبْصُرُوْا بِہٖ" کے الفاظ سے کوئی شخص بھی ابو مسلم اصفہانی کے بیان کردہ مفہوم کو درست نہیں سمجھ سکتا اسی طرح "فَقَبَضْتُ قَبْضَۃً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُھَا" کے الفاظ سے بھی کوئی شخص اس معتزلی کے مطابق یہ نہیں سمجھ سکتا کہ سامری نے کہا میں نے موسیٰ علیہ السلام کی سیرت کا کچھ حصہ لے لیا اور اُن کی تعلیمات اور سیرت سے لینے کے بعد میں اس سے منکر ہو گیا۔ تفسیرِ قرآن میں اگر اسی طرز کو اختیار کیا جائے تو مطالبِ قرآن کبیر مسخ ہو کر رہ جائیں۔

صاحب تفہیم نے اس مقام پر عجیب مضحکہ خیز بات لکھی ہے کہ: "سامری کے قول کا مطلب تو وہی ہے جو متقدمین مفسرین نے بیان کیا کہ میں نے جبریل کو دیکھا اور اُن کی گھوڑی کے نشانِ قدم سے مٹھی بھر مٹی اٹھالی۔ لیکن اس نے موسیٰ علیہ السلام سے جھوٹ موٹ یہ بات کہہ دی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سامری کا موسیٰ علیہ السلام سے جھوٹ موٹ یہ بات کہنا قرآن سے ثابت نہیں نہ مفسرین میں سے کسی نے یہ قول کیا۔ علماء متقدمین اور اسلاف کا مسلک ہی ہمارے لئے راہِ نجات ہے۔

سامری کے نام و نسب اور جائے سکونت کے بارے میں اقوال مختلف ہیں سب سے زیادہ راجح قول یہی ہے کہ اس کا نام موسیٰ اور اُس کے باپ کا نام ظفر تھا اور بنی اسرائیل کے ایک قبیلہ سامرہ سے تھا۔ اسی قبیلہ کی مناسبت سے اس کی جائے سکونت کا نام بھی سامرہ ہوا۔ اسی لئے اس کو سامری کہتے ہیں۔ یہ شخص خود اور اُس کا سارا قبیلہ مکہ اطراف و جوانب کے تمام لوگ گائے کی پرستش کیا کرتے تھے۔ یہ سامری اس زمانے میں پیدا ہوا جب فرعون بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے ہر لڑکے کو ذبح کرا دیا کرتا تھا۔ جب یہ پیدا ہوا اس کی ماں نے اسے پہاڑ کے غار میں چھپا دیا۔ بنی اسرائیل کے اس قسم کے بچوں کی تربیت کے لئے حضرت جبریل علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا تھا۔ اس موسیٰ بن ظفر یعنی سامری کی تربیت کے لئے بھی حضرت جبریل علیہ السلام متعین تھے۔ وہ اس کے غار میں تشریف لاتے اور اس کا اپنا ہاتھ

اسی کے منہ میں دے دیتے جس سے وہ دودھ اور شہد چوستا رہتا (قرطبی، ج: ۷، ص: ۲۸۴) بعض علماء نے لکھا کہ جبریل علیہ السلام خود اپنی انگلیاں اس کے منہ میں دے دیتے تھے جس سے وہ دودھ اور شہد چوستا تھا۔ صاحب روح المعانی نے اس ضمن میں دو شعر بھی نقل کئے ہیں ؎

إِذَا الْمَرْءُ لَمْ يُخْلَقْ سَعِيدًا تَحَيَّرَتْ
عُقُولُ مُرَبِّيهِ وَخَابَ الْمُؤَمِّلُ
فَمُوسَى الَّذِي رَبَّاهُ جِبْرِيلُ كَافِرٌ
وَمُوسَى الَّذِي رَبَّاهُ فِرْعَوْنُ مُرْسَلُ

جب آدمی اصل خلقت میں سعادت سے محروم ہو تو اس کی تربیت کرنے والوں کے دماغ حیرت زدہ اور اس سے بہتری کی امید رکھنے والے خائب و خاسر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ موسیٰ جس کی پرورش جبریل نے کی کافر ہوا اور وہ موسیٰ جس کی پرورش فرعون نے کی وہ اللہ کا فرستادہ رسول ہے (روح المعانی، پ: ۱۹، ص: ۲۴۴) سامری موسیٰ علیہ السلام پر بظاہر ایمان لایا مگر پکا منافق تھا۔

موسیٰ علیہ السلام کے میقات پر تشریف لے جانے کے بعد اس نے بچھڑے کا ڈھانچہ بنایا کیونکہ یہ پہلے سے گائے کا پجاری تھا۔ بچھڑے کے ذی حیات ہونے اور گائے کی طرح بولنے کی وجہ سے سامری نے بنی اسرائیل سے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ سے ملنے کے لئے میقات پر چلے گئے اور اللہ خود یہاں آگیا۔ بنی اسرائیل کے اکثر لوگ اس بچھڑے کی پوجا کرنے لگے۔ حضرت ہارون علیہ السلام جنہیں موسیٰ علیہ السلام نے میقات کی طرف جاتے ہوئے واپسی تک اپنا خلیفہ بنایا تھا۔ بنی اسرائیل کو بچھڑے کی پرستش سے بہت روکتے رہے لیکن وہ نہ مانے اور بچھڑے کی عبادت کرتے رہے۔ وعدہ الٰہی کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کی یہ چلہ کشی کامیابی پر منتج ہوئی۔ اسی مناسبت سے بزرگان دین نے چالیس شبانہ روز کی عبادت و ریاضت کو اختیار فرمایا اور تجربہ سے ثابت ہوا کہ اس چلہ کشی سے وہ اپنے روحانی مقاصد میں کامیاب ہوئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو میقات پر جاتے ہوئے صرف واپسی تک اپنا خلیفہ بنایا تھا اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبوک جاتے ہوئے مدینہ واپس تشریف لانے تک اپنا خلیفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بنایا اور فرمایا۔ "اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی اِلَّا اَنَّہٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ"۔ اے علی تم میری طرف سے اسی رتبے میں ہو جو ہارون کو موسیٰ کی طرف سے حاصل تھا لیکن یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ بعض لوگ اس حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علی کی خلافت بلافصل پر استدلال کرتے ہیں۔ جو صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون کو میقات سے واپسی تک کے لئے اپنی زندگی میں اپنا خلیفہ بنایا تھا بالکل اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت علی کو تبوک سے واپسی تک اپنا خلیفہ بنایا اس لئے خلافت بعد وفات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ہاں ہارون علیہ السلام نبی تھے اور حضور خاتم النبیین ہیں اس لئے حضور نے حضرت علی کے حق میں نبوت کے احتمال کو قطع فرمانے کے لئے "لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" فرمادیا۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

پھر اس کے بعد ہم نے تمہیں معاف کر دیا تاکہ تم (ہمارا) شکر کرو ۵۵

۵۵ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ۔ الایۃ: پھر ہم نے تمہارے اس جرم عظیم کو صرف اس لئے معاف فرمادیا کہ تم اللہ کی نعمتوں پر شکر کرو لیکن تمہاری سرکشی بڑھتی چلی گئی۔

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور حق و باطل میں فرق کرنے والا (معجزہ عطا فرمایا)
تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ ۵۶ھ

۵۶ھ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ : اللہ تعالیٰ نے ایک اور عظیم الشان نعمت بنی اسرائیل کو یاد دلائی اور وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب توراۃ ہے۔ جو حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والی اور ہدایت کی راہوں کو کشادہ کرنے والی ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ
يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ
الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا
اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ
فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

اور جب موسیٰ نے اپنی اُمت سے فرمایا اے میری اُمت! بیشک تم نے بچھڑا (معبود)
بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ پس توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف تو (آپس میں) اپنی
جانوں کو قتل کر دو یہ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے تو وہ تم پر

رجوع برحمت ہوا بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا بے حد رحم فرمانے والا۔ ۵۷ے

۵۷ے وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ : وعدۂ الٰہیہ کے مطابق جب موسیٰ علیہ السلام اللہ کی کتاب توراۃ لے کر میقات سے واپس تشریف لائے اور اُنہوں نے اپنی قوم کو بچھڑے کی پرستش میں مبتلا پایا تو آپ نے بحالتِ غضب "توراۃ" کی تختیاں ڈال دیں اور قوم کو سخت ملامت اور زجر و توبیخ فرمائی اور شدتِ غضب کی حالت میں ہارون علیہ السلام کی داڑھی پکڑلی اور سر کے بال پکڑ کر اُنہیں اپنی طرف کھینچنے لگے۔ ہارون علیہ السلام نے کہا میرے بھائی! قوم نے مجھ پر انتہائی سرکشی اختیار کی یہاں تک کہ مجھے قتل کرنے کے درپے ہو گئے۔ آپ دشمنوں کو مجھ پر نہ ہنسائیں اور مجھے ظالم لوگوں میں شامل نہ کریں۔ موسیٰ علیہ السلام کا غصہ فرو ہو گیا اور اُنہوں نے دُعا کی۔ اے اللہ! مجھے اور میرے بھائی ہارون کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا یہ غضب محض اللہ کے لئے تھا جس میں نفسانیت کا کوئی شائبہ قطعاً شامل نہ تھا۔ اِسی لئے ان کا کوئی فعل اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابلِ مواخذہ نہ ہوا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے محبوب بندے جو نفسانیت سے بالکل پاک ہوتے ہیں ان کا غضب خواہ بتقاضائے بشریت ہی کیوں نہ ہو ہوائے نفس سے پاک ہونے کی وجہ سے اُن کے حق میں موجبِ مذمت اور قابلِ مواخذہ نہیں ہوتا اور جس پر ایسے غضب کا اظہار کیا جائے اگر وہ بے گناہ ہو تو اُس کی بھی مذمت نہیں کی جا سکتی جیسے حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا حضرت ابوبکر صدیق پر ناراض ہونا دونوں میں سے کسی کے حق میں موجبِ مذمت یا ندامت نہیں۔ یہاں حضرت موسیٰ، حضرت ہارون سے راضی ہو گئے اور وہاں حضرت فاطمہ حضرت ابوبکر سے راضی ہو گئیں۔ فتح الباری میں بروایت بیہقی منقول ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق سیدہ حضرت فاطمۃ الزہراء کی عیادت کے لئے حاضر ہوئے تو حضرت علی

نے حضرت سیدہ فاطمہ سے فرمایا ابُوبکر آپ کی عیادت کے لئے آتے ہیں اور اذن کے طالب ہیں حضرت فاطمہ نے فرمایا کیا آپ پسند فرماتے ہیں کہ میں اُنہیں اجازت دیدوں؟ حضرت علی نے فرمایا ہاں! چنانچہ حضرت ابُوبکر حاضر ہوئے انہوں نے حضرت سیدہ کو راضی کیا یہاں تک کہ وُہ راضی ہوگئیں. اگرچہ یہ حدیث مرسل ہے مگر شعبی تک اس کی سند صحیح ہے (فتح الباری، ج: ۶، ص: ۱۵۱)

مخفی نہ رہے کہ محدثین کے نزدیک امام شعبی کی مراسیل صحیح ہیں (تذکرہ الحفاظ، ج ۱، ص: ۷۹، ۸۰۔ طبع بیروت) امام شعبی کی روایت نقل کرنے کے بعد حافظ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا کہ حضرت ابُوبکر سے حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراؑ کی ناراضگی کا اشکال اس روایت سے حل ہو جاتا ہے۔ وللہ الحمد

الغرض مُوسیٰ علیہ السلام نے قوم کو حکم دیا "اِنَّکُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَکُمْ" کہ تم نے بچھڑے کی پُوجا کرکے اپنی جانوں پر ظلم کیا اب تم اپنے رب کی طرف توبہ کرو اور تمہاری توبہ کی صورت یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دُوسرے کو قتل کرو. چنانچہ توبہ کرنے والوں نے اِسی طرح توبہ کی کہ ہر ایک کے ہاتھ میں تلوار تھی بلا امتیاز ہر ایک نے دُوسرے کو قتل کیا. اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور ہر قاتل و مقتول نے شہادت کا مرتبہ پایا۔ مُوسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کو ذبح کرکے اس کا خُون بہایا اور ہڈیوں کا ریتی سے برادہ کرکے جلا دیا. اور خاکستر پانی میں بہا دی۔ مُوسیٰ علیہ السلام کا بچھڑے کو ذبح کرکے اس کا خُون بہانا اس بات کی دلیل ہے کہ سونے چاندی کی دھات سے بنا ہُوا اس کا جسم گوشت اور ہڈیوں میں تبدیل ہو گیا اور اس میں حیات پیدا ہو گئی تھی۔ بعض نے کہا کہ ریتی سے اس کا برادہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا جسم دھات سے گوشت اور ہڈی کی صورت میں تبدیل نہیں ہوا. لیکن یہ دلیل اس لئے ضعیف ہے کہ دھات کا ہی برادہ نہیں کیا جاتا بلکہ ریتی سے ہڈی کا برادہ بھی کیا جاتا ہے۔ قدماء مفسرین کے مطابق صحیح یہی ہے کہ وہ بچھڑا دھات سے گوشت اور ہڈی میں تبدیل ہو گیا تھا

قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ مقولہ کہ ہم اسے جلا کر اس کی راکھ دریا میں بہا دیں گے۔ اپنے ظاہر الفاظ کے ساتھ قدما مفسرین کے قول کی تائید کرتا ہے (روح المعانی پ ۱۶، ص: ۲۵۷)

سامری کا انجام: موسیٰ علیہ السلام نے سامری کی بات سن کر اسے اس کا دنیوی اور اخروی انجام بتا دیا۔ اس کے دنیوی انجام کے بارے میں فرمایا تو چلا جا زندگی بھر تو "لَا مِسَاسَ" کہتا پھرے گا۔ یعنی چھونا اور ہاتھ لگانا نہیں۔ اس کے ایک معنی تو یہ کئے گئے کہ کسی کا تجھ سے اور تیرا کسی سے اختلاط نہ ہوگا اور تو ہر ایک سے الگ تھلگ رہے گا۔ دوسرے معنی وہ ہیں جو عام مفسرین نے بیان کئے کہ تو کسی کو یا کوئی تجھ کو ہاتھ لگائے گا تو دونوں بخار میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس لئے تو یہی کہتا پھرے گا کہ مجھے کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ اور آخرت میں تیرا انجام عذابِ ابدی ہے[1]۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ﴿٥٥﴾ ثُمَّ بَعَثْنَاكُم مِّن بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٦﴾

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز آپ کا یقین نہ کریں گے جب تک اللہ کو علانیہ (سامنے) نہ دیکھ لیں۔ تو تمہیں (بجلی کی) کڑک نے پکڑ لیا اور تم (اس منظر کو) دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے تمہارے مرنے کے بعد تمہیں زندہ کیا تاکہ تم شکر کرو۔[2]

---

[1] ۵۸ وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ۔ الآیۃ: جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام

کو توراۃ عطا فرمائی اور اُنہیں اپنے کلام سے مشرف فرمایا تو ان کی قوم کے انتہا پسند لوگوں نے از روئے سرکشی کہا "لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً" ہم آپ کی بات ہرگز نہ مانیں گے جب تک ہم اللہ کو ظاہر و باہر نہ دیکھ لیں۔ ان کے اس کفر و طغیان کے باعث اُنہیں بجلی نے ہلاک کر دیا۔ مُوسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی کہ اے اللہ! انہیں دوبارہ زندہ فرمادے اللہ تعالیٰ نے مُوسیٰ علیہ السلام کی دُعا قبول فرمائی اور موت کے بعد اُنہیں دوبارہ زندہ فرمادیا۔ یہ دوبارہ زندگی ان کو اِس لیے عطا فرمائی کہ وُہ دُوسری نعمتوں کے ساتھ حیات بعد الموت کی نعمت کا بھی شکر ادا کریں۔ اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان رکھیں (قرطبی، ج ۱، ص ۴۲۰)

رہا یہ امر کہ بعض آیاتِ قرآنیہ کے ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد دُنیاوی حیات ناممکن ہے۔ میں عرض کروں گا کہ عادتِ الٰہیہ یہی ہے کہ موت کے بعد دنیوی حیات حاصل نہیں ہوتی۔ اُن آیات میں اِسی عادتِ الٰہیہ اور قانونِ عام کا بیان ہے لیکن خرقِ عادت بھی کتاب و سُنّت سے ثابت ہے اور بعض اُمور کا قانون خاص کے تحت ہونا قرآن و حدیث سے واضح ہے۔ اِس لیے یہاں کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں کی "دُنیوی مدت عُمر" علمِ الٰہی میں باقی تھی اور بطور سزائے معصیت" یا کسی دُوسری حکمت کی وجہ سے "اُن پر موت طاری کی گئی۔ ان لوگوں کو مرنے کے بعد دُنیا میں دوبارہ زندگی عطا کی جاتی ہے۔ اور جن لوگوں کی دُنیوی مُدتِ عُمر علمِ الٰہی میں پُوری ہو چکی اُن کو دُنیا میں دوبارہ زندگی نہیں دی جاتی[1]۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ
الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا

أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٥٧﴾

اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کر دیا اور من اور سلویٰ تم پر اُتارا۔ کھاؤ ہماری دی ہوئی پاک چیزوں سے اور اُنہوں نے (ہماری نافرمانی کرکے) ہم پر ظلم نہیں کیا ہاں وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ ۵۹

۵۹ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ : بنی اسرائیل کی انتہائی سرکشی کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اُن پر بے شمار انعامات فرمائے۔ اِس آیت کریمہ میں جن نعمتوں کا ذکر ہے ان کا تعلق میدان تیہ سے ہے۔ تیہ مصر اور شام کے درمیان ایک وسیع اور کھلا میدان تھا۔ تیہ کے معنی حیرانی اور پریشانی کے ہیں۔ بنی اسرائیل اس میدان میں چالیس سال تک اِنتہائی حیرانی اور پریشانی کے عالم میں سرگرداں رہے۔ اِسی لئے اسے وادیٔ تیہ کہا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کا اصل وطن مالوف مُلک شام تھا۔ یُوسف علیہ السلام کے دور میں یہ لوگ مصر آکر مقیم ہوئے اور وہاں مختلف حالات سے گزرتے رہے۔ فرعونِ مصر کی غلامی کا کٹھن دور بھی ان لوگوں نے مصر میں گزارا بالآخر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے انہیں نجات دلائی۔ فرعون دریا میں غرق ہوا اور بنی اسرائیل نے اطمینان کا سانس لیا۔ اِس دوران ملک شام پر قوم عمالقہ قابض ہو چکی تھی اور اُنہوں نے وہاں اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔ فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ عمالقہ سے جہاد کرکے ان سے اپنا اصل وطن آزاد کرائیں۔ بنی اسرائیل جہاد کے لئے ملک شام کی طرف روانہ ہوئے۔ جب یہ عمالقہ کی حدود کے قریب پہنچے تو ان کی قوت اور طاقت کا حال سُن کر دل چھوڑ بیٹھے اور جہاد سے مُنہ موڑ کر واپس لوٹے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس جُرم کی سزا یُوں دی کہ وُہ اپنے گھروں تک واپس نہ پہنچ سکے اور چالیس برس تک وادی تیہ میں حیران و پریشان گھومتے رہے۔ بنی اسرائیل اپنے گھروں

تک جانے کی فکر میں دِن بھر سفر کرتے. رات بسر کرنے کے بعد صبح کو اپنے آپ کو وہیں پاتے جہاں سے گزشتہ صبح اُنہوں نے سفر کا آغاز کیا تھا. اِسی پریشاں حالی اور سرگردانی کے عالم میں چالیس سال اُنہوں نے میدان تیہ میں گزار دیئے. اس وادی میں نہ کوئی سایہ دار درخت تھا اور نہ ہی کوئی عمارت، نہ پینے کے لیے پانی نہ کھانے کے لیے کوئی چیز نہ روشنی تھی نہ ضروریاتِ زندگی کے دیگر لوازمات. اس بے سروسامانی اور غریب الوطنی کے عالم میں موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے ان کے لئے سب سامان مہیا ہو گئے. اللہ تعالیٰ نے دُھوپ سے بچاؤ اور سایہ کے حصول کے لئے بادل بطورِ سائبان نازل فرما دیا، کھانے کے لئے من وسلویٰ بھیج دیا. من وسلویٰ کے بارے میں مختلف اقوال ہیں. صحیح قول یہی ہے کہ من سے مُراد ترنجبین ہے جو ایک نفیس شیریں ذائقہ دار مادہ تھا. جو شبنم کی طرح صبح کے وقت آسمان سے اُترتا اور کثیر مقدار میں چھوٹے چھوٹے درختوں پر منجمد ہو جاتا تھا۔

سلویٰ کے بارے میں بھی متعدد اقوال ہیں. صحیح یہی ہے کہ وُہ بٹیر تھا. بعض نے کہا کہ وُہ بھنا ہُوا اُترتا تھا اور بعض کا قول ہے کہ بکثرت زندہ پرندے ان کے پاس جمع ہو جاتے تھے وہ انہیں زندہ پکڑ لیتے اور ذبح کرتے تھے. الغرض من وسلویٰ ان کی شیریں اور نمکین لطیف غذائیں تھیں جنہیں شکم سیر ہو کر وُہ کھاتے تھے. موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے پتھر پر عصا مارا اور اس سے پانی کے چشمے جاری ہو گئے. تاریکی دُور کرنے کے لیے غیبی شکل میں ایک روشنی ظاہر ہو جاتی تھی. لباس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی اعجازی شان اس طرح ظاہر فرمائی کہ نہ ان لوگوں کے کپڑے میلے ہوتے اور نہ پھٹتے اور اُن کے بچوں کے جسم کے ساتھ بچوں کا لباس بھی بڑھتا رہتا تھا (قرطبی، ج: ۱، ص: ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸)

وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ : یہاں لفظ "فَعَصَوْا" محذوف ہے. یعنی اتنے عظیم و جلیل احسانات و انعامات کے باوجود اُنہوں نے نافرمانیاں کیں اور اپنی ان نافرمانیوں سے اُنہوں نے ہمارا کچھ نہ بگاڑا۔ ہاں وُہ اپنے آپ ہی کو نقصان پہنچاتے

رہے۔ (قرطبی، ج: ۱، ص: ۴۰۹)

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ
فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا
الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ
خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

اور جب ہم نے فرمایا اس شہر میں چلے جاؤ۔ پھر اس میں جہاں چاہو فراغت کھاؤ۔ اور تم داخل ہو دروازے میں (عاجزی سے) سر جھکائے ہوئے اور کہو "حِطَّةٌ" (ہمارے گناہ معاف ہوں) ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے اور نیکی کرنے والوں کو عنقریب ہم زیادہ دیں گے۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ۔ الآیۃ: اللہ تعالیٰ نے ایک اور عظیم الشان نعمت بنی اسرائیل کو یاد دلائی وہ یہ کہ جہاد سے روگردانی کی پاداش میں جب یہ لوگ چالیس برس تک میدان تیہ میں حیران و پریشان گھومتے پھرے اس عرصہ میں موسیٰ علیہ السلام کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ کی وہ سب نعمتیں ان کے شاملِ حال رہیں جن کا ذکر پہلی آیت کے ضمن میں آچکا ہے۔ اس عرصہ میں ہارون علیہ السلام بھی وفات پاگئے اور موسیٰ علیہ السلام کی وفات بھی ہوگئی۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد یوشع بن نون علیہ السلام نے قوم عمالقہ سے جہاد کیا بنی اسرائیل کے سرکش لوگ جو میدانِ تیہ میں ہلاک ہو چکے تھے وہ تو اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے بقیہ قوم بنی اسرائیل نے یوشع بن نون کا ساتھ دیا اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ پر فتح عطا فرمائی اور چالیس برس کے بعد میدانِ تیہ سے ان کو نجات نصیب ہوئی۔ اور بیت المقدس میں فاتحانہ انداز میں

داخل ہونے کا وقت آیا تو اس عظیم و جلیل نعمت کے حصول پر انہوں نے شکر کی بجائے طغیان و کفر کا راستہ اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بیت المقدس میں داخل ہونے کا حکم دیا اور فرمایا سجدہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی مغفرت کے لئے "حطۃ" کہتے ہوئے شہر کے دروازے میں داخل ہو جاؤ۔ مگر یہ لوگ حکمِ الٰہی کے خلاف سرین کے بل گھسٹتے ہوئے اور "حنطۃ" یا "حنطۃ فی شعرۃ" کہتے ہوئے داخل ہوئے مرادِ الٰہی تو یہ تھی کہ "حطۃ" کہہ کر وہ اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کریں۔ مگر انہوں نے "حطۃ" کو "حنطۃ" سے بدل دیا یعنی کہا کہ ہمیں گندم چاہیئے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ
قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا
يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع

تو بدل دیا ظالموں نے اس بات کو جو اُن سے کہی گئی تھی دوسری بات سے تو ہم نے ظالموں پر آسمان سے عذاب اُتارا کیونکہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ ۶۱ھ

۶۱ھ اللہ تعالیٰ نے "حطۃ" کہنے پر خطائیں معاف کرنے کا وعدہ فرمایا تھا اور یہ کہ نعمتوں پر بطورِ شکر، نیکی اور احسان کرنے والوں کے لئے ہم اپنی نعمتیں زیادہ فرمائیں گے۔ لیکن ان لوگوں نے ناشکری پر کمر باندھی اور مزید سرکشی اختیار کی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر آسمان سے طاعون کا عذاب نازل فرمایا۔ اس میں ستر ہزار افراد ہلاک ہو گئے۔ (قرطبی، ج: ۱، ص: ۴۱۱)

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا
اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ
مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ
اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ
رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾

اور جب پانی طلب کیا موسیٰ نے اپنی اُمت کے لیئے تو ہم نے فرمایا اپنا عصا اس پتھر پہ مارو تو اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے، بے شک ہر گروہ نے پانی پینے کی اپنی جگہ کو پہچان لیا۔ کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق سے اور نہ پھرو زمین میں فساد کرتے ہوئے۔ ۶۲ھ

۶۲ھ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ : اس واقعہ کا تعلق بھی میدانِ تیہ سے ہے تفصیل ابھی گزری ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ
وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ
الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا
وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ

الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ
اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ
وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ
وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا
یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ
النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا
وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم سے ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا۔ تو ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کیجئے (کہ) وہ (من وسلویٰ کی بجائے) ہمارے لئے زمین سے اگنے والی چیزیں پیدا کرے زمین کی سبزی (ترکاری) اور ککڑی اور گندم اور مسور اور پیاز۔ فرمایا کیا تم ادنیٰ چیز کو بہتر کے بدلے مانگتے ہو؟ اترو شہر میں تو بیشک (وہاں) تمہیں ملے گا جو تم نے مانگا اور ڈال دی گئی اُن پر ذلت اور محتاجی اور وہ اللہ کے غضب میں آگئے یہ اس وجہ سے کہ وہ اللہ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ اس لئے (بھی) کہ وہ نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھتے تھے۔ ۶۲ھ

۶۲ھ وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ : یہ بات بھی

بنی اسرائیل نے میدان تیہ میں کہی تھی (قرطبی۔ ج: ۱، ص: ۴۲۲) بنی اسرائیل عرصہ دراز تک بلا ناغہ "من وسلویٰ" کھاتے رہنے کی وجہ سے اکتا کر موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہم اب ایک ہی قسم کے کھانے پر صبر نہ کر سکیں گے "من وسلویٰ" دو مختلف قسم کے کھانوں کو ایک کھانا اس لئے کہا گیا کہ دونوں قسم کے کھانے وہ ایک ساتھ کھاتے تھے یا اس لئے کہ ہر روز بطور غذا انہیں یہی دو چیزیں ملتی تھیں۔ یہ نفیس کھانا باقی سب کھانوں سے بہتر تھا لیکن بنی اسرائیل کے اصرار پر ارشاد ہوا "اِهْبِطُوْا" تم مصر میں اتر جاؤ جو کچھ تم نے مانگا وہ تمہیں وہاں ملے گا۔ اس مصر کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ فرعون کا مصر تھا یا کوئی اور شہر۔ راجح قول یہ ہے کہ اس سے غیر متعین شہر مراد ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وادی تیہ کے قریب کوئی شہر تھا جس میں عارضی طور پر جانے کا حکم ان کی خواہش کے مطابق دیا گیا تھا۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ ۔ الایۃ: بڑھتی ہوئی نفسانی خواہشات کی بنا پر طاعت اور بندگی کی حدود سے بار بار یہود کا تجاوز اور طغیان ان کے حق میں دائمی ذلت و مسکنت پر منتج ہوا۔ قوم یہود پر ذلت و مسکنت کا مسلط ہونا ایسی حقیقت ثابتہ ہے جس کا انکار واقعات کی روشنی میں کوئی اہل انصاف نہیں کر سکتا قرآن مجید بھی علیٰ رؤوس الاشہاد فرما رہا ہے کہ ذلت و مسکنت اور دنیا و آخرت میں اللہ کا غضب ان کے حق میں مقدر ہو چکا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ یہود کی تاریخ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں سے بہت پرانی اور قدیم ہے۔ ابتدا سے لیکر آج تک ان کی تاریخ کو سامنے رکھ لیجئے کوئی دور ان کی ذلت اور مسکنت سے آپ کو خالی نظر نہیں آئے گا۔ حالانکہ ان میں ایک طبقہ بہت بڑا سرمایہ دار ہے لیکن انتہائی بخیل اور حریص۔ بخیل کتنا ہی مالدار ہو مگر بخل کی وجہ سے وہ ہمیشہ مسکینی کی ہیئت پر رہتا ہے اور حریص کمالِ حرص کے سبب ہر جائز و ناجائز طریقہ سے مال جمع کرنے کی فکر میں رنج و تعب میں مبتلا رہتا ہے۔ پھر یہ کہ سب یہودی مال دار نہیں بلکہ بہت سے یہود فقر و مسکنت کا شکار ہیں۔ حیوانیت و بربریت ظلم و جور دکھی انسانیت پر لرزہ خیز مظالم ان کی طبائع میں مرکوز ہیں۔

عہد شکنی، وعدہ خلافی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے ظلم و ستم کے باعث اقوام عالم کی نظروں میں واجب القتل گردن زدنی رہے ہیں۔ اسی لئے ان کی پوری تاریخ میں ایسا کوئی وقت نہیں آیا کہ ان کے جرائم کی پاداش میں لوگ انہیں قتل کرنے اور سخت تکلیفیں پہنچانے کے درپے نہ رہے ہوں۔ اور قرآن مجید کے اعلان کے مطابق یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا جیسا کہ سورۂ اعراف میں فرمایا۔ "وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ" یعنی آپ کے رب نے بتا دیا تھا کہ وہ ان یہود پر قیامت تک ایسے لوگوں کو بھیجتا رہے گا جو انہیں بدترین عذاب دیں گے۔ اس زمانہ میں بھی جب کہ یہود کی نام نہاد حکومت فلسطین میں قائم ہے مظلوم فلسطینی ہر وقت ان کی تاک میں رہتے ہیں گویا وہ یہودیوں پر مسلط ہیں۔ جب بھی انہیں موقع ملتا ہے وہ یہود کو تکلیفیں پہنچانے قتل کرنے اور قیدی بنانے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور یقیناً یہ صورت حال قیامت تک جاری رہے گی۔

البتہ ان کے لئے صرف جان و مال کی بے حرمتی سے بچنا اللہ کی رسی کے سہارے ہو سکتا ہے یا اس کے علاوہ ذلت و خواری سے محض بظاہر محفوظ رہنا لوگوں کی رسی کے ذریعے ممکن ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ" یعنی وہ جہاں بھی پائے جائیں ذلت ان پر مسلط کر دی گئی بجز اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی کے۔ اللہ کی رسی سے مراد قرآن اور اسلام ہے۔ قرآنی اور اسلامی حکم ہے "وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ" یعنی اگر کوئی مشرک تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دو۔ اور ارشاد فرمایا۔ "حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ" یعنی (اگر وہ پناہ طلب نہ کریں تو)۔ ان کا مال و جان محفوظ نہیں یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔ اگرچہ پناہ مانگنا اور جزیہ ادا کرنا دونوں باتیں موجب ذلت ہیں مگر اللہ کے دین میں مستأمن اور ذمی کا جان و مال بے حرمتی سے محفوظ رہتا ہے۔

اور لوگوں کی رسّی سے مُراد یہ ہے کہ غیر مُسلم لوگ ان سے معاہدہ کر کے ان کی حفاظت کا ذمّہ اُٹھالیں۔ جیسا کہ آج کل بعض غیر مُسلم بڑی طاقتوں نے یہُود سے معاہدہ کر کے ان کی حفاظت کا ذمہ اُٹھایا ہُوا ہے۔ جس کے بل بوتے پر فلسطین میں یہُود کی بے بنیاد حکُومت کا ڈھانچہ کھڑا ہے اگر وہ لوگ آج اپنا معاہدہ ختم کر دیں تو یہ نام نہاد حکُومت باقی نہ رہے۔ بعض مفسّرین نے "لوگوں کی رسّی" کا مفہوم "جزیہ" بیان کیا ہے ایسی صُورت میں اللہ کی رسّی اور لوگوں کی رسّی ایک ہی قرار پائے گی۔ حالانکہ اُنسب یہ ہے کہ یہ دونوں علیحدہ ہوں (ملخصاً البحر المحیط، ج: ۳، ص: ۳۲، ابن کثیر، ج: ۱، ص: ۳۹۶) غالباً اِسی لئے قُرآن مجید میں "وَحَبْلٌ مِّنَ النَّاسِ" کی بجائے "حَبْلٌ مِّنَ النَّاسِ" فرمایا گیا۔ ایسی حکُومت کا قیام قرآن کی پیشگوئی کے خلاف ہرگز نہیں بلکہ "حَبْلٌ مِّنَ النَّاسِ" کے الفاظ اس مسئلہ میں قرآنی صداقت کا اِعلان کر رہے ہیں اور دُنیا دیکھ رہی ہے کہ قُرآن کے مطابق محض لوگوں کے سہارے فلسطین میں بے بنیاد اسرائیلی حکُومت قائم ہے جو آج بھی حقیقی ذلّت و مسکنت اور اللہ کے غضب میں مبتلا ہے اور یقیناً آخرت میں بھی اللہ کے غضب میں یہ لوگ مُبتلا ہوں گے۔

وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ : بِغَيْرِ الْحَقِّ، سے یہ نہ سمجھا جائے کہ انبیاء علیہم السّلام سے (نعوذ باللہ) کوئی ایسا کام سرزد ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے ان کا قتل حق قرار پائے کیونکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام معصُوم ہیں ان سے کوئی ایسا کام نہیں ہو سکتا۔ یہاں "بِغَيْرِ الْحَقِّ" فرما کر انبیاء علیہم السّلام کے قاتلین کے فعل کا وصف بیان فرمایا کہ وُہ ناحق تھا۔ (قرطبی، جزاول، ص: ۴۳۲) اس آیت سے ثابت ہُوا کہ انبیاء علیہم السّلام کا قتل ان کی نبوّت کے خلاف نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے حق میں وعدۂ الٰہیہ "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" یعنی اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا۔ حضُور کی خصُوصیات سے ہے ورنہ نفسِ قتل کا نبی پر وارد ہونا ہرگز اس کی نبوّت کی نفی نہیں کرتا جس کی روشن دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "اگر رسُول پر موت طاری ہو جائے یا وہ مقتول ہو جائیں تو اے مسلمانو! کیا تم پچھلے پاؤں

پھر جاؤ گے؟ یعنی رسول کے لائے ہوئے دین کو چھوڑ دو گے؟" اس آیتِ کریمہ میں بنی اسرائیل کی انتہائی شقاوت قلبی کا بیان فرمایا اللہ کے نبیوں کو قتل کرنے والوں سے بڑھ کر کون شقی القلب ہو سکتا ہے؟ حضرت زکریا حضرت یحییٰ علیہما السلام اور اُن جیسے دیگر جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کو اُنہوں نے انتہائی بیدردی کے ساتھ شہید کیا۔ یہ سب کچھ یہود کی نافرمانی اور پرانی سرکشی کا ظہور تھا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ
هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ
بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ
وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ، اور صابئین جو بھی ایمان لایا اللہ اور قیامت کے دِن پر اور اس نے نیک عمل کئے تو ان کے لیئے اُن کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور اُن پر خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۶۲ھ

۶۲ھ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا۔ الآیۃ: اہلِ کتاب بنی اسرائیل جنت و نجات کا اہل صرف اپنے آپ کو سمجھتے تھے فلاح ابدی کا ٹھیکہ ان کے نزدیک اُن کے سوا کوئی نہ تھا خواہ اللہ کے دین کی اس کا یقین کتنا ہی کامل اور اس کے اعمال کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔ وہ کہا کرتے تھے "نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ" ہم ہی اللہ کے لاڈلے اور چہیتے ہیں۔ وُہ علی الاعلان کہتے تھے

"لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى" جنت میں ہرگز نہ جائے گا۔ مگر وہی جو یہودی یا نصرانی ہو۔ فلاحِ دارین نجاتِ اخروی اور جنت کو اُنہوں نے اپنے لئے مخصوص سمجھ رکھا تھا باقی کوئی قوم کوئی گروہ ان کے نزدیک اس فضل و انعام کا اہل نہ تھا۔ اِسلام نے ان کی اس عصبیت اور تنگ نظری کی مذمّت فرمائی اور یہ اعلان کیا کہ یہودی یا نصرانی یا صابی ہونا مدارِ نجات نہیں بلکہ نجات کی بنیاد صرف ایمان ہے اور اعمال صالحہ۔ یہاں اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لانے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اللہ کے فرشتوں آسمانی کتابوں اور دیگر ضروریاتِ دین کو ماننا نجات کے لئے ضروری نہیں اس لئے کہ اللہ پر ایمان لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ہر بات کو مانا جائے اللہ تعالیٰ کی کسی ایک بات کا انکار بھی کفر ہے جو ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا ضروریاتِ دین چونکہ سب اللہ کی طرف سے ہیں اس لئے ان سب کو ماننا ایمان باللہ ہے اور اس کا انجام چونکہ قیامت کے دن سامنے آئے گا اس لئے قیامت کے دن کا ماننا بھی ضروری ٹھہرا اور ظاہر ہے کہ کمالِ ایمان اعمال صالحہ کے بغیر متصور نہیں اس لئے "وَعَمِلَ صَالِحًا" فرمایا گیا۔ آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ گروہی خصوصیات مدارِ نجات نہیں بلکہ نجات کی اصل بنیاد ایمان اور عمل صالح ہے۔ مسلمان ہو یا یہودی، نصرانی ہو یا صابی جس میں کفر و شرک کا کوئی شائبہ نہ ہو، مومن ہو اور نیک عمل کرتا ہو وہی بے غم اور بے خوف ہے اور اُسی کے لئے جنت کی راہیں کشادہ ہیں اور ظاہر ہے کہ کتب سابقہ کی رو سے ایمان اور عمل صالح محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے بغیر متصور نہیں۔

وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى : دونوں کے بارے میں مختلف اقوال ہیں قولِ راجح یہی ہے کہ جن لوگوں نے دینِ یہودیت کو اپنایا وہ یہودی ہیں اور جنہوں نے عیسائیت اختیار کر کے اپنے آپ کو اللہ کا مددگار کہا وہ نصرانی ہیں۔ "صَابِئِيْنَ" وہ لوگ ہیں جو ایک دین سے دوسرے دین میں داخل ہوئے۔ اس کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں ایک قول یہ ہے کہ وہ یہودیت اور نصرانیت سے نکل کر فرشتوں کی پرستش کرنے لگے بعض نے کہا کہ وہ یہود اور

مجوس کے درمیان ایک قوم ہے یعنی اپنے عقائد و اعمال میں یہود و مجوس سے ملتے جلتے لوگ ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ اللہ کی ذات کا اقرار کرتے ہیں زبور پڑھتے ہیں فرشتوں کو پوجتے ہیں اور کعبہ کی طرف نماز ادا کرتے ہیں اور اقرب الی الصواب یہ ہے کہ وہ ستارہ پرست قوم ہیں۔ (خازن، ج ۱، ص ۵۴، مدارک، ج ۱، ص ۵۴)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ
الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا
مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾

اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور طور (پہاڑ) کو تمہارے اوپر اٹھایا (کہ) جو کچھ ہم نے تمہیں دیا (اسے) مضبوطی سے پکڑو اور جو اس میں ہے (اسے) یاد کرو تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ ۶۵

۶۵ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ : اس آیت کریمہ میں بنی اسرائیل کی ایک اور اشد ترین بغاوت و سرکشی کا ذکر فرمایا۔ وہ یہ کہ اس قوم نے موسیٰ علیہ السلام سے خود ہی مطالبہ کیا کہ ہمارے پاس اللہ کی کوئی کتاب آنی چاہیئے جس کے احکام کے مطابق ہم اپنی زندگی بسر کریں اور ان احکام کی روشنی میں فلاحِ دارین کی راہ پائیں۔ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جب ان کے پاس اللہ کی کتاب تورات لائے تو اس میں ان کی طبعی سرکشی اور طغیان کے لحاظ سے کچھ بھاری احکام بھی تھے مگر ایسے نہیں جو ناقابل عمل ہوں بلکہ اُن کی حالت کے مناسب اور حکمتِ الٰہیہ کے عین مطابق تھے۔ بنی اسرائیل نے صرف بغاوت اور سرکشی کی وجہ سے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم پر جبریل علیہ السلام نے پہاڑ کا ایک حصہ ان پر اٹھا لیا اور ارشاد ہوا: "خُذُوْا

مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ"۔ ہم نے تمہیں جو کچھ دیا اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو۔ اس پر ان سے پختہ عہد لیا گیا لیکن اُنہوں نے اس عہد کو بھی توڑا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے باطنی فساد کو خوب اچھی طرح ظاہر کرنے اور اُنہیں رُسوا کرنے کے لیے قرآن مجید میں لفظ "رَفَعْنَا" کے ساتھ ان پر پہاڑ اُٹھا لینے کا ذکر بار بار فرمایا ایک مرتبہ اسی آیت میں "وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ" فرمایا پھر اسی سُورت کی آیت ۹۲ میں "وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ" فرمایا۔ اس کے بعد سورۂ نساء کی آیت ۱۵۴ میں ان کی دیگر نافرمانیوں کے ساتھ پھر اسی واقعہ کا بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ "وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ" یعنی ہم نے اُن پر طُور کو اٹھا لیا۔ چوتھی مرتبہ سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۱ میں رفعِ طور کے اسی واقعہ کو "وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ" کے الفاظ کے ساتھ بیان فرمایا "اور یاد کرو جب ہم نے پہاڑ کو ان پر جڑ سے اکھاڑ لیا گویا کہ وہ سائبان ہے اور اُنہوں نے گمان کیا کہ وہ ان پر گرنے والا ہے" طُور سے مُراد طُور میقات ہے یا کوئی اور پہاڑ۔ راجح یہی ہے کہ وُہ طور میقات ہے۔

لغتِ عرب میں "نتق" کے اصل معنیٰ اقلع یعنی جڑ سے اکھاڑنا ہیں "قَالَ اَبُوْ عُبَيْدَةَ اَصْلُ النَّتْقِ قَلْعُ الشَّيْءِ مِنْ مَّوْضِعِهٖ"۔ یعنی امام لغت ابُو عبیدہ نے فرمایا کہ نتق کے اصل معنیٰ ہیں کسی چیز کو اس کی جگہ سے اکھاڑ دینا (کبیر، ج ۴، ص ۴۵۷) اور یہی معنیٰ مشہور و متعارف ہیں

بعض لوگ "نتق کے معنیٰ جڑ سے اکھاڑنا" تسلیم کرنے کے باوجود کہتے ہیں کہ جھٹکا دینا، ہلانا کھینچنا اور جھاڑنا کے معانی میں بھی لفظ نتق کلام عرب میں مستعمل ہے (لسان العرب، ج ۱۰، ص ۳۵۱) لہٰذا آیۃ کریمہ "وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ" کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم نے پہاڑ کو جھٹکا دے کر ہلایا یعنی پہاڑ میں زلزلے کی کیفیت پیدا فرما دی۔ میں عرض کروں گا کہ "نتق" کے اصل حقیقی معنیٰ صرف جڑ سے اکھاڑنا ہیں لیکن کسی مضبوط گڑی ہوئی چیز کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اسے جھٹکا دے کر ہلایا جائے، پھر اُسے کھینچا جائے کھینچنا جڑ سے اکھاڑنا ہے۔ جس کے بعد اُسے جھاڑ دیا جاتا ہے۔ معلوم ہُوا کہ یہ چاروں معنیٰ جڑ سے اکھاڑنے کے لوازمات اور مناسبات

میں سے ہیں۔ اصل معنی جڑ سے اکھاڑنا ہی ہیں۔ اِس آیت کی تفسیر میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے لے کر آج تک ان اصل اور مشہُور و متعارف معنیٰ کے علاوہ اور کوئی معنی منقول نہیں ہُوئے۔ اگر آیتِ کریمہ میں یہی مشہُور و متعارف معنیٰ مُراد نہ لیے جائیں تو قرآن مجید میں اس واقعہ میں تینوں جگہ لفظ "رَفَعْنَا" بے معنیٰ ہو کر رہ جائے گا۔ کیُونکہ پہاڑ خلقۃً بلند ہوتے ہیں۔ اُن کی یہ خلقی بلندی یہاں مُراد نہیں۔ یہ بلندی تو ہر پہاڑ میں پہلے ہی سے پائی جاتی ہے۔ لہٰذا یہاں لفظ "رَفَعْنَا" کے معنیٰ اُسی وقت مستقیم ہوں گے جب ایک خاص وقت میں پہاڑ کا اُس کی جگہ سے بلند کرنا مُراد لیا جائے۔ اسی کو جڑ سے اکھاڑنا کہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پہاڑ سائبان کی طرح ہو گیا اور جن لوگوں پر اُسے اکھاڑ کر بلند کیا گیا تھا اُنہوں نے گمان کیا کہ اب یہ سائبان ہم پر گرنے والا ہے۔ نظمِ قرآن کے پیشِ نظر اس آیت کے یہ معنی ہرگز دُرست نہیں ہو سکتے کہ "ہم نے پہاڑ میں محض زلزلہ پیدا کر دیا۔" جب تک پہاڑ کا جڑ سے اُکھڑ کر بلند ہونا مُراد نہ لیا جائے خواہ وہ کسی طرح ہو اُس وقت تک یہاں "رفع" اور "نتق" کے حقیقی معنی متحقق نہیں ہوتے جن کا متعذر ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں اور ظاہر ہے کہ جب تک اصل حقیقی معنی متعذر یعنی دشوار نہ ہوں اُنہیں چھوڑ کر مجازی معنی مُراد لینا جائز نہیں۔ "نتق" اور "رفع" کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے پہاڑ کا جڑ سے اکھاڑنا اور اُسے بلند کرنا کچھ دُشوار نہیں۔ "رَفَعْنَا" کے ساتھ "نَتَقْنَا" کے معنیٰ اسی وقت صحیح ہو سکتے ہیں جب "نَتَقَ" کے معنی جڑ سے اکھاڑنا ہوں۔ ایسی صُورت میں سب آیتوں کے معنی بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں کہ ہم نے پہاڑ کو جڑ سے اکھاڑ کر ان پر بلند کیا گویا کہ وُہ سائبان ہے اور اُنہوں نے گمان کیا کہ وہ اُن پر گرنے والا ہے۔ تعجب ہے کہ ان لوگوں نے متقدمین علماءِ اسلام کی تحقیقات کو پس پشت ڈال کر یہُود و نصاریٰ کی بے بنیاد کتابوں اور جدید ملحدانہ نظریات پر اعتماد کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ مادہ پرستی اور لادینی افکار سے متاثر ہو کر محض عقلِ ناتمام اور ناقص تجربات پر بھروسہ کر بیٹھتے ہیں جن کی نظر میں علماءِ متقدمین اور اسلاف کی تحقیقات

کوئی وقعت نہیں رکھتیں وہی لوگ کتاب وسُنّت کی نصوص میں غلط تاویلیں کرکے خود بھی گمراہی کا شکار ہوتے ہیں اور دُوسروں کو بھی گمراہ کرکے "ضَلُّوْا فَاَضَلُّوْا" کا مصداق بن جاتے ہیں (العیاذ باللہ تعالیٰ)، واضح رہے کہ پہاڑ کو اس کی جگہ سے اکھاڑ کر بلند کرنا اس لئے نہ تھا کہ تورات کے احکام ان سے جبراً منوائے جائیں بلکہ محض ان کی سرکشی اور طغیان کی وجہ سے تھا۔ لہٰذا اِس آیت کریمہ کا "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" سے کوئی تعارض نہیں۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٤﴾

پھر اس (اقرار) کے بعد تُم نے رُوگردانی کی تو اگر تُم پر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت نہ ہُوتی (تو) ضرور تُم نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہو جاتے۔ ۶۶ھ

۶۶ھ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ۔ الآیۃ: پھر تُم نے اپنے عہد کی خلاف ورزی کی اور اپنی خواہشات کے مطابق توراۃ کے احکام میں ردّوبدل کیا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نعت پاک کو چھپایا اور حق کو باطل سے ملایا۔ اگر تُم پر اللہ کی رحمت اور اس کا فضل نہ ہوتا کہ تمہیں محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثتِ مقدسہ کا زمانہ عطا فرمایا تو تُم من حیث القوم دنیوی عذاب سے نجات نہ پاسکتے اور سب ہلاک ہو جاتے اللہ تعالیٰ نے تمہیں مہلت عطا فرمائی کہ اب بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لاکر نقضِ عہد کا تدارک کر لو۔ کیونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لانا بھی اس عہد کا ایفا ہے جسے تُم توڑ چکے ہو تاحال تمہارے لیے موقع ہے کہ نقضِ عہد کے باوجود جس طرح تُم رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے طفیل دُنیا میں عذابِ الٰہی سے محفوظ رہے ان پر ایمان لاکر آخرت کے عذاب سے بھی نجات حاصل کر لو۔ اگر اس مقام

پر یہ شبہ پیدا کیا جائے کہ زمانہ بعثت میں بعض لوگوں پر عذاب آیا جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ "سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ" "عنقریب ہم ان (منافقین) کو دو مرتبہ عذاب دیں گے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس عذاب سے امان بن کر تشریف لائے اس سے مراد عذاب عام ہے۔ یعنی آپ کے زمانۂ بعثت میں کسی قوم پر ایسا عذاب عام نہیں آسکتا کہ اس قوم کا ہر فرد عذابِ الٰہی میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جائے۔ ہاں اگر کسی قوم کے بعض افراد پر ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے لوگوں کو عبرت دلانے کے لئے جزوی طور پر زمانۂ بعثت میں عذاب آجائے جیسا کہ آیتِ کریمہ: "سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ" کی رُو سے بعض منافقین پر عذاب آیا۔ تو ایسا عذاب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عذابِ عام سے امان بن کر تشریف لانے کے خلاف نہیں۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۶۵﴾

اور بیشک اُن لوگوں (کے انجام) کو تم (خوب) جانتے ہو جنہوں نے تم میں سے ہفتے کے دن میں حد سے تجاوز کیا تو ہم نے اُن سے کہا دھتکارے ہوئے بندر ہو جاؤ۔[۶۷]

---

۶۷ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ۔ الآیۃ: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہودِ مدینہ کو مخاطب فرما کر بنی اسرائیل کے ان عہد شکن لوگوں کا حال بیان فرمایا جو پہلے گزر چکے تھے۔ حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا زمانہ انہوں نے نہیں پایا۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس فضل و رحمت سے وہ محروم رہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

سے مروی ہے کہ حضرت داود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے لوگ شہر "ایلہ" میں رہتے تھے یہ شہر مدینہ منورہ اور شام کے درمیان ساحلِ سمندر پر آباد تھا۔ سمندر کا یہ کنارہ ایسا مقام تھا جہاں سال کے ایک مہینہ میں دریاؤں کی سب مچھلیاں اس کثرت سے جمع ہو جاتی تھیں کہ مچھلیوں کے سوا پانی نظر نہ آتا تھا۔ باقی گیارہ مہینوں میں صرف ہفتہ کے دن اسی نوعیت سے مچھلیاں جمع ہوتی تھیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے یہود کے لئے ہفتہ کا دن معظم بنایا تھا اور اسے عبادت کے لئے مقرر فرمایا تھا۔ اس دن ان کے لئے مچھلی کا شکار کرنا حرام تھا۔ یہ لوگ مچھلی کے شکار کے عادی تھے ان میں سے کچھ لوگوں نے حد سے تجاوز کر کے ہفتہ کی عظمت و حرمت کو اس طرح پامال کیا کہ انہوں نے سمندر کے کنارے بہت بڑے اور نہایت گہرے گڑھے کھود لئے تھے۔ ہفتہ کے دن سمندر سے گڑھوں میں پانی کا راستہ بنا دیتے تھے اور اس طرح قلیل پانی کے ساتھ اتنی کثیر مچھلیاں آجاتی تھیں کہ گڑھے مچھلیوں سے بھر جاتے تھے۔ گڑھوں کی گہرائی اور پانی کی قلت کی وجہ سے مچھلیاں گڑھوں سے کسی طرح نکل نہیں سکتی تھیں۔ اتوار کی صبح کو گڑھوں سے مچھلیاں نکال لاتے تھے۔ (تفسیر کبیر، ج:۱، ص:۵۵۳۔ رُوح المعانی، ج:۱، ص:۲۵۶۔ خازن، ج:۱، ص:۵۵۔ مدارک، ج:۱، ص:۵۵)

قرطبی کی ایک منقولہ روایت کے مطابق اُن کا طریق کار یہ تھا کہ ہفتہ کے دِن جب ساحلِ سمندر میں مچھلیاں ہی مچھلیاں ہوتی تھیں تو وُہ مضبوط دھاگے کر ان کے پھندوں میں مچھلیوں کو پھنسا دیتے تھے اور زمین پر گڑھی ہُوئی مضبوط میخوں کے ساتھ ان دھاگوں کو باندھ دیتے اور اتوار کے دن پانی سے نکال لاتے تھے (قرطبی، جُز:۱، ص:۴۴۰)

شہر "ایلہ" کے رہنے والے سب بنی اسرائیل گناہ میں شریک نہ تھے ان میں وُہ لوگ بھی تھے جنہوں نے ہفتہ کی ہتکِ حرمت کرنے والوں کو بہت روکا مگر وُہ باز نہ آئے بالآخر اُنہوں نے اپنی آبادی کو مُجرمین کی آبادی سے بالکل الگ کر لیا اور ایک ایسی دیوار قائم کر لی جو سرکشوں اور فرمانبرداروں کے درمیان حدِ فاصل تھی۔ ایک دِن وہ فرماں بردار لوگ جو

نافرمانوں کو معصیت سے منع کیا کرتے تھے۔ اپنے گھروں سے کاروبار کے لیئے باہر نکلے اور معصیت کاروں سے کوئی باہر نہ آیا تو یہ لوگ تفتیشِ حالات کے لیئے ان کی طرف گئے دیکھا تو وہ بندروں اور خنزیروں کی شکل میں مسخ ہو کر ذلیل و خوار ہو چکے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ہم نے انہیں اپنے حکمِ تکوینی سے ذلیل بندر بنا دیا۔" وَقَالَ قَتَادَةُ صَارَ الشَّبَابُ قِرَدَةً وَالشُّيُوخُ خَنَازِيرَ۔ "قتادہ نے کہا کہ ان کے جوانوں کو بندر اور بوڑھوں کو خنزیر بنا دیا۔ (قرطبی۔ جزء ۱، ص: ۴۴)

ظاہرِ قرآن سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقۃً مسخ کر دیئے گئے تھے۔ جمہور کا مذہب یہی ہے۔ ابن جریر نے مجاہد سے نقل کیا کہ ان کی صورتیں نہیں بلکہ ان کے دل مسخ ہو گئے تھے۔ لیکن جمہور کا مذہب صحیح ہے۔ ہفتہ کی بے حرمتی سے روکنے والے لوگ جب ان کے پاس آئے اور انہیں مسخ شدہ حالت میں دیکھا تو انہوں نے ان میں سے کسی کو نہ پہچانا لیکن مسخ ہو جانے والے انہیں پہچانتے تھے اور انہیں دیکھ دیکھ کر روتے تھے۔ تین دن وہ اسی حالت میں رہے پھر سب ہلاک ہو گئے۔ مسخ ہو جانے والوں کی نسل نہیں ہوتی۔ جمہور علماء کا مذہب یہی ہے۔ بعض حضرات جیسے ابن العربی مالکی کا قول یہ ہے کہ مسخ ہو جانے والوں کی نسل ہوتی ہے۔ اور موجودہ بندر انہیں مسخ شدہ یہود کی نسل سے ہیں۔ ان کی دلیل تین حدیثیں ہیں۔ ایک حدیث بروایت ابی سعید و جابر رضی اللہ عنہما صحیح مسلم میں وارد ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گروہ سے اظہارِ نفرت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: "ہو سکتا ہے کہ یہ ان اہلِ قرون سے ہو جو گروہ کی صورت میں مسخ کر دیئے گئے تھے۔ دوسری وہ حدیث ہے جو بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ۔ صحیح مسلم میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ بنی اسرائیل کی ایک جماعت لاپتہ ہو گئی معلوم نہیں اس کا کیا انجام ہوا۔ میری رائے میں وہ یہی چوہے ہیں کہ اگر اونٹ کا دودھ ان کے لئے رکھ دیا جائے تو وہ نہیں پیتے بکری کا دودھ پی لیتے ہیں۔ ان کی تیسری دلیل بخاری شریف

میں حضرت عمرو بن میمون رضی اللہ عنہ کی وُہ روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں میں نے جاہلیت کے زمانہ میں دیکھا کہ ایک بندر نے بندریا کے ساتھ زنا کیا تو بندروں نے اسے رجم کیا اُن کے ساتھ میں نے بھی اسے رجم کیا۔

ان تینوں حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مسخ شُدہ قوموں کی نسل ہوتی ہے۔ علامہ قرطبی نے یہ تفصیل اپنی کتاب تفسیرِ قرطبی میں بیان فرمائی۔ پہلی دو حدیثوں کا جواب یہ ہے کہ گوہ اور چوہے کے بارے میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد محض تخوّف اور اندیشہ پر مبنی تھا یعنی خوفِ الٰہی کے غلبۂ حال میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے محض خوف اور اندیشہ کی بنا پر یہ بات ارشاد فرمائی جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حقیقتِ حال کی طرف بذریعہ وحی متوجہ فرما دیا کہ مُعذّب اور مسخ شُدہ قوموں کی نسل اللہ تعالیٰ نے نہیں بنائی۔ جیسا کہ بروایت عبداللہ بن مسعُود رضی اللہ عنہ صحیح مُسلم میں وارد ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سوال کیا گیا کہ بندر اور خنازیر اُنہیں لوگوں میں سے ہیں جو مسخ کر دیئے گئے تھے؟ رسُول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جن قوموں کو عذاب میں مبتلا کرکے ہلاک کر دیا اُن کی نسل نہیں بنائی۔ لوگوں کے مسخ ہونے سے پہلے بھی بندر اور خنزیر موجُود تھے۔ بندروں کے رجم کی روایت پر کلام کرتے ہُوئے علامہ قرطبی نے فرمایا یہ حدیث صحیح بخاری کے اکثر نسخوں میں نہیں پائی گئی اور روایت کے اِعتبار سے بھی یہ قابلِ قبُول نہیں۔ بالفرض مان بھی لیا جائے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وُہ بندر مسخ شُدہ یہُود کی نسل سے تھے بلکہ ممکن ہے کہ وہ بندروں کی شکل میں جنّات ہوں جو احکام شرع کے مکلّف ہیں[1]۔

مسخ اور تناسخ: کفار کے بعض فرقے مثلاً آریہ وغیرہ جو انسانوں کی دائمی جزائے اعمال کے لئے عالمِ آخرت، دوزخ و جنّت اور مرنے کے بعد قیامت کے دِن اُٹھنے پر یقین نہیں رکھتے اور "مَعَاد" کے مُنکر ہیں۔ کہتے ہیں کہ اِنسانی رُوحیں اپنے

اعمال کی جزاوسزا بھگتنے کے لئے ہمیشہ سے آواگون کے چکر میں ہیں. ہر شخص مرنے کے بعد اپنے اعمال کے مطابق کوئی دُوسرا جنم لیتا ہے. اچھے کام کرنے والا مرنے کے بعد اچھا جنم لیتا ہے جس میں وہ آرام و آسائش پاتا ہے. پھر اس جنم میں اگر اُس نے بُرے کام کئے تو مرنے کے بعد بُرا جنم لیتا ہے. مثلاً کوئی بندر اور کوئی خنزیر کا جنم لے کر اپنے بُرے کاموں کی سزا پاتا ہے. یہ سلسلہ ہمیشہ سے چلا آرہا ہے اور ہمیشہ اِسی طرح چلتا رہے گا۔ وُہ قرآن مجید کی ان تمام آیات سے جن میں لوگوں کی بداعمالیوں کی دائمی نہیں بلکہ دُنیا میں عبرت اور نصیحت کے لئے محض عارضی سزا کے طور پر ان کے بندر یا خنزیر کی صُورت میں مسخ ہو جانے کا ذکر وارد ہے. اپنے مذہب "آواگون" پر استدلال کرتے ہیں. اگرچہ ان کے اِس مضحکہ خیز مذہب پر ان کا یہ استدلال ظاہر البطلان ہے. تاہم یہاں "تناسخ اور مسخ" کا فرق سمجھ لینا ضروری ہے وہ یہ کہ تناسخ کے معنی ہیں اسی عالم دُنیا میں رُوح کا ایک جسم سے نکل کر دُوسرے جسم میں داخل ہونا. اور مسخ کے معنی ہیں رُوح کا جسم میں رہتے ہوئے جسمانی صُورت کا بدل جانا. جو لوگ مسخ کئے گئے ان کی رُوحیں اُن کے اجسام میں حسب سابق موجود تھیں وُہ مَرے نہیں تھے. زندہ ہونے کی حالت میں مسخ ہُوئے تھے پھر مسخ ہونے کے بعد اُنہیں موت آئی. لہٰذا "مسخ" سے "تناسخ" ثابت کرنا باطل محض ہے. میرے اوائل عُمر اور طالب علمی کے زمانے کی بات ہے کہ امرتسر میں آریہ سماج کے سالانہ جلسہ کے موقع پر پنڈت رام چندر جی سے دیگر موضوعات پر گفتگو کے بعد "تناسخ" کی بحث میں ان کے اسی استدلال کا میں نے یہی جواب دیا جس کا معقول جواب پنڈت جی نہ دے سکے. گفتگو کے اختتام پر کہنے لگے آپ سے باتیں کر کے بہت لطف آیا اُمید ہے آئندہ سال بھی اسی موقع پر آپ ضرور مجھ سے ملیں گے. میں نے کہا آپ سے زیادہ اس گفتگو سے میں لطف اندوز ہُوا۔ اگر آپ اپنی زبان بتا سکیں تو مُلاقات میں آسانی رہے گی. اِس پر بھرے مجمع کے ساتھ پنڈت جی نے قہقہہ لگایا اور بات آئی گئی ہو گئی.

ارتکابِ حرام کے لئے یہُود کا حیلہ: یہُود کا یہ طرزِ عمل کہ وُہ ہفتہ کے

دن مچھلیوں کو قابو کر کے اتوار کی صبح کو انہیں نکال لاتے تھے۔ دراصل فعلِ حرام کو جائز قرار دینے کا ایک حیلہ تھا۔ اسی کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر مسخ کا عذاب نازل فرمایا کہ وہ بندروں کی صورت میں مسخ ہو کر تین دن کے بعد مر گئے۔ ایسا حیلہ پہلے بھی حرام تھا اور آج بھی ہماری شریعت میں حرام ہے۔ جیسا کہ حکمِ قرآنی "وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ" کے خلاف اگر کوئی مالکِ نصاب محض ادائے زکوٰۃ سے بچنے کے لئے سال گزرنے سے کچھ پہلے اپنا مال مثلاً بیوی کی ملک کر دے۔ پھر سال گزرنے سے پہلے صرف اس لئے کہ زکوٰۃ دینی نہ پڑے بیوی اپنے خاوند کو وہ مال واپس لوٹا دے تو یقیناً ایسا کرنا بدترین گناہ اور شدید ترین معصیت ہے۔ اگر کہا جائے کہ میاں بیوی میں سے کسی کی ملکِ نصاب پر بھی سال نہیں گزرا تو دونوں میں سے کسی پر بھی زکوٰۃ فرض نہ ہوئی پھر گناہ کیسے لازم آیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ صورتِ مذکورہ میں فرضیتِ زکوٰۃ سے بچنے کا حیلہ محض ادائے زکوٰۃ سے بچنے کے لئے ہے اور ادائے زکوٰۃ سے بچنا یقیناً معصیت ہے۔ لہٰذا معصیت کا حیلہ بھی معصیت ہی قرار پائے گا اور ترتبِ حکم یعنی زکوٰۃ فرض نہ ہونے کے باوجود ایسا کرنا حکمِ قرآنی "وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ" کے ابطال کے مترادف ہوگا۔ اسی طرح ہر وہ حیلہ جو اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے ابطال کے لئے ہو یا اس کے ذریعہ کسی کی حق تلفی مقصود ہو یقیناً حرام ہوگا۔ لیکن گناہ سے بچنے اور فعلِ حرام کے ارتکاب سے محفوظ رہنے کے لئے بطریقِ مباح اگر کوئی حیلہ کیا جائے تو وہ پہلے بھی جائز تھا اور اب بھی ہماری شریعت میں جائز ہے۔

سیدنا ایوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زوجہ مطہرہ جو ان کی طویل اور شدید علالت کے زمانہ میں تنہا اُن کی تیمارداری کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ انہیں کی خدمت گزاری کے کام میں مصروف رہنے کے باعث کچھ تاخیر سے حاضر ہوئیں۔ محض اس معمولی سی فروگزاشت پر ایوب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قسم کھالی کہ اگر میں صحت یاب ہو گیا تو اپنی زوجہ مطہرہ بی بی رحمت کو سو کوڑے ماروں گا۔ ان کی شریعت میں چونکہ قسم توڑنے کا کفارہ مشروع نہ تھا اس لئے

شفایاب ہونے کے بعد انہیں فکر لاحق ہوئی کہ اگر میں اپنی قسم پوری کرتا ہوں تو میری خدمت گزار وفادار اور بے گناہ بیوی کو سو کوڑے مارنے کی سخت اذیت پہنچے گی اور اگر پوری نہیں کرتا تو اپنی قسم میں (معاذ اللہ) حانث قرار پاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کو گناہ سے بچنے اور بے گناہ بی بی رحمت کو اذیت سے بچانے کے لئے حیلہ بتایا۔ ارشاد ہوا۔ "وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ" (سورۃ صٓ، آیت: ۴۴) اپنے ہاتھ میں ایک مٹھا لے کر اس کے ساتھ اسے مار دیں اور اپنی قسم میں حانث نہ ہوں یعنی پتلی پتلی سو شاخوں پر مشتمل ایک مٹھا ہاتھ میں لے کر صرف ایک دفعہ اپنی زوجہ مطہرہ کو مار دیجئے۔ اس طرح آپ کی قسم پوری ہو گی اور آپ کی بے گناہ زوجہ بھی سو کوڑوں کی اذیت سے محفوظ رہیں گی۔ بعض علما کے نزدیک یہ حیلہ حضرت ایوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے خاص تھا لیکن ائمہ احناف و دیگر فقہا کا قول ہے کہ دوسروں کے لئے بھی جائز ہے بشرطیکہ ہر شاخ کا تھوڑا بہت حصہ مضروب کے بدن کو ضرور لگ جائے۔ اور اس کے لگنے سے کچھ نہ کچھ تکلیف بھی اسے ضرور پہنچے۔ امام ابن ہمام نے فرمایا حق یہ ہے کہ بالکل تکلیف پہنچے بغیر ایسا مٹھا مارنے سے قسم کے پورا ہو جانے کی خصوصیت حضرت ایوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زوجہ مطہرہ بی بی رحمت رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حق میں صرف کمال رحمت کے لئے تھی اور یہ خصوصیت فی الجملہ مشروعیت حیلہ کے باقی رہنے کے منافی نہیں (فتح القدیر۔ ج: ۴، ص: ۹۹) احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس حیلہ پر عمل فرمایا۔ ایک بیمار انتہائی کمزور مسلمان پر جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حد زنا قائم کرنے کا حکم دیا تو صحابہ کرام نے عرض کیا کہ حضور وہ سو کوڑوں کی مار برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر ہم نے اس پر حد قائم کی تو وہ مر جائے گا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کھجور کے درخت کا ایک خوشہ لے آؤ جس میں پتلی پتلی سو شاخیں ہوں وہ اسے ایک مرتبہ مارو اور بس (مسند احمد بن حنبل۔ ص: ۲۲۲، ج: ۵۔ ابوداؤد، ص: ۱۲۱، ج: ۴ بزت۔ ابن ماجہ، ص: ۱۸۵، ج: ۲ مصر) حیلہ اس خفیہ طریقہ کو کہتے ہیں جو مقصود حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا جائے۔

اگر وہ مقصد ناجائز ہے تو حیلہ بھی ناجائز اور اگر وُہ مقصد جائز ہے تو حیلہ بھی جائز ہوگا۔
اللہ تعالیٰ سے ڈر کر گناہ سے بچنے والوں کے لیے جوازِ حیلہ کی خوشخبری قرآن مجید میں وارد ہے۔
ارشاد فرمایا۔ "وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا" اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے یہی
راستہ وُہ حیلہ ہے جسے فقہاءِ کرام نے جائز قرار دیا ہے اور جس حیلہ کا مقصد ہی گناہ ہو آج
تک کسی فقیہہ نے اُسے جائز نہیں کہا۔ حیلوں کے بارے میں فقہائے احناف پر بعض لوگوں
نے شدید اعتراضات کئے ہیں مگر وُہ آج تک یہ ثابت نہ کر سکے کہ جس حیلہ کا مقصد گناہ ہو
فقہائے احناف اسے بھی جائز کہتے ہیں؟ کسی حیلہ پر حُکم کے مرتب ہو جانے کا ذکر فقہاؑ نے
ضرور کیا ہے۔ مثلاً ادائے زکوٰۃ سے بچنے کے اسی مذکورہ حیلہ کے بارے میں جب کہ کسی کی
ملکِ نصاب پر پُورا سال نہ گزرے ترتبِ حُکم کے طور پر فقہاؑ نے لکھا ہے کہ ایسی صُورت میں
کسی پر زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔ مگر یہ حیلہ کر کے فرضیت زکوٰۃ سے بچنا چُونکہ محض ادائے زکوٰۃ سے فرار
کے لئے ہے جو سخت گناہ ہے۔ اس لئے کسی فقیہہ نے ایسے حیلہ کو جائز نہیں کہا۔ در اصل معترضین
نے کہہ دیا کہ یہ اُن کے نزدیک جائز ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں فقہاؑ کے نزدیک وہی حیلہ جائز
ہے جو گناہ سے بچنے کے لئے ہو۔ ناجائز مقصد کے لئے ہر حیلہ اُن کے نزدیک حرام اور معصیت ہے۔
حافظ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا حیلہ کے بارے میں امام ابُو یُوسف کے کتاب تصنیف کرنے کی وجہ سے
احناف کے متعلق حیلوں کا قول مشہور ہو گیا ہے لیکن امام ابُو یُوسف اور کثیر ائمہ احناف کے متعلق
جانی پہچانی یعنی ثابت شدہ بات یہ ہے کہ وہ ہر حیلہ کو جائز نہیں کہتے۔ وُہ جواز حیلہ کو "قصدِ حق" کی قید سے
مقید کرتے ہیں۔ صاحب محیط نے کہا حیلوں کی اصل اللہ تعالیٰ کا قول "وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا" الآیہ
ہے اور اس کا ضابطہ یہ ہے کہ اگر وُہ حیلہ حرام سے بھاگنے اور گناہ سے بچنے کے لئے ہو تو بہت
اچھا ہے اور اگر کسی مسلمان کا حق باطل کرنے کے لئے ہو تو اچھا ہونے کی بجائے سخت گناہ اور سرکشی
ہے انتہیٰ (فتح الباری۔ ص: ۲۷۵، ج: ۱۲)

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ

يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾

تو ہم نے (ان کی سزا کے) اس (واقعہ) کو اُن لوگوں کے لئے جو اُس وقت موجود تھے اور جو اس کے بعد آنے والے تھے عبرت اور پرہیزگاروں کے لئے نصیحت بنا دیا۔ ۶۸

۶۸ نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا الآیہ: "نکال" کے معنی ہیں زجر و عقوبت یعنی سرزنش اور سزا (قرطبی: ص: ۲۴۳، جز اوّل) ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں عبرت انگیز ہیں اسی لئے یہاں علماء نے "نکال" کا ترجمہ "عبرت" کیا ہے۔ "مَا بَيْنَ يَدَيْهَا" سے وہ لوگ مراد ہیں جو اس واقعۂ مسخ کے وقت موجود تھے۔ عام اِس سے کہ وہ متقی ہوں یا نافرمان۔ اسی طرح "مَا خَلْفَهَا" سے وہ لوگ مراد ہیں جو بعد میں آنے والے ہوئے عام اِس سے کہ وہ گنہگار ہوں یا پرہیزگار اللہ تعالیٰ نے گنہگاروں کے لئے اس واقعہ کو عبرت بنایا اور پرہیزگاروں کے لئے نصیحت، پرہیزگاروں کی تو شان یہی ہے کہ اِس قسم کے واقعات سے وہ ضرور نصیحت حاصل کرتے ہیں اِس لئے یقیناً وہ خوش نصیب ہیں۔ لیکن انتہائی بدنصیب ہیں وہ سرکش اور نافرمان لوگ جو اس قسم کے واقعات سے عبرت نہیں پکڑتے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ

اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ
اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ
عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٨﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ
قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ
لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ
يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ
وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ اِنَّهٗ
يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ
وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ
قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا
كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧١﴾ ع ۵

اور جب موسیٰ نے اپنی امت سے فرمایا بیشک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے ایک گائے ذبح کرنے کا
وہ بولے کیا آپ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں؟ (موسیٰ نے) فرمایا اللہ کی پناہ کہ میں نادانوں سے ہو جاؤں
انہوں نے کہا ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کیجئے وہ ہمیں بتا دے وہ کیسی ہے؟ موسیٰ نے
فرمایا بیشک وہ فرماتا ہے یقیناً وہ ایک گائے ہے نہ بوڑھی اور نہ بچھیا (بلکہ) اس کے درمیان

متوسط عُمر کی، پس بجالاؤ جو تُمہیں حُکم دیا جاتا ہے۔ اُنہوں نے کہا ہمارے لئے اپنے رب سے دُعا کیجئے وُہ ہمیں بتائے اُس کا رنگ کیا ہے؟ مُوسیٰ نے فرمایا بیشک وہ فرماتا ہے یقیناً وہ زرد گائے ہے گہرے چمک دار رنگ کی دیکھنے والوں کو اچھی لگتی ہے وہ بولے اپنے رب سے ہمارے لئے دُعا کیجئے وُہ ہمیں کھول کر بتائے اُس کا وصف کیا ہے؟ بیشک گائے ہم پر مشتبہ ہوگئی اور بیشک اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پا جائیں گے مُوسیٰ نے فرمایا بیشک وہ فرماتا ہے یقیناً وہ گائے ہے جو نہ محنت کش ہے کہ زمین میں ہل چلاتی ہے اور نہ وہ کھیتی کو پانی دیتی ہے صحیح سالم ہے (یک رنگ) جس میں کوئی (داغ) دھبہ نہیں۔ وُہ بولے اب آپ ٹھیک بات لائے پھر اُنہوں نے اسے ذبح کیا اور وُہ (یہ کام) کرنے کے قریب نہ تھے۔ ۶۹ھ

۶۹ھ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ۔ الآیۃ: اللہ تعالیٰ نے مُوسیٰ علیہ السلام کی قوم کو ایک گائے ذبح کرنے کا حُکم دیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک قتلِ ناحق کا واقعہ پیش آگیا تھا جس میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں۔ ایک قول کے مُطابق عامیل نامی ایک اسرائیلی نہایت دولت مند تھا۔ ایک چچازاد کے سوا کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اس کا وارث بنتا۔ چچازاد اسی انتظار میں تھا کہ عامیل کو موت آئے تو میں اس کا وارث بنوں۔ طویل انتظار کے بعد میراث کے لالچ میں اُس نے عامیل کو قتل کر دیا۔ بعض نے کہا قتل کرنے والا بھتیجا تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ قاتل مقتول کا بھائی تھا۔ (البحر المحیط۔ ج: ۱، ص: ۲۴۹) قرطبی۔ جزاوّل، ص ۴۵۶) دیگر مفسرین نے بھائی یا بھتیجے کا قول نقل نہیں کیا صرف چچازاد یا چچازادوں کے ذکر پر اکتفا کیا۔ دیکھئے (خازن۔ ص: ۵۶، ج: ۱۔ مدارک۔ ص: ۵۶، ج: ۱۔ مظہری ص ج: ۱۴ صاحب رُوح المعانی نے ان اقوال کے علاوہ ایک قول یہ بھی نقل کیا کہ عامیل کی زوجہ بنی اسرائیل کی تمام عورتوں میں سب سے زیادہ حسینہ وجمیلہ تھی۔ اس کی زوجہ سے نکاح کرنے کی

طمع میں اس کے بعض قریبی رشتہ داروں نے اُسے ظلماً قتل کر دیا (روح المعانی، ص: ۲۵۹، پ ۱ اول) نکاح یا میراث کے طمع میں عامیل کو قتل کرنے کے بعد قاتل اس کی لاش کو اُٹھا کر ایک دُوسرے شہر کی طرف لے گیا اور اس شہر کے دروازے پر اسے ڈال دیا پھر قاتل خود اس کے خُون کے بدلے کا مطالبہ کرنے لگا اور کچھ بے گناہ آدمیوں کو پکڑ کر حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس لایا اور ان لوگوں پر قتل کا جھوٹا الزام لگا دیا جسے اُنہوں نے تسلیم نہیں کیا اور قوم میں زبردست اختلاف پیدا ہُوا اور صورتِ حال کے پیشِ نظر قتل کا معاملہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر مشتبہ ہو کر رہ گیا لوگوں نے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے درخواست کی کہ آپ اللہ تعالےٰ سے دُعا کریں کہ قاتل ظاہر ہو جائے۔ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس بارے میں اللہ تعالےٰ سے التجاء کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ واقعۂ قتل کی تحقیق اور گائے کے ذبح کرنے کے حکم میں بظاہر کوئی مناسبت نہ تھی اس لئے گائے ذبح کرنے کا حکم سُن کر وُہ لوگ کہنے لگے اے موسیٰ کیا آپ ہمارے ساتھ مذاق کرتے ہیں؟ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے حکم پہنچانے میں مذاق کرنا شدید ترین جہالت ہے میں اللہ کی پناہ لیتا ہُوں کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔

جب اُنہیں معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے گائے ذبح کرنا اُن پر واجب کر دیا ہے تو وہ مان گئے اگر اِس حکم کی تعمیل میں وہ کسی گائے کو بھی ذبح کر دیتے تو اُن کے لئے کافی ہو جاتا۔ لیکن اُنہوں نے گائے کے متعلق سوالات میں شدّت اِختیار کی اس لئے ان پر سختی کی گئی۔ اِس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حکمت تھی وہ یہ کہ بنی اسرائیل میں ایک صالح اِنسان تھا جس کا صرف ایک چھوٹا لڑکا تھا اور اس کی چھوٹی سی ایک بچھیا تھی جسے وُہ مردِ صالح جنگل میں لے گیا اور اُس نے بارگاہِ اُلوہیت میں عرض کی کہ اے اللہ! یہ بچھیا میں اپنے شیر خوار بچے کے لئے اس کے بڑے ہونے تک تیرے سپرد کرتا ہُوں چنانچہ اس کے بڑے ہونے تک وُہ بچھیا بھی جنگل میں جوان ہو گئی اور بنی اسرائیل کو شدتِ سوالات کے بعد جس گائے

کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا وہ یہی گائے تھی جو زرِ کثیر کے عوض اُنہیں حاصل کرنا پڑی وُہ زرِ کثیر اس صالح اِنسان کے ایسے نیک و صالح لڑکے کو ملا جو انتہائی غُربت و افلاس میں مُبتلا تھا اور اس کے باوجُود وُہ شب و روز عبادتِ الٰہی میں مشغُول رہتا تھا اور اپنی والدہ کا انتہائی فرماں بردار اور خدمت گزار تھا۔

مُوسیٰ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی قوم کو گائے ذبح کرنے کا جو حُکم دیا گیا تھا وُہ غیر مُبہم اور نہایت واضح تھا اگر وُہ اس پر عمل کر لیتے تو اُنہیں کوئی دقّت پیش نہ آتی لیکن اپنی طبعی سرکشی اور بغاوت کی بنا پر اُنہوں نے لایعنی اور نامعقُول سوالات کیے اور اُنہوں نے ایسی شدّت اِختیار کی جو آدابِ بندگی کے بالکل خلاف تھی۔ اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان کی اِس کج بحثی اور سرکشی کا مفصّل ذکر فرمایا۔ جس میں اُن کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انتہائی سرزنش پائی جاتی ہے مصلحتِ ایزدی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ایسی سرکش اور باغی قوم کو شدید ترین سرزنش کے ساتھ اچھی طرح رُسوا کیا جائے۔

فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ۔ جب ان کی شدّتِ سوالات کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان پر شدّت ہُوئی اور اس کے بعد اُن کے لئے کوئی مزید سوال کرنے کا موقع نہ رہا تو باوجُود یکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرنے سے گریزاں تھے مجبُوراً انہیں گائے ذبح کرنا پڑی

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا

فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ

تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ

كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا پھر اس (کے قتل) کا الزام ایک دُوسرے پر رکھنے لگے اور اللہ ظاہر فرمانے والا تھا جسے تم چھپاتے تھے۔ تو ہم نے کہا اس گائے کا ایک ٹکڑا مقتول کو مارو۔ اسی طرح اللہ (قیامت کے دن) مُردے جلائے گا۔ اور وہ (اس دنیا میں) تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔

ف۷۰ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ۔ الآیۃ۔ یہ اوّلِ قصہ ہے جس کے مؤخر ہونے کی وجہ اِنشاءاللہ آخر میں بیان ہوگی۔ اوّلِ قصہ کا خُلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں جب ایک قتل واقع ہو گیا تو کسی نے اُس قتل کا اِلزام قبول نہ کیا۔ اُنہوں نے باہمی اختلافِ شدید برپا کیا ایک نے دُوسرے کو مُوردِ الزام ٹھہرایا۔ قاتل کے گروہ کی کوشش یہ تھی کہ قتل کا معاملہ پوشیدہ رہے اور قاتل ظاہر نہ ہو۔ مشیئتِ الٰہیہ کا مقتضیٰ یہ تھا کہ یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہے اور قاتل سب کے سامنے ظاہر ہو جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حُکم دیا کہ گائے کا کوئی حصہ مقتول کے کسی عضو پر مارو جس کے بعد مقتول زندہ ہو کر خُود بتادے گا کہ میرا قاتل کون ہے۔ چنانچہ حسبِ اختلافِ اقوال گائے کے جسم کا ایک حصہ مقتول کے بدن کے کسی حصہ پر مارا گیا تو مقتول فوراً زندہ ہو گیا اور اُس نے بتادیا کہ میرا قاتل فلاں شخص ہے۔ رہا یہ امر کہ اس مقصد کے لئے گائے ذبح کرانے اور اُس کے ایک حصہ کو مقتول کے ایک حصۂ جسم پر مارنے کا حُکم دینے میں کیا حکمت کارفرما تھی؟ اِس کے بغیر بھی اللہ کی قُدرت سے مقتول کا زندہ ہو جانا ممکن تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس طریقہ کے بغیر مقتول زندہ ہوتا تو مُوسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں سحر کا شُبہ کیا جا سکتا تھا لیکن جو طریقہ ان کو بتایا گیا اس میں یہ شُبہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا چُونکہ یہ سب کچھ اُن کے اپنے ہاتھوں سے ہُوا۔ اب اوّلِ قصہ کے مؤخر ہونے کی وجہ بھی سمجھ لیجئے۔ وُہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی

معصیت، نافرمانی، سرکشی اور خیانت و بغاوت کے جو واقعات اس سے پہلے بیان فرمائے ان کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس باغی اور طاغی قوم کو بار بار سرزنش کی جائے۔ اِس حکمت کے لیے اس ایک واقعہ کو دو قصّوں میں بیان فرمایا گیا۔ پہلے قصّہ میں بیہودہ سوالات کر کے امرِ الٰہی۔ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ کی تعمیل میں تاخیر پر انھیں سرزنش کی گئی اور دُوسرے قصّہ میں قتلِ ناحق پر انھیں دوبارہ سرزنش فرمائی گئی۔ اگر گائے ذبح کرنے کے قصّہ پر قتلِ ناحق کے قصّہ کو مقدم کر دیا جاتا تو یہ ایک ہی قصّہ ہو جاتا اور مکرّر سرزنش کی حکمت فوت ہو جاتی اِس لیے گائے ذبح کرنے کے قصّہ کو پہلے بیان فرمایا گیا۔ پھر اس کے بعد قتلِ ناحق کا قصّہ بیان ہوا تاکہ مکرّر سرزنش کی حکمت پُوری ہو جائے۔

اگر کہا جائے کہ گائے کی کیا خصُوصیت تھی کسی اور جانور کے ذبح کرنے کا حُکم دے دیا جاتا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ خصُوصیت کا سوال گائے کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر جانور کے بارے میں یہ سوال ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ذبحِ بقرہ کے حُکم میں بعض فوائد تھے مثلاً گائے کی قُربانی کا طریقہ اُن میں پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ دُودھ گائے کی قُربانی کو عظیم ترین قُربانیوں میں شمار کرتے تھے۔ اور اِس حُکم میں سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ اس کے ذریعہ گائے کی قیمت میں اس کے مالک کو مالِ کثیر حاصل ہو گیا!

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ

وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ
الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ
اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

پھر اس کے بعد تمہارے دل (اور زیادہ) سخت ہو گئے تو وہ پتھروں کی طرح ہیں۔ بلکہ اُن سے بھی زیادہ سخت اور بے شک پتھروں میں سے بعض (پتھر) ضرور ایسے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں اور بے شک اُن میں سے یقیناً وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان سے پانی نکلتا ہے اور بے شک کچھ ان میں سے ضرور وہ ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔ ۷۴

---

۷۴ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ. الآیۃ
مذکورہ واقعات کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم و قدرت صنعت و حکمت اور رحمت و غضب کی چمکتی ہوئی جو عظیم نشانیاں بنی اسرائیل کو دکھائیں اُن کا مقتضیٰ یہ تھا کہ بنی اسرائیل اصلاح پذیر ہوتے۔ اپنی خیانت و بغاوت اور جرائم کے ارتکاب پر رب تعالیٰ کے حضور نادم و شرمندہ ہوتے اور خوف الٰہی سے اُن کے دل نرم ہو جاتے۔ مگر اس کے برعکس وہ پہلے سے زیادہ سخت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی اِسی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً" کہ ان کے دل پتھر بلکہ اُس سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ کیونکہ کچھ پتھر ایسے ہیں جن سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور اللہ کی مخلوق کو اُن سے نفع کثیر حاصل ہوتا ہے۔ اور بعض پتھر پھٹ جاتے ہیں جن سے پانی نکلتا ہے اُس سے بھی لوگ کچھ نہ کچھ نفع اُٹھاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے پتھر بھی ہیں کہ اگرچہ اُن سے پانی

نہیں نکلتا لیکن خوف اور خشیتِ الٰہیہ سے متاثر ہو کر وہ گر جاتے ہیں مگر ان بنی اسرائیل کا یہ حال ہے کہ ان سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ یہ اپنے آپ کو بھی فائدہ پہنچانے سے محروم ہیں۔ اور خوفِ الٰہی سے اللہ تعالیٰ کے حضور گر جانا تو بڑی بات ہے ان کے دلوں میں تو کبھی سوز و گداز بھی پیدا نہیں ہوا۔ ان لوگوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ جن کاموں کے سبب وہ اس حال پر پہنچ گئے ہیں اللہ ان کاموں سے بے خبر نہیں۔

فائدہ : خشیتِ الٰہیہ سے بعض پتھروں کا گر جانا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جمادات میں بھی ایک قسم کا ادراک اور احساس پیدا فرمایا ہے۔ جو حیوانات کے ادراک و احساس سے مختلف ہے۔ بعض دیگر آیاتِ قرآنیہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے مثلاً۔ "قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ" (ہم نے آگ سے کہا اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈک اور سلامتی ہو جا) احادیث بھی اس پر شاہدِ عادل ہیں۔ حدیث شریف میں وارد ہے۔ "هٰذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ" یہ پہاڑ (اُحد) ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں (بخاری۔ ص: ۵۸۵، ج: ۲)

أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ
فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ
يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ
وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۷۵﴾

تو (اے مسلمانو) کیا تمہیں توقع ہے کہ وہ (یہودی) تمہارا یقین کر لیں گے۔ حالانکہ بیشک اُن میں سے ایک گروہ تھا کہ وہ اللہ کا کلام سنتے پھر سمجھنے کے بعد اسے

جان بُوجھ کر بدل دیتے۔ ۱۲

---

۷۲ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ۔ الآیۃ۔ یہُودِ مدینہ چُونکہ انصار کے حلیف اور ان کے پڑوسی تھے اِس لِئے انصار کی خواہش تھی کہ وُہ ایمان لے آئیں اور اُنھیں ان کے ایمان لانے کی اُمید بھی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انصار کو مخاطب فرما کر ارشاد فرمایا کہ اے مُسلمانو تُم ایسے لوگوں سے ایمان لانے کی اُمید رکھتے ہو جن میں سے ایک گروہ اللہ کے کلام کو سُننے اور اُسے سمجھنے کے بعد جان بُوجھ کر اس میں تحریف کرتا تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ اس آیت میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے خطاب ہے جیسا کہ اس کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے منقول ہے۔ کہ اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، یہُود جو آپ کی تکذیب کرتے ہیں آپ اس پر غمگین نہ ہوں (قُرطبی۔ ص: ۱، جُز: ۲)

"كَلَامَ اللّٰهِ" سے مُراد قول راجح کے مُطابق تورات ہے۔ مُجاہد اور سُدی نے کہا کہ تحریف کرنے والے علماءِ یہُود ہیں جو توراۃ میں لفظی و معنوی تحریف کرتے تھے۔ وہ لوگوں کی خواہشات کے مُطابق حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیتے تھے حالانکہ وُہ حقیقتِ حال کو اچھی طرح سمجھتے اور جانتے تھے۔

اس آیتِ کریمہ میں یہُود پر زجر و توبیخ ہے کہ اُنہوں نے بُرائیوں اور عناد میں اپنے باپ دادا کا طریقہ اِختیار کیا۔ اور اس زجر و توبیخ کے ساتھ مُسلمانوں کو اُن کے ایمان لانے کی طرف سے نا اُمید کرنا ہے کہ جن لوگوں کا یہ حال ہے تو اُن کے مُسلمان ہونے کی اُمید نہ رکھو۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہُوا کہ حق کو جاننے والے عُلماء اگر حق کے خلاف عناد سے کام لیں تو رشد و ہدایت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ وُہ اللہ کی وعید اور اُس کے عذاب کے سزاوار ہیں۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا

اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا
اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ
لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾
اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ
وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾

اور جب ایمان والوں سے ملیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب آپس میں ایک دُوسرے کے ساتھ تنہائی میں ہُوں (تو) کہتے ہیں کیا تم وہ (حق) باتیں ان (مسلمانوں) کو بتا دیتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولیں۔ کہ وُہ اس سے تمہارے رب کے سامنے تم پر حجت قائم کریں کیا تم عقل نہیں رکھتے؟۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وُہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ ۷۳ھ

۷۳ھ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا. الاٰیۃ : یہ آیت منافقوں کے بارے میں اُتری۔ یہُود کا ایک گروہ منافق تھا ان میں سے بعض لوگ صرف اپنے ایمان کا یقین دلانے کے لئے مُسلمانوں پر کچھ ایسی باتیں ظاہر کر دیتے تھے جن کا اظہار دُوسرے منافقین کو پسند نہ تھا۔ مثلاً توراۃ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نعت پاک جو یہُودی چھپاتے تھے۔ وُہ لوگ مُسلمانوں پر اس کا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ اِسی طرح ان کے آبا۔ پر ذلت کے جو عذاب آئے ان کا ذکر بھی وہ مُسلمانوں سے کر دیتے تھے۔ دُوسرے منافق تنہائی میں ان سے کہتے تھے کہ تم ایسی باتیں مُسلمانوں کو کیوں بتا دیتے ہو جن کی وجہ سے وُہ ہم پر حُجت قائم کریں۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾

اور اُن میں بعض ان پڑھ ہیں۔ جو زبان سے لفظوں کو پڑھ لینے کے سوا (اللہ کی) کتاب (کے معانی) کا کچھ علم نہیں رکھتے اور وُہ صرف (اپنے وہم و) گمان میں پڑے ہوئے ہیں ﴿۷۸﴾

۷۸ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ۔ الآیۃ: قوم یہود میں اہل علم بھی تھے جن میں ایک طبقہ دیانت اور تقویٰ سے متصف تھا جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ان کے علاوہ علمائے یہود میں ایسے لوگ بھی تھے جو خشیت الٰہیہ سے محروم اور محض دنیوی طمع اور لالچ کا شکار تھے۔ وہ ان پڑھ لوگوں سے مالی منفعت حاصل کرنے کے لئے ان کی خواہشات کے مطابق اُنہیں مسائل بتاتے اور من گھڑت باتیں اُنہیں سناتے تھے۔ وہ لوگ اُن پڑھ ہونے کی وجہ سے اللہ کی کتاب کے علم سے محروم تھے۔ اپنے حسبِ منشاء احکام و مسائل سُن کر وُہ خُوش ہو جاتے اور علم کتاب کی بجائے محض اپنے گُمان کے مطابق دُنیا پرست عُلماء کی اندھی تقلید کرتے تھے۔ "اُمِّيُّوْنَ" اُمّی کی جمع ہے جو منسوب الی الاُمّ ہے۔ یعنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد کسی سے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا نہ کسی اُستاد سے علم حاصل کیا۔ اس آیتِ کریمہ میں "اُمِّيُّوْنَ" سے جہلاء یہود مُراد ہیں۔ جنہیں توراۃ کا کچھ علم نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ توراۃ پڑھ لیتے تھے۔ لیکن اس کے معنی سمجھنے میں وُہ جاہل تھے اُنہیں توراۃ کے معانی کا کچھ علم نہ تھا۔ "اَمَانِيَّ" "اُمْنِيَّةٌ" کی جمع ہے۔ جھُوٹی من گھڑت بات کو "اُمْنِيَّةٌ" کہتے ہیں۔ اِس آیت کریمہ میں "اَمَانِيَّ" سے وہ جھُوٹی مَن گھڑت باتیں مُراد ہیں جو اَحبارِ یہود اپنی قوم کے جاہلوں کو اپنی طرف سے گھڑ کر سُنا دیا کرتے تھے۔ "اُمْنِيَّةٌ" تلاوت کو بھی کہتے ہیں اِس لئے ایک قول یہ ہے

کہ جہلا، یہود توراۃ کی تلاوت کے سوا اس کے معانی و مطالب میں سے کچھ نہ کچھ جانتے تھے اور جو کچھ ان کے احبار کہتے تھے اُسی کو وہ مان لیتے تھے۔ اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں لوگوں کا حال بیان فرمایا

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ
بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا
كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

تو بڑی خرابی ہے اُن کے لئے جو (اللہ کی) کتاب (میں من گھڑت باتیں) اپنے ہاتھوں سے لکھیں پھر کہہ دیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت حاصل کرلیں تو ان کے لئے ہلاکت ہے اس چیز سے جو اُن کے ہاتھوں نے لکھی اور ان کے لئے اس چیز سے تباہی ہے جو وہ کماتے ہیں۔ ﴿۷۹﴾

﴿۷۹﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ، الآیۃ : علماء یہود کا یہ گروہ اس بات سے خائف تھا کہ اگر ہماری قوم نے توراۃ میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت کو پڑھ لیا تو وہ ہمیں چھوڑ کر ان کی اتباع کرلیں گے ہماری وجاہت و سیادت خاک میں مل جائے گی اور ہم اپنے تمام دُنیوی منافع سے محرُوم ہو جائیں گے اِس لئے وُہ توراۃ میں تحریف کرکے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت کو بدل کر لکھ دیتے تھے۔ مثلاً اُنہوں نے "اَكْحَلُ الْعَيْنَيْنِ" "سُرمگیں آنکھوں والے" کی بجائے

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾

اور اُن میں بعض ان پڑھ ہیں۔ جو زبان سے لفظوں کو پڑھ لینے کے سوا (اللہ کی) کتاب (کے معانی) کا کچھ علم نہیں رکھتے اور وُہ صرف (اپنے وہم و) گمان میں پڑے ہوئے ہیں۔

۷۸ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ اِلَّآ اَمَانِيَّ۔ الآیۃ: قوم یہود میں اہل علم بھی تھے جن میں ایک طبقہ دیانت اور تقویٰ سے متصف تھا جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ان کے علاوہ علمائے یہود میں ایسے لوگ بھی تھے جو خشیت الٰہیہ سے محروم اور محض دنیوی طمع اور لالچ کا شکار تھے۔ وہ ان پڑھ لوگوں سے مالی منفعت حاصل کرنے کے لئے ان کی خواہشات کے مطابق اُنہیں مسائل بتاتے اور من گھڑت باتیں انہیں سناتے تھے۔ وہ لوگ اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے اللہ کی کتاب کے علم سے محروم تھے۔ اپنے حسب منشاء احکام و مسائل سُن کر وُہ خُوش ہو جاتے اور علم کتاب کی بجائے محض اپنے گُمان کے مطابق دُنیا پرست عُلماء کی اندھی تقلید کرتے تھے۔ "اُمِّيُّوْنَ" "اُمّی" کی جمع ہے جو منسوب الی الاُمّ ہے۔ یعنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد کسی سے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا نہ کسی اُستاد سے علم حاصل کیا۔ اس آیتِ کریمہ میں "اُمِّيُّوْنَ" سے جہلاءِ یہود مُراد ہیں۔ جنہیں توراۃ کا کچھ علم نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ توراۃ پڑھ لیتے تھے۔ لیکن اس کے معنی سمجھنے میں وُہ جاہل تھے اُنہیں توراۃ کے معانی کا کچھ علم نہ تھا۔ "اَمَانِيَّ" "اُمْنِيَّةٌ" کی جمع ہے۔ جھُوٹی من گھڑت بات کو "اُمْنِيَّةٌ" کہتے ہیں۔ اِس آیت کریمہ میں "اَمَانِيَّ" سے وہ جھُوٹی مَن گھڑت باتیں مُراد ہیں جو اَحبارِ یہود اپنی قوم کے جاہلوں کو اپنی طرف سے گھڑ کر سُنا دیا کرتے تھے۔ "اُمْنِيَّةٌ" تلاوت کو بھی کہتے ہیں اِس لئے ایک قول یہ ہے

کہ جہلاء یہود تورات کی تلاوت کے سوا اس کے معانی ومطالب میں سے کچھ نہ کچھ جانتے تھے اور جو کچھ ان کے احبار کہتے تھے اُسی کو وہ مان لیتے تھے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں لوگوں کا حال بیان فرمایا

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ
بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا
كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

تو بڑی خرابی ہے اُن کے لئے جو (اللہ کی) کتاب (میں من گھڑت باتیں) اپنے ہاتھوں سے لکھیں پھر کہہ دیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت حاصل کرلیں تو ان کے لئے ہلاکت ہے اس چیز سے جو اُن کے ہاتھوں نے لکھی اور ان کے لئے اس چیز سے تباہی ہے جو وہ کماتے ہیں۔ ۷۵

---

۷۵ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ الآیۃ: علماء یہود کا یہ گروہ اس بات سے خائف تھا کہ اگر ہماری قوم نے توراۃ میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت کو پڑھ لیا تو وہ ہمیں چھوڑ کر ان کی اتباع کرلیں گے ہماری وجاہت وسیادت خاک میں مل جائے گی اور ہم اپنے تمام دُنیوی منافع سے محروم ہو جائیں گے اس لئے وہ توراۃ میں تحریف کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت کو بدل کر لکھ دیتے تھے۔ مثلاً انہوں نے "اَكْحَلُ الْعَيْنَيْنِ" "سُرمگیں آنکھوں والے" کی بجائے

"اَزْرَق" "نیلگوں آنکھوں والے" اور "بِعْثَة" "میانہ قد" کی بجائے "طوال" "دراز قد" لکھ دیا (مظہری۔ ص: ۸۸، ج: ۱) اللہ تعالیٰ نے اُن کی شدید مذمت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ "فَوَيْلٌ لَّهُمْ" الآیۃ۔ یعنی ان کے لئے خرابی اور بربادی ہے جو اللہ کی کتاب میں اپنی طرف سے لکھ کر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اس تحریف سے اُن کا مقصد دُنیا کا عارضی اور قلیل فائدہ حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ
قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ
اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً
وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗـَٔتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ
النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ
هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ع

اور وُہ (یہودی) بولے ہمیں آگ ہرگز نہ چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن۔ آپ فرما دیں کیا تُم نے اللہ کی طرف سے کوئی عہد لیا ہے؟ پس اللہ ہرگز اپنے عہد کے خلاف نہ کرے گا۔ یا تُم اللہ پر وُہ بات کہتے ہو جو تُم نہیں جانتے۔ کیوں نہیں جس نے بُرائی کی اور اُس کے

"اَزْرَق" "نیلگوں آنکھوں والے" اور "رِبْعَة" "میانہ قد" کی بجائے "طوال" "دراز قد" لکھ دیا (مظہری۔ ص: ۸۸، ج: ۱) اللہ تعالیٰ نے اُن کی شدید مذمت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ "فَوَيْلٌ لَّهُمْ" الآیۃ۔ یعنی ان کے لیے خرابی اور بربادی ہے جو اللہ کی کتاب میں اپنی طرف سے لکھ کر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اس تحریف سے اُن کا مقصد دُنیا کا عارضی اور قلیل فائدہ حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ
قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ
اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً
وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗـَٔتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ
النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ
هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

اور وُہ (یہودی) بولے ہمیں آگ ہرگز نہ چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن۔ آپ فرما دیں کیا تُم نے اللہ کی طرف سے کوئی عہد لیا ہے؟ پس اللہ ہرگز اپنے عہد کے خلاف نہ کرے گا۔ یا تُم اللہ پر وُہ بات کہتے ہو جو تُم نہیں جانتے۔ کیوں نہیں جس نے برائی کی اور اُس کے

گناہوں نے اُسے گھیر لیا تو وہی دوزخی ہیں۔ وُہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور اُنہوں نے نیک کام کئے وُہ جنتی ہیں اِس میں وُہ ہمیشہ رہیں گے ۔۔۔

---

۷۶ ۔۔۔ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ ۔ الآیۃ : یہُود کہتے تھے کہ ہم زیادہ عرصہ دوزخ میں نہیں رہیں گے صِرف چند دن ہمیں آگ چھُوئے گی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے یہُود کہتے تھے کہ دُنیا کی مُدت سات ہزار سال ہے۔ ہمیں ہر ہزار سال کے بدلے صِرف ایک دِن عذاب ہوگا اور حضرت قتادہ کا قول ہے کہ "اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً" سے یہُود کی مُراد وہ چالیس دن تھے جن میں ان کے آباء نے بچھڑے کی عبادت کی تھی۔ حسن اور ابوالعالیہ کا قول یہ ہے کہ یہُود کہتے تھے کہ کسی امر پر اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہو گیا تو اُس نے قسم کھائی کہ وُہ ہمیں چالیس دن عذاب دے گا۔ لہٰذا اللہ کی قسم پُوری ہونے تک ہمیں صِرف چالیس دِن کا عذاب ہوگا۔ (مظہری۔ ص: ۸۸، ج: ۱) یہُود کی یہ سب باتیں قطعاً غلط اور بے بُنیاد ہیں اور اُن کا ایسا کہنا اللہ تعالیٰ پر کُھلا بہتان ہے۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں سرزنش فرماتے ہُوئے ارشاد فرمایا کہ تمہارا یہ دعویٰ کِس بات پر مبنی ہے؟ کیا تُم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا جس کی خلاف ورزی اللہ تعالیٰ نہیں فرمائے گا؟ یا تُم اللہ پر بہتان باندھ رہے ہو۔ تمہارا دعویٰ صحیح نہیں۔ حق یہ ہے کہ جن لوگوں کو ہر طرف سے خطائیں گھیر لیں وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور مومنین صالحین ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ
بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ ق
وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ
حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ
ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ
مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

اور (یاد کرو) جب اولادِ یعقوب سے ہم نے پختہ عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی تم عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہنا اور لوگوں سے اچھی بات کہنا اور نماز قائم رکھنا اور زکوٰۃ ادا کرتے رہنا پھر تم (اس اقرار سے) پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے اور تم (حق سے) منہ پھیرنے والے ہو۔

﴿۸۳﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ. الآیۃ : اس آیت کریمہ میں تمام مذکورہ امور پر اللہ تعالیٰ نے توراۃ کے ذریعے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا مگر چند لوگوں کے سوا سب نے روگردانی کرتے ہوئے عہد شکنی کی۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ
لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ
اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ
تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ

أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ
دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ
وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى
تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ
اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ
بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ
اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ
يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ز فَلَا يُخَفَّفُ
عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾

اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا کہ آپس میں خونریزی نہ کرو گے اور اپنے لوگوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالو گے پھر تم نے (اس کا) اقرار کیا۔ اور (اب اس عہد پر) تم خود بھی گواہی دیتے ہو۔ اس کے بعد تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے لوگوں میں سے ایک گروہ کو اُن کے وطن سے نکالتے ہو، گناہ اور ظلم کے ساتھ (ناحق) تم اُن کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرتے

ہو اور اگر وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئیں تو ان کا (زرِ) فدیہ دے کر انہیں چھڑا لیتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا ہی تم پر حرام تھا تو کیا تم کتاب کے کچھ حصہ پر ایمان لاتے ہو اور کچھ حصہ کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ تو جو لوگ تم میں سے ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے؟ کہ وہ دنیا کی زندگی میں رسوا ہوں اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں اور اللہ تمہارے عملوں سے بے خبر نہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی تھی تو نہ اُن سے عذاب ہلکا ہوگا اور نہ اُن کی مدد کی جائے گی۔ ۷۸ے

۷۸ے وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَکُمْ۔ الآیۃ: اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ایک اور پختہ عہد کا ذکر فرمایا وہ بھی توراۃ کے ذریعے ان سے لیا گیا تھا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہاؤ گے اور اپنی قوم کے لوگوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو گے۔ پھر اے بنی اسرائیل تم نے یعنی تمہارے آباء نے اس عہد کا اقرار کر لیا اور تم اس کے گواہ ہو۔ لیکن تم نے اس عہد کو بھی توڑا۔ آپس میں ایک دوسرے کا خون بہایا اور اپنی ہی قوم کے لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال کر انہیں جلاوطن کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تین حکم دیئے تھے۔ "ترک قتل" اور "ترک اخراج" اور "ترک مظاہرہ یعنی ناجائز طور پر ایک دوسرے کی مدد اور پشت پناہی کرنا" اور ایک چوتھا حکم انہیں یہ بھی دیا کہ اگر (تمہاری قوم) بنی اسرائیل کا کوئی مرد یا عورت قیدی بن کر تمہارے پاس آئے تو فدیہ دیکر اسے چھڑا لینا۔ یہود نے پہلے تین حکموں کی مخالفت کی۔ آپس میں ایک دوسرے کا خون بہایا اور اپنی قوم کے لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال کر انہیں جلاوطن کیا اور ناجائز طور پر آپس میں ایک دوسرے کی مدد اور پشت پناہی کی۔ لیکن انہیں کے نکالے ہوئے مرد یا عورتیں قیدی ہو کر جب ان کے سامنے آتے تو وہ انہیں مال یا قیدی کے بدلے میں قیدی بطور فدیہ دیکر چھڑا لیتے جب ان سے کہا جاتا کہ تم نے ایسا کیوں کیا تو وہ کہتے کہ توراۃ میں ہمیں یہی حکم دیا گیا ہے حالانکہ

توراۃ میں اُنھیں قتل کرنے اور جلاوطن کرنے سے منع کیا گیا تھا اور اسی طرح ایک دُوسرے کے خلاف ناجائز مدد اور پُشت پناہی سے بھی اُنھیں روکا گیا تھا اور اُن پر یہ بات حرام کر دی گئی تھی کہ وُہ اُنھیں اُن کے گھروں سے نکال کر جلاوطن کریں لیکن اُنہوں نے تینوں حُکموں کی مخالفت کی اور اپنے پُختہ عہد کو توڑا اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کو سرزنش فرماتے ہُوئے ارشاد فرمایا کہ اے قومِ یہُود کیا تم توراۃ کے بعض حصہ پر ایمان لاتے ہُو اور بعض کے ساتھ کُفر کرتے ہو؟ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہُود کے دو قبیلے تھے "بنو قریظہ" اور "بنو نضیر" یہ دونوں قبیلے یہُود بنی اسرائیل کے تھے۔ ان کی آپس میں شدید دُشمنی تھی۔ دونوں ایک دُوسرے کے ساتھ قتال کرتے تھے اور غالب آنے والا قبیلہ مغلُوب کو اُن کے گھروں سے نکال دیتا تھا پھر جب اُن میں سے کوئی قیدی بن کر آتا تو فدیہ دے کر اُسے چھُڑا لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اِس عہد شکنی اور متضاد طرزِ عمل پر ان کی مذمت فرماتے ہُوئے دُنیا میں رسوائی اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی وعید اُن کے حق میں فرمائی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ
بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ز وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ
الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط اَفَكُلَّمَا
جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ
اسْتَكْبَرْتُمْ ج فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ز وَفَرِيْقًا
تَقْتُلُوْنَ ﴿٨٧﴾

اور بے شک ہم نے مُوسیٰ کو کتاب دی اور پے دَر پے ان کے بعد رسُول بھیجے اور

ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو روشن دلیلیں دیں اور رُوح القدس (جبریل) سے ہم نے اُن کی تائید فرمائی تو کیا (ایسا نہیں ہُوا کہ) جب بھی کوئی رسُول تمہارے پاس ایسی چیز لایا جسے تُم نہ چاہتے تھے تُم نے تکبّر کیا؟ پس (رسُولوں کے) ایک گروہ کو تُم نے جھٹلایا اور ایک گروہ کو تُم قتل کرتے تھے۔ ۷۹ھ

۷۹ھ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ. الآیۃ۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کتاب دینے اور ان کے بعد پے در پے رسُولوں کے بھیجنے کا ذکر فرمایا اور بنی اسرائیل کی مزید بغاوت اور سرکشی کا بیان فرمایا۔ وہ یہ کہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد پے در پے بہت سے رسُول آئے مثلاً حضرت یوشع، حضرت شموئیل، حضرت داود، حضرت سلیمان، حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اُن کے بعد حضرت عیسےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے۔ اللہ کے یہ سب رسُول روشن دلائل اور چمکتے ہُوئے معجزات لے کر آئے بالخصُوص حضرت عیسےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عظیم ترین معجزات عطا فرمائے گئے بلکہ بجائے خُود گویا وہ ایک معجزہ تھے۔ حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاک بطن سے بغیر باپ کے وہ پیدا ہُوئے۔ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ" اور ہم نے رُوح القدس کے ساتھ ان کی تائید فرمائی۔ یہاں "رُوح" سے مُراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں یا وُہ رُوح مُراد ہے جو حضرت عیسیٰ الصلوٰۃ والسلام میں پھُونکی گئی تھی اور "قُدُس" کے معنی ہیں طہارت یہ مصدر ہے اسم فاعل کے معنی میں یعنی "طاہر"۔ اللہ تعالیٰ نے "وَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا" فرما کر تکریماً اس رُوح کی اضافت اپنی طرف فرمائی۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق آیتِ کریمہ "وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ" میں بھی یہ اضافت محض تکریمی ہے۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت جبریل علیہما الصلوٰۃ والسلام کی طہارت ان دونوں کی عصمت کی وجہ سے ہے لیکن عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طہارت عصمت کے علاوہ اس وجہ سے بھی ہے کہ بوقت ولادت مسِّ شیطان سے وُہ محفُوظ رہے اور اس لئے بھی کہ

وُہ مردوں کے نطفے اور حائضہ عورتوں کے ارحام دونوں سے پاک تھے۔ اور جبریل علیہ السلام کے ساتھ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی "تائید" کے یہ معنی ہیں کہ جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام اس بات پر مامور تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جہاں چلیں وُہ ان کے ساتھ رہیں یہاں تک کہ جب عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام آسمان پر اُٹھائے گئے تو جبریل علیہ السلام اُن کے ساتھ تھے۔ بعض نے کہا کہ "رُوح" سے مُراد اللہ تعالیٰ کا وہ اسم اعظم ہے جس کے ذریعہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام مُردے زندہ کرتے اور لوگوں کو عجیب و غریب معجزے دِکھاتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ "رُوح" سے مُراد انجیل ہے۔ جس کی نظیر آیت کریمہ "اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا" "ہم نے آپ کی طرف اپنے امر سے رُوح کی وحی فرمائی"، اللہ تعالیٰ کی کتاب کا "رُوح" ہونا اس بنا پر ہے کہ وہ حیاتِ قلوب کا سبب ہے۔ ان آخری دو تاویلوں کی تقدیر پر اللہ تعالیٰ کی طرف "رُوح" کی اضافت اور اس کا طہارت سے موصوف ہونا بالکل ظاہر ہے جس میں کسی تاویل کی حاجت نہیں۔ یہ تمام رسُول اللہ تعالیٰ کے احکام اور آسمانی تعلیمات لیکر تشریف لائے۔ مگر یہُود کا یہ حال تھا کہ جب بھی کوئی رسُول ان کی خواہشات کے خلاف کوئی حکم لیکر آیا تو اُنہوں نے تکبر سے کام لیا اور کچھ رسُولوں کی اُنہوں نے تکذیب کی جیسے عیسیٰ اور حضرت محمد عربی علیہما الصلوٰۃ والسلام اور بعض کو قتل کر دیا جیسے حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام اگرچہ یہ سب کام عہد رسالتِ محمدیہ کے یہُود نے نہیں کئے ان میں بعض کام ایسے بھی ہیں جو صرف ان کے باپ دادا نے کئے تھے۔ مثلاً۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو قتل کرنا لیکن یہ لوگ چُونکہ اپنے باپ دادا کے کاموں پر راضی تھے اِس لئے یہ بھی اُنھیں کے حکم میں شامل رہے۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت فرمائی۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ
بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا

يُؤْمِنُوْنَ ﴿٨٨﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ
عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ
قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا
جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ
عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٩﴾

اور (یہود نے) کہا ہمارے دل غلاف میں (لپٹے ہوئے) ہیں۔ (غلاف نہیں) بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان پر لعنت فرمائی تو بہت تھوڑے ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ اور جب اُن کے پاس اللہ کی طرف سے کتاب آئی جو تصدیق کرتی ہے اس کی جو ان کے پاس ہے (اصل آسمانی کتابوں سے) اور (یہود) اس سے پہلے (قرآن اور نبی آخرالزمان کے وسیلہ سے) کافروں پر (اللہ سے) فتح مانگتے تھے پھر جب وہ پہچانے ہوئے ان کے پاس تشریف لے آئے (تو) اُنہوں نے اُن کے ساتھ کفر کیا پس اللہ کی لعنت ہے کافروں پر۔ ﴿۸۹﴾

﴿۸۸﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ. الآیۃ: لفظِ "غُلْف" اغلف کی جمع ہے اور اغلف غلاف میں لپٹی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ قرآن مجید اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات سُن کر یہود کہا کرتے تھے کہ ہمارے دِل پیدائشی غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اِس لئے یہ آپ کی کوئی بات قبول کرتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔ مُجاہد اور قتادہ کا قول یہی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کی اصل "غُلُفٌ" بضم اللام ہے وہ تخفیف کے بعد "غُلْفٌ" بسکون اللام

ہو گیا۔ اس قول کی تائید اعرج اور ابن عباس کی قرأۃ سے ہوتی ہے جنہوں نے اسے بضم اللام پڑھا وہ غلاف کی جمع ہے۔ یہود کا کہنا تھا کہ ہمارے قلوب ہر علم کے برتن ہیں انہیں آپ کے علم کی کوئی حاجت نہیں۔ ابن عباس اور عطا کا قول یہی ہے۔ کلبی نے کہا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دل ہر علم کے لئے برتن ہیں علم کی ہر بات سُن کر اسے اپنے اندر محفوظ کر لیتے ہیں سوائے آپ کی باتوں کے۔ اگر ان میں کوئی خیر ہوتی تو وہ انہیں بھی قبول کر کے سمجھ لیتے اللہ تعالیٰ نے اس قول پر رد فرمایا کہ ان کے دل اصل خلقت میں غلافوں میں لپٹے ہوئے نہیں اور نہ وہ علم کے برتن ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت فرمائی اور انہیں ہر قسم کی خیر سے محروم کر دیا۔ تو ان میں بہت ہی تھوڑے لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔

(مظہری۔ ص: ۹۴، ج: ۱۔ قرطبی۔ ص: ۲۵، جز: ۲)

وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا۔ الآیۃ: توراۃ کے ذریعہ یہود کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت اور شان کا پورا علم تھا یہی وجہ تھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے وہ "بِحَقِّ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ" کہہ کر حضور کے واسطہ سے مشرکین پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائیں کیا کرتے تھے امام قرطبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ روایت نقل کی کہ خیبر کے یہود نے بنو غطفان سے قتال کیا اور شکست کھائی جس کے بعد یہود نے اس دعا کے ساتھ ان سے دوبارہ قتال کیا "اِنَّا نَسْئَلُكَ بِحَقِّ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِيْ وَعَدْتَنَا اَنْ تُخْرِجَ لَنَا فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ اِلَّا تَنْصُرُنَا عَلَيْهِمْ" اے اللہ ہم اسی نبیِ امی کا واسطہ دیکر تجھ سے سوال کرتے ہیں جنہیں آخری زمانہ میں ہمارے لئے پیدا کرنے کا تو نے وعدہ فرمایا ہماری دعا تجھ سے یہی ہے کہ ہمارے دشمنوں پر تو ہماری مدد فرما۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ جب وہ اس دعا کے ساتھ قتال کرتے تھے تو بنی غطفان کو شکست دے دیا کرتے تھے (قرطبی۔ ص: ۲۷، جز: ۲) لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مبعوث ہو کر تشریف لائے تو اُنہوں نے حضور کے ساتھ کُفر کیا جس پہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور آخر میں فرمایا: "فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ" کافروں پر اللہ کی لعنت۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ
اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ
اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ
فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

کیا ہی بُری چیز ہے جس کے بدلے اُنہوں نے اپنی جانوں کو بیچا کہ وُہ کُفر کریں۔ اس چیز کے ساتھ جو اللہ نے نازل فرمائی اِس حسد سے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے فضل سے وحی نازل کرتا ہے پس وُہ لوٹے غضب کے ساتھ غضب پر اور کافروں کے لئے خواری کا عذاب ہے۔ [۸۱]

---

[۸۱] بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ۔ الآیۃ: حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر وحی نبوۃ اور قرآن کریم نازل ہونے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے ان کے دِلوں میں انتہائی بغض وحسد پیدا ہو چکا تھا اور اسی وجہ سے اُنہوں نے اپنی جانوں کے بدلے کُفر اختیار کیا۔

فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ۔ الآیۃ: غضب پر غضب سے یہ مُراد ہے کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ کُفر کرکے وُہ پہلے ہی مستوجبِ غضب ہو چکے تھے اور حضرت محمد عربی

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کُفر کر کے وُہ غضب بالائے غضب میں مُبتلا ہو کر ذلّت و خواری کے عذاب کے سزاوار ہو گئے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩١﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے اُتارا۔ اس پر ایمان لاؤ (تو) کہتے ہیں کہ ہم اُسی کو مانتے ہیں جو ہم پر اُتارا گیا اور وُہ اس کے سوا کا اِنکار کرتے ہیں حالانکہ وُہ حق ہے اس چیز کی تصدیق کرتا ہُوا جو (اصل کتاب سے) ان کے پاس (موجُود) ہے۔ (اے رسُول) فرما دیجئے پھر تم کیوں قتل کرتے تھے اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کو اگر تم (واقعی اپنی کتاب پر) ایمان رکھتے تھے؟ ۸۲ھ

۸۲ھ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا۔ الآیۃ: جب قُرآن پر اُنہیں ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم توراۃ پر ایمان رکھتے ہیں توراۃ کے علاوہ کسی چیز پر وہ ایمان نہیں لاتے اور حقیقت یہ ہے کہ وُہ توراۃ پر بھی ایمان نہیں رکھتے ورنہ حضرت مُحمّد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قُرآن کے ساتھ وُہ کبھی کُفر نہ کرتے جب کہ قُرآن اصل توراۃ کا مُصدِّق ہے۔ یہُود چُونکہ اپنے آپ کو مؤمن کہتے تھے اِس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا

ان سے دریافت کیا جائے کہ اگر تم اور تمہارے آباء مؤمن تھے تو تم نے اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کیا؟

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور بے شک تمہارے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر آئے پھر تم نے ان کے بعد بچھڑے کو (معبود) بنا لیا اور تم ظالم تھے۔ ۸۳ھ

۸۳ھ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى. الآیۃ: یہود کے ایمان کے دعویٰ کے خلاف اللہ تعالیٰ نے ان پر الزامات قائم فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ایمان کا دعویٰ کرتے ہو حالانکہ تم نے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی لائی ہوئی آیات کا انکار کیا اور موسےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے میقات پر جانے کے بعد بچھڑے کو معبود بنا کر تم ظلم عظیم کے مرتکب ہوئے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے پختہ وعدہ لیا اور (کوہ) طور کو تمہارے اُوپر اٹھایا۔ مضبوطی سے پکڑو (اس چیز کو) جو ہم نے تمہیں دی اور سنو۔ اُنہوں نے کہا ہم نے سُنا اور نافرمانی کی اور ان کے دِلوں میں بچھڑا سرایت کر گیا تھا اُن کے کُفر کی وجہ سے۔ (اے رسول!) فرما دیجئے تمہارا ایمان تمہیں بہت بُری چیز کا حُکم دیتا ہے اگر تم مومن ہو ۸۴ھ

۸۴ھ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ۔ الآیۃ: اور ہم سے پختہ عہد کرنے کے بعد نافرمانی کر کے تم نے عہد شکنی کی اور کُفر میں مبتلا ہو کر بچھڑے کی محبت میں سرشار ہو گئے۔ اگر واقعی تم مومن ہو تو کیا ایمان کا مقتضیٰ یہی ہے کہ تم ایسے شدید ترین معاصی اور کُفریات کا ارتکاب کرو۔؟

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾

فرما دیجئے کہ اگر آخرت کا گھر اللہ کے نزدیک دُوسروں کو چھوڑ کر صرف تمہارے لئے ہے تو موت کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو۔ ۸۵ھ

۸۵ھ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ۔ الآیۃ: یہود کا دعویٰ یہی نہیں تھا کہ ہم مومن ہیں بلکہ وُہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے سوا کوئی مومن نہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرو تاکہ بلا شرکت غیرے تم جنت کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ
اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ
بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ
عَلٰى حَيٰوةٍ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۛ يَوَدُّ
اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ
بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ
وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ع

اور وُہ قطعاً کبھی اُس کی تمنا نہ کریں گے ان (بُرے کاموں) کی وجہ سے جو وہ پہلے کر چکے ہیں اور اللہ ظالموں کو خُوب جانتا ہے۔ اور ضرور تُم اُنہیں پاؤ گے کہ وُہ (دُنیا کی) زندگی پر سب لوگوں سے زیادہ حرص رکھتے ہیں اور مُشرکوں سے (بھی زیادہ حریص ہیں) ہر ایک اُن (یہُود) میں سے چاہتا ہے کہ کاش اسے ہزار برس کی عُمر مل جائے اور یہ امر اُس کو عذاب سے بچانے والا نہیں کہ اُسے اتنی عُمر دیدی جائے اور اللہ ان کے سب کاموں کو خُوب دیکھ رہا ہے۔ ﴿۸۶﴾

---

۸۷ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۔ الآیۃ : لیکن یہُود اس کے باوجُود کبھی ہرگز موت کی تمنا نہ کریں گے۔ ان کے کرتُوت ان کے سامنے ہیں زبان سے وُہ کچھ بھی کہتے رہیں

دِل سے خُوب سمجھتے ہیں کہ ہماری مسلسل بغاوت و سرکشی کُفر و شرک کے باعث نارِ جہنّم کے سوا ہمارا کوئی ٹھکانا نہیں اِس لئے موت کی تمنّا کی بجائے دنیوی زندگانی پر وُہ سب سے زیادہ حریص ہیں بلکہ حیاتِ دُنیا پر وُہ مشرکوں سے بھی زیادہ حرص رکھتے ہیں جو مرنے کے بعد اُٹھنے پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کا یہ حال بداہتہً ان کے دعویٰ کی تکذیب کر رہا ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ

عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ
بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى
وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ
وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ
فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

فرما دیجئے جو دشمن ہو جبریل کا تو یقیناً اُس (جبریل) نے اللہ کے حکم سے اِس (قرآن) کو آپ کے دل پر اُتارا تصدیق کرتا ہوا اس چیز کی جو اُس سے پہلے ہے (اصل آسمانی کتابوں سے) اور ہدایت اور خوشخبری دیتا ہوا) ایمان والوں کے لئے۔ جو کوئی دُشمن ہو اللہ کا اور اس کے فرشتوں اور اُس کے رسُولوں اور جبریل اور میکائیل کا تو بے شک اللہ دشمن ہے کافروں کا ﴿۹۸﴾

۸۷ھ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ۔ الآیۃ: یہود کہا کرتے تھے ہم جانتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسُول ہیں۔ مگر ان پہ وحی لانے والا فرشتہ

ہمارا دشمن جبریل ہے اس لئے ہم ان پر ایمان نہیں لاتے اگر کوئی دوسرا فرشتہ ان پر وحی لاتا تو ہم ضرور ان پر ایمان لے آتے اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ جبریل نے اللہ کے حکم سے محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک پر قرآن نازل کیا جو پہلی کتابوں کا مصدق ہے۔ ایمان والوں کے لئے ہدایت اور خوشخبری ہے۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں فرشتوں جبریل اور میکائیل کے دشمن ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کافروں کا دشمن ہے۔ اس آیت کریمہ سے ثابت ہو گیا کہ اللہ کے فرشتوں اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں سے دشمنی کرنا اللہ تعالیٰ سے دشمنی ہے۔ اگرچہ ملائکہ میں جبریل و میکائیل داخل ہیں لیکن یہود کے رد اور جبریل و میکائیل کی عظمتِ شان کے اظہار کے لیے "مِنْ بَعْدِ التَّعْمِيْم" کے طور پر صراحۃً جبریل اور میکائیل علیہما السلام کا ذکر فرمایا گیا اور جبریل کے ساتھ میکائیل کا ذکر فرمانے میں یہ حکمت ہے کہ جو لوگ جبریل کے دشمن ہیں وہ میکائیل کے دوست نہیں ہو سکتے۔ چونکہ وہ دونوں اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے ہیں۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ
وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾

اور بے شک (اے رسول!) ہم نے آپ کی طرف روشن آیتیں اُتاریں اور نہ کفر کریں گے ان کے ساتھ مگر (اللہ کے) نافرمان۔ ۸۸ھ

۸۸ھ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ۔ الآیۃ: اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چمکتی ہوئی آیات نازل فرمائیں جن کا انکار کافر ہی کر سکتے ہیں ایمان والوں کے لئے ان کا انکار ممکن نہیں یہود نے ان کے ساتھ کفر کر کے اپنے ایمان

کے دعویٰ کو اپنی زبان سے جھٹلا دیا۔

أَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا

نَبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا

يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ

عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ

الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ ۘ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ

ظُهُوْرِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

اور کیا (ایسا نہیں ہوا کہ) جب بھی اُنہوں نے کوئی عہد کیا اُس کو ان میں سے ایک گروہ نے پس پشت ڈال دیا؟ بلکہ ان کے اکثر لوگ ایمان والے نہیں۔ اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے رسُول (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لائے جو تصدیق فرمانے والے ہیں اُس (اصل آسمانی کتاب) کی جو اُن کے ساتھ ہے (تو) اہل کتاب کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب (توراۃ) کو اپنے پیٹھ پیچھے پھینک دیا گویا وہ (کچھ) نہیں جانتے۔[۸۹]

---

۸۹ أَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا۔ الآیۃ : مزید سرزنش فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہود کے دعویٰ ایمان کی تردید فرمائی کہ کیا ایمان کا تقاضا یہی ہے؟ کہ انہوں نے جب بھی عہد کیا تو بے دریغ اُسے توڑ دیا اور جب اللہ کے رسُول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم توراۃ کی تصدیق کرنے والی کتاب ان کے پاس لائے تو اُنہوں نے اسے پسِ پشت

ڈال دیا اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی گویا وہ کچھ جانتے ہی نہیں حالانکہ توراۃ کے ذریعہ انہیں سب کچھ معلوم تھا۔

وَاتَّبَعُوْا

مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ
وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ
كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ
اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ
وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى
يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ
فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ ۚ
بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ
بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ
مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا
لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ

وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا
يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ
مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

اور وہ اس (کفریہ جادو منتر) کے پیچھے لگ گئے جسے سلیمان کے عہدِ سلطنت میں شیطان پڑھا کرتے تھے اور سلیمان نے (کوئی) کفر نہیں کیا ہاں شیطانوں ہی نے کفر کیا وہ لوگوں کو (کفریہ) جادو (منتر) سکھاتے تھے اور (انہوں نے پیروی کی) اس (جادو) کی جو شہر بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اتارا گیا اور وہ کسی کو (کچھ) نہ سکھاتے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم (تو) صرف آزمائش (کیلئے) ہیں لہٰذا تم (اسے سیکھ کر) کفر نہ کرنا۔ پس لوگ ان سے سیکھ لیتے تھے۔ وہ جس کے ذریعے جدائی ڈالتے تھے مرد اور اس کی بیوی کے درمیان اور وہ اس سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچا سکتے تھے مگر اللہ کے حکم سے اور وہ اُن سے وہ چیز سیکھ لیتے جو انہیں نقصان دیتی اور نفع نہ دیتی اور بیشک وہ خوب جانتے تھے کہ جس نے یہ سودا کیا آخرت میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں اور بیشک وہ بُری چیز ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانیں بیچیں، کاش! وہ جانتے۔ اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگار بنتے تو اللہ کی بارگاہ کا ثواب بہت بہتر ہے، کاش! وہ جانتے۔

۹۰ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ: یہود اپنی سرکشی اور طغیان میں کسی حد پر نہ ٹھہرے۔ جرائم پر جرائم کا ارتکاب کرتے رہے۔ یہاں تک انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات اور توراۃ کو بھی انہوں نے پسِ پشت ڈال دیا۔ اور ان کی بجائے انہوں نے شیاطین کے اس سحر کی اتباع کی جو سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہدِ حکومت میں سرکش

خبیث جنات اور شیاطین لوگوں کو سکھاتے تھے صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے سلیمان علیہ السلام پر بھی یہ الزام لگا دیا کہ ان کی عظیم سلطنت اور جن و انس پر ان کا تسلط اسی وجہ سے تھا کہ (معاذ اللہ) سلیمان علیہ السلام جادوگر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کا الزام رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ "وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ" سلیمان نے کفر نہیں کیا۔ جادو کفر ہے اور سلیمان علیہ السلام اس سے پاک ہیں۔ یہ عمل کفر شیاطین نے کیا اور یہود نے انہی کی اتباع کی اور اس کے علاوہ اس جادو کی پیروی کی جو شہر بابل میں ہاروت اور ماروت دو فرشتوں پر آزمائش کے لئے نازل کیا گیا تھا۔

اسرائیلیات کے مطابق قصہ ہاروت و ماروت کا خلاصہ

ہاروت و ماروت کے متعلق جو واقعات منقول ہیں ان کا اختصار علامہ سید محمود آلوسی حنفی بغدادی نے رُوح المعانی میں ارقام فرمایا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی آدم کے گناہوں پر فرشتوں نے تعجب کیا اور کہا کہ اے اللہ! اگر ان کی جگہ ہم ہوتے تو کبھی تیری نافرمانی نہ کرتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ تم اپنے میں سے دو فرشتے چن لو۔ فرشتوں نے ہاروت اور ماروت کو چن لیا۔ ان دونوں میں بشری خواہشات پیدا کر کے بصورت بشر انہیں زمین پر اتار دیا گیا وہ لوگوں کے درمیان ان کے مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے ایک زہرہ نامی عورت کی وجہ سے وہ فتنہ میں پڑ گئے۔ انہوں نے اس سے اپنی خواہش پوری کرنا چاہی اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر تم میری تین باتوں میں سے ایک بات مان لو تو میں تمہاری خواہش پوری کروں گی۔ بت کی پوجا کر لو یا شراب پی لو یا ناحق ایک جان کو قتل کر دو۔ انہوں نے اس کی بات مان لی پھر زہرہ نے ان سے وہ عمل سیکھ لیا جس کی وجہ سے وہ آسمان پر چڑھ گئی اور زہرہ ستارے کی صورت میں وہ مسخ کر دی گئی۔ ان دونوں نے بھی آسمان پر چڑھنے کا ارادہ کیا مگر نہ چڑھ سکے۔ تو انہیں اختیار دے دیا گیا کہ وہ دنیا کا عذاب قبول کر لیں یا آخرت کا ہاروت و ماروت

نے دُنیا کا عذاب قبول کر لیا اور اب وُہ دُنیا میں عذاب دیئے جا رہے ہیں۔ انتہی

اِس قصّہ کی رِوایات بے بُنیاد ہیں

علّامہ الوسی فرماتے ہیں کہ یہ اور اس کے علاوہ بہت سی روایات ہیں جن کے طرق کی تعداد بیس سے زائد تک چلی گئی ہے۔ کثرت طرق کے باوجُود محدثین کی ایک جماعت نے اس واقعہ کا انکار کیا جن میں قاضی عیاض بھی شامل ہیں۔ اُنہوں نے فرمایا کہ یہ واقعہ جسے اہل اخبار و آثار نے بیان کیا اور مفسرین نے ہاروت و ماروت کے قصہ میں اُسے نقل کیا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے صحت یا سقم کے ساتھ وارد نہیں ہُوا۔ یہ ایسی بات نہیں جو قیاس سے معلُوم ہو سکے۔ اھ (رُوح المعانی۔ پ۱۔ ص: ۲۰۶، ۲۰۷، طبع مصر)

تفسیر بحر محیط میں ہے کہ ان تمام روایات میں سے کوئی ایک روایت بھی صحیح نہیں (ص ۳۲۹ ج ۱)

علّامہ الوسی فرماتے ہیں کہ شہاب عراقی نے فرمایا کہ جس نے ہاروت و ماروت کے بارے میں یہ اعتقاد رکھا کہ دونوں فرشتے زہرہ کے ساتھ بُرائی کرنے کی وجہ سے عذاب دیئے جا رہے ہیں وُہ اللہ عظیم کے ساتھ کُفر کرنے والا ہے۔ کیونکہ فرشتے معصُوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اللہ نے جس بات کا اُنہیں حُکم دیا وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔ "وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ" اور وہ وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حُکم دیا جاتا ہے۔ زہرہ نامی ستارہ تو اسی دن سے موجُود ہے جس دن سے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا فرمائے۔ امام سیوطی نے اس قصہ کے منکرین پر اعتراض کیا کہ امام احمد، ابن حبان اور بیہقی وغیرہم نے اس قصہ کو مرفوعاً روایت کیا اور حضرت علی حضرت عبداللہ بن عباس حضرت عبداللہ بن عُمر حضرت عبداللہ بن مسعُود سے موقوفاً بھی مروی ہے۔ ان روایات کی اسانید کثیرہ صحیحہ ہیں جو شخص ان پر واقفیت رکھتا ہے اُسے ان کی صحت کا یقین ہو جاتا ہے کیونکہ وہ روایات کثیرہ ہیں اور انہیں اپنی کتابوں میں درج کرنے والے نہایت قوی ہیں۔

بعض محققین نے فرمایا کہ ان تمام روایات میں قولِ یہود کی حکایت مروی ہے اور یہود کا قول باطل ہے اور فی نفسہٖ اس قول کا باطل ہونا صحتِ روایت کے منافی نہیں۔ اس قول پر امام سیوطی کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ یہ اعتراض تو ان لوگوں پر وارد ہو سکتا ہے جو قولِ یہود کے ساتھ صحتِ روایت کے بھی منکر ہوں (روح المعانی پ ۱ ص ۳۰۰ قدیم)، اس قصہ میں کچھ لوگوں کا مشاہدہ بھی منقول ہے کہ انہوں نے ہاروت و ماروت کو عذاب میں مبتلا ہونے کی حالت میں بچشم خود دیکھا۔ اور ان سے گفتگو کی مگر وہ سب روایات بھی بے بنیاد اور مردود ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں حضرات صحابہ کرام اور تابعین سے اس قصہ میں بکثرت روایات نقل کیں اور ان سب کو صحیح الاسناد ہونے کے باوجود مردود قرار دیا۔ مسند امام احمد سے ایک مرفوع روایت بھی بطریق نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما تفسیر ابن کثیر میں منقول ہے جس کی بنیاد پر بعض مفسرین نے اس قصہ کے فی الواقع صحیح و ثابت ہونے پر استدلال کیا ہے۔ اس کے جواب میں ابن کثیر نے کہا کہ اس روایت کا مرفوع ہونا درست نہیں۔ اقرب یہ ہے کہ عبداللہ بن عمر نے یہ قصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنا بلکہ کعب احبار سے سنا تھا جو پہلے یہودی تھے پھر مسلمان ہوئے وہ صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں۔ اپنی یہودیت کے زمانہ میں بہت سی باتیں اور بکثرت قصے یہودیوں سے سنا کرتے تھے اور بطور حکایت صحابہ و تابعین کے سامنے بیان کر دیا کرتے تھے جس سے ان کی غرض یہود کے اقوال اور ان کے من گھڑت قصوں کی توثیق و تصدیق نہ ہوتی تھی۔ کعب احبار کے بطور حکایت بیان کئے ہوئے انہیں اقوال اور قصوں کو اسرائیلیات سے تعبیر کیا جاتا ہے جنہیں کعب احبار سے سن کر بعض صحابہ اور تابعین دوسروں کے سامنے بیان کر دیا کرتے تھے اور اس طرح وہ واقعات مسلسل نقل ہوتے چلے آئے۔ سننے اور بیان کرنے والے ثقہ ہوتے تھے اس لئے وہ روایات روایت کے درجہ میں صحیح اور ثابت قرار پاتیں مگر فی نفسہٖ وہ اقوال اور منقولہ واقعات واقع کے مطابق نہ تھے۔ ہاروت و ماروت سے متعلق

اس قصہ کی روایات بھی اسی قبیل سے ہیں۔ ابن کثیر نے بطریق سالم بن عبداللہ بن عمر اسانید متعددہ سے ثابت کیا کہ عبداللہ بن عمر نے یہ قصہ کعب احبار سے سنا عبداللہ بن عمر سے روایت کرنے میں نافع کی بہ نسبت ان کے بیٹے سالم بن عبداللہ اثبت اور احفظ ہیں اس لئے ان کی روایت راجح اور قابل قبول ہے۔ لہٰذا واضح ہو گیا کہ عبداللہ بن عمر کی جس روایت کو مرفوع کہا جاتا ہے۔ دراصل وہ بھی کعب احبار ہی سے مروی ہے ایسی صورت میں دیگر روایات کی طرح یہ روایت بھی اسرائیلیات ہی میں شامل ہو گی۔ اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ ہاروت و ماروت فرشتے کسی معصیت کے مرتکب نہیں ہوئے وللہ الحمد۔

"ہاروت و ماروت" کے تحت صاحب روح المعانی نے کہا کہ اس مقام پر امام قرطبی کا یہ کلام انتہائی تعجب خیز ہے کہ ہاروت و ماروت شیاطین سے بدل اور "مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ" میں "ما" نافیہ اور "ملکین" سے جبریل و میکائل علیہما السلام مراد ہیں کیونکہ یہودی کہا کرتے تھے کہ ان دونوں کو جادو دے کر زمین پر اتارا گیا تھا۔ اور کلام الٰہی میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے (وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ) وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ (وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ) (هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ كَفَرُوْا) يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ) (بِبَابِلَ) الخ۔ امام قرطبی کے مطابق تقدیر عبارت لکھنے کے بعد صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ اس سے زیادہ تعجب انگیز امام قرطبی کا یہ قول ہے کہ آیت کا اسی پر حمل کرنا بہتر ہے اور یہی تاویل سب سے زیادہ صحیح ہے اس کے سوا کسی اور تاویل کی طرف التفات نہ کیا جائے۔ امام قرطبی کے اس قول کو نقل کرنے کے بعد اس کا رد کرتے ہوئے صاحب روح المعانی فرماتے ہیں۔ یہ بات کسی منصف مزاج پر مخفی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا وہ کلام جو اعلیٰ مراتب بلاغت و فصاحت میں ہے اسے ادنیٰ سے ادنیٰ پر حمل کرنا کسی طرح سے مناسب نہیں۔ اس قسم کی توجیہ اللہ کی کتاب کو مسخ کرنے اور اسے اس کی شان سے گرانے کے سوا کچھ نہیں اور یہ توجیہ قلت بضاعت کے بے شمار مفاسد پر مشتمل ہے انتہی ملخصا۔ (روح المعانی۔ پ ۱، ص: ۳۰۸)

صاحب رُوح المعانی کا یہ تبصرہ بجائے خُود دُرست ہے۔ لیکن امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی عظمت وجلالت بھی ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ ہم امام قرطبی کی اس تاویل کو اُن کے تساہل پر محمول کرتے ہیں۔ اجلہ علماء محدثین ومفسرین سے تساہل ہُوا ہے جو ان کے تبحر علمی اور عظمت وجلالتِ شان کے ہرگز منافی نہیں۔ کمالا یخفی۔

لفظ سحر کے معانی۔ لفظِ سحر (بکسرِ سین) زبان عرب میں بہت سے معانی کے لئے مستعمل ہے جن میں سے بعض معانی حسب ذیل ہیں۔ ۱۔ جھاڑ پھُونک منتر ۲۔ فساد ۳۔ دھوکہ ۴۔ ازالہ۔ یُقَالُ سَحَرَہٗ اَیْ اَزَالَہٗ عَنِ الْبُغْضِ اِلَی الْحُبِّ ۵۔ بمعنی غذا۔ سَحَرَہٗ بِالطَّعَامِ وَالشَّرَابِ۔ اَیْ غَذَّاہُ وَعَلَّلَہٗ ۶۔ بکری کے دُودھ کی قلت۔ یُقَالُ عَنْزٌ مَسْحُوْرَۃٌ۔ اَیْ قَلِیْلَۃُ اللَّبَنِ۔ ۷۔ زمین کا پیداوار نہ دینا۔ یُقَالُ اَرْضٌ مَسْحُوْرَۃٌ۔ اَیْ لَا تُنْبِتُ ۸۔ باطل کو حق کی صُورت میں ظاہر کرنا ۹۔ ہر وہ چیز جس کا ماخذ نہایت باریک اور دقیق ہو۔ ۱۰۔ کسی چیز کو اس کی حقیقت سے دُوسری حقیقت کی طرف پھیر دینا۔ (ملخصاً از لسان العرب۔ ص ۳۴۹، ۳۵۰، ج ۴)۔ ۱۱۔ جس چیز کو انسان خُود حاصل نہ کر سکے اس کے حصُول میں شیطان کے تقرب کے ذریعہ اس کی مدد طلب کرنا۔ بیضاوی لکھتے ہیں۔ اَلسِّحْرُ مَا یُسْتَعَانُ فِیْ تَحْصِیْلِہٖ بِالتَّقَرُّبِ اِلَی الشَّیْطَانِ بِمَا لَا یَسْتَقِلُّ بِہِ الْاِنْسَانُ (بیضاوی بہامش شیخ زادہ ص ۲۶۲ ج ۱)، اس پر شیخ زادہ تحریر فرماتے ہیں جس کا خُلاصہ یہ ہے کہ جواہر مکلفہ کی دو قسم ہیں ایک جسمانی جو محسوس ہوتے ہیں۔ دُوسرے رُوحانی جو محسوس نہیں بلکہ صرف معقول ہوتے ہیں۔ جس طرح جواہر جسمانیہ کی تین قسمیں ہیں اچھے، بُرے اور متوسط۔ اسی طرح جواہر روحانیہ بھی اچھے، بُرے اور متوسط ہوتے ہیں۔ جواہر رُوحانیہ میں اچھے اور پسندیدہ جواہر، ارواح مقدسہ یعنی ملائکہ کرام ہیں۔ شریر وناپسندیدہ شیاطین جن ہیں اور جواہر متوسطہ مؤمنین جنات ہیں۔ ملائکہ کا تعلق اور ان کا مدد کرنا صرف ایسے لوگوں کے ساتھ خاص ہے جو پسندیدہ، پاکیزہ، متقی، عبادت گزار، اللہ کی عبادت پر ہمیشگی اختیار کرنے والے اور قول وفعل کے ذریعہ تقرب الٰہی میں ملائکہ

کے مشابہ ہوں۔ علیٰ ہذا شیاطین کا تعلق اور ان کا مدد کرنا بھی صرف ایسے لوگوں کے ساتھ خاص ہے جو سب سے زیادہ شریر، مشرک، خبیث، شیطان کی عبادت کرنے والے اور رحمٰن سے عناد رکھنے والے ہوں۔ انتہی۔ اس قسم کے خبیث اور شریر لوگ جن طریقوں کے ذریعہ شیطانوں سے رابطہ قائم کر کے اُن کی مدد سے قوت حاصل کرتے ہیں وہی طریقے ایسے افعال، اقوال اور اعمال پر مشتمل ہیں جو شرک جلی اور کُفر خالص ہیں۔

اس سحر کی شرط اوّل یہ ہے کہ جن ارواح سے استعانت مقصود ہے ان کو دلوں پر مطلع بالذات سمجھے اور ان کے عجز و جہل کا گمان بھی نہ کرے ورنہ وہ ارواح اس ساحر کی استدعا قبول نہ کریں گی۔ اور اسے اس کے مقصد تک نہ پہنچائیں گی۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "اول شرائط این است کہ ارواح را بر دلہا مطلع داند و ہرگز گمان عجز و جہل در حق آنہا نکند والا آں ارواح اجابت نکنند و بمطلب نرسانند" (تفسیر عزیزی۔ ص: ۳۶۹، ج: ۱)

قرآن مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام سے جس کُفر و سحر کی نفی فرمائی گئی یہود و شیاطین کے لئے جس سحر و کُفر کو ثابت کیا گیا۔ "یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ" میں جس سحر کی تعلیم کا ذکر فرمایا گیا۔ اور ہاروت و ماروت پر جو سحر نازل ہُوا جو وہ لوگوں کو سکھایا کرتے تھے۔ ان سب کا مصداق، سحر کی وہی قسم ہے جس میں اعتقاد شرک کے ساتھ اعمالِ کفریہ و شرکیہ کے ذریعے ارواح شیاطین و کواکب سے رابطہ قائم کر کے ان سے استعانت کی قوت حاصل کی جاتی ہے اور اس کے اثرات کا ظہور لوگوں کے نفع یا نقصان کی صورت میں مرتب ہوتا ہے۔ شیخ زادہ علی البیضاوی اور تفسیر عزیزی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ مؤمنین موحدین، صالحین طیبین طاہرین جو خالصتہً اللہ تعالیٰ کے عابدین اور متقربین ہیں۔ اگر اعمالِ مشروعہ صالحہ کے ذریعہ ارواح قدسیہ ملائکہ وغیرہ سے رابطہ قائم کر کے ان سے مدد حاصل

کریں تو ارواح طیبہ ضرور ان کی مدد کرتی ہیں۔ اور ایسا کرنا ہرگز کفر و شرک نہیں اور یہ سحر کے اقسام مذمومہ محرمہ میں قطعاً شامل نہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اقسام سحر بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا۔ اس مقام پر جاننا چاہیئے کہ اذکیاء امت مصطفویہ نے اکثر اقسام سحر کی اصلاح فرمائی ہے اور ان سے کفر و شرک کا ازالہ کر کے انہیں استعمال کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ قسم اوّل کی اصلاح دعوت علویہ ہے جس کے ذریعہ اصحابِ دعوت ملائکہ علویہ کی تسخیر کرتے ہیں مگر وہ تسخیر اللہ تعالیٰ کے اسمائے عظام اور آیات قرآنی کی استعانت سے ہوتی ہے۔ دوسری قسم کی اصلاح عزیمات اور دعوت سفلیہ ہے جس کے ذریعہ وہ موکلات ارضیہ اور جنات کو مسخر کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ تسخیر بھی اسمائے الٰہیہ اور آیاتِ قرآنیہ کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس میں کفر و شرک یا تعظیم غیر اللہ کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا بلکہ وہ ارواحِ سفلیہ کو اپنا محکوم اور مغلوب بنا لیتے ہیں۔ تیسری قسم کی اصلاح اولیاً اور صلحاً کی ارواح طیبہ سے رابطہ کرنا ہے کہ اکثر اویسی مشرب بزرگان اس پر عمل کرتے اور اپنی اور دیگر مخلوق کی حاجات میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس طریق کے حاصل کرنے میں بھی طہارت، تلاوت اور ارواح صالحین کے لئے صدقات کا ایصال ثواب پیش نظر رکھتے ہیں[1]۔

ایک شبہ کا ازالہ : رہا یہ امر کہ سحر کے اعمال کفریہ و شرکیہ ہوں یا کفر و شرک کے بغیر مشروع اور جائز طریقہ سے ارواح قدسیہ ملائکہ یا کواکب کی تسخیر کا کوئی عمل ہو، اذن الٰہی کے بغیر کسی عمل کے اثرات کا ظہور ممکن نہیں۔ پھر دونوں میں کیا فرق ہے۔ میں عرض کروں گا فرق یہ ہے کہ سحر کے افعالِ کفریہ و شرکیہ کے اثرات کو ساحر اپنے اعتقاد میں ارواحِ خبیثہ کی قدرت کا اثر سمجھتا ہے اور جائز طریقہ[1] سے عملِ تسخیر کا عامل اپنے عمل کے اثرات کو قدرت الٰہیہ کا اثر اعتقاد کرتا ہے۔

دوسرا شبہ اور اس کا ازالہ : اس کے بعد اگر کوئی یہ شبہ وارد کرے کہ جائز و ناجائز ہر دو طریق سے افعالِ عجیبہ اور خارقہ للعادۃ کا صدور ہوتا ہے اور معجزات و

کرامات بھی افعال خارقہ للعادۃ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں معجزہ و کرامات کو سحر و عملیات سے کس طرح ممتاز کیا جا سکتا ہے؟۔ اس کا ازالہ یہ ہے کہ معجزہ اور کرامت کا تعلق کسی طریق عمل سے نہیں ہوتا اور سحر و عملیات مخصوص طریق کار پر موقوف ہیں جن کی رعایت کے بغیر نہ عملیات کا اثر ہوتا ہے اور نہ سحر کا۔

مخفی نہ رہے کہ اذن و ارادہ الٰہیہ خیر و شر دونوں کی بنیاد ہے لیکن ضروری نہیں کہ جس کام سے اللہ تعالیٰ کا اذن و ارادہ متعلق ہو جائے وہ کام اللہ کے نزدیک پسندیدہ بھی ہو۔ دیکھئے ایمان اور کفر دونوں اللہ کے اذن و ارادہ کے تحت ہیں مگر ایمان اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور کفر اُسے پسند نہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا۔ لَا یَرْضٰی لِعِبَادِہِ الْکُفْرَ۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے کفر پر راضی نہیں۔ معلوم ہوا کہ افعالِ کفریہ اور اعمالِ مشرکہ سب اللہ تعالیٰ کے اذن و ارادہ کے ماتحت ہیں لیکن جس کام میں کفر و شرک کی آمیزش ہو وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں اور نیک نیتی کے ساتھ جائز اعمال اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؛ ہاروت و ماروت جمہور کے مطابق دو فرشتے تھے جنہیں بطور آزمائش لوگوں کو سحر کی تعلیم کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔

ہاروت و ماروت کس زمانہ میں تھے اور کب یہ سحر ان پر نازل کیا گیا؟ اس کی صراحت نظر سے نہیں گزری ـــ البتہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں فرشتے سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بہت پہلے تھے۔ شاہ صاحب کے کلام کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔ "سحر کی سب سے اعلیٰ قسم جو خالص کفر و شرک کے اعتقاد اور خالصۃً اعمالِ کفریہ و شرکیہ پر مشتمل ہے۔ کلدانیوں اور اہل بابل کا سحر ہے۔ اس علم کی اصل ہاروت و ماروت سے ماخوذ ہے اہل بابل نے ان سے سیکھ کر کام میں لائے۔ اور اس میں تعمق اور غور و خوض کرتے رہے۔ کلدانی جو بابل کے باشندے تھے اس علم سحر

میں بے حد مشغول تھے۔ انہی کے مذہب و عقیدہ کے ابطال کے لئے سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوئے تھے۔ انتہی (تفسیر عزیزی۔ ص ۳۶۸، ج ۱:)

ایک قوی اشکال اور اس کا حل : جب وہ سحر کفر و شرک تھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں پر اس کا نازل کیا جانا کیسے ممکن ہے؟۔ علاوہ ازیں فرشتے معصوم ہیں اور کفر و شرک کی تعلیم معصیت ہے ایسی صورت میں فرشتوں کا لوگوں کو اس کی تعلیم دینا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے۔؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علم سحر میں بعض ایسے فوائد رکھے ہیں جن کی وجہ سے بنی نوع انسان میں اس کا باقی رکھنا حکمتِ الٰہیہ کا تقاضا تھا۔ مثلاً ا۔ معجزات و کرامات کا سحر سے ممتاز ہونا علم سحر کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ عصا کا سحر سے ممتاز ہونا ساحروں کو علم سحر کے ذریعہ معلوم ہوا۔ اسی لئے ساحر مسلمان ہو گئے اور فرعون اور اس کے ساتھی کفر پر قائم رہے۔ ۲۔ اگر کوئی شخص علم سحر کے باوجود اپنے دشمن سے انتقام نہ لے تو اس کے لئے قدرت کے باوجود انتقام نہ لینا موجب فضیلت ہے۔ ۳۔ نیز یہ کہ سحر جاننے کے باوجود اس پر عمل کرنے سے رک جانا بھی باعث ثواب ہے۔ بنابریں علم سحر فرشتوں پر نازل کیا گیا اور لوگوں کو اس کی تعلیم دینے کے لئے فرشتوں کو مامور فرمایا گیا۔

رہا یہ امر کہ فرشتے معصوم ہیں اور کفر و شرک کی تعلیم معصیت ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ فرشتے احکام شرع کے مکلف نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ جس کام پر چاہے انہیں مامور فرما دیتا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا: "لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ" (سورہ تحریم۔ آیت ۶) "وہ اللہ کا حکم نہیں ٹالتے اور وہ وہی کام کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ہو"۔ چونکہ یہ دونوں فرشتے تعلیم سحر پر مامور تھے۔ اس لئے ان کی یہ تعلیم معصیت نہیں بلکہ امرِ الٰہی کی تعمیل ہے۔

بعض کام بظاہر معصیت نظر آتے ہیں لیکن امرِ الٰہی سے ان کا کرنا معصیت نہیں

ہوتا۔ حضرت خضر علیہ السلام کا بے گناہ لڑکے کو قتل کرنا بظاہر معصیت تھا اسی لئے موسےٰ علیہ السلام نے ظاہر کے پیشِ نظر ان پر انکار فرمایا لیکن حضرت خضرؑ نے "ما فعلتہ عن امری" کہہ کر موسیٰ علیہ السلام کو حقیقتِ حال کی طرف متوجہ فرمادیا۔ یعنی یہ کام میں نے اپنے امر سے نہیں کیا بلکہ مامور من اللہ ہوکر امرِ الٰہی کی تعمیل کی ہے۔ لہٰذا ہاروت اور ماروت کی عصمت پر تعلیم سحر سے کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ وہ مامور من اللہ تھے۔

ہاروت و ماروت کی تعلیم سحر کے فوائد: اِس تعلیم کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ علم سحر بنی نوع انسان میں باقی رہا۔ دوسرا فائدہ یہ کہ سحر کی حقیقت واضح ہوگئی اور سیکھنے والوں کو معلوم ہوگیا کہ سحر جس کی وہ تعلیم دیتے تھے خالص کفر و شرک ہے۔ طبائع سلیمہ کو اس سے نفرت ہوگئی صرف انہی لوگوں نے اسے قبول کیا جن کی طبیعتیں مسخ ہوچکی تھیں اور اصلاح پذیر ہونے کی ان میں کوئی صلاحیت نہ رہی تھی تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ فرشتوں نے تعلیم سحر سے پہلے جب ہر شخص سے یہ کہہ دیا کہ "اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ" ہم تو صرف آزمائش کے لئے آئے ہیں تو کفر نہ کر۔ تعلیم سے قبل فرشتوں کے قول سے اس عمل سحر کا کفر ہونا واضح ہوگیا اور اس سے ممانعت بھی صراحۃً ثابت ہوگئی۔ اور سحر کا آزمائش ہونا بھی ہر ایک کو معلوم ہوگیا۔ اس کے بعد جن لوگوں نے فرشتوں سے علم سحر حاصل کرکے اس پر عمل کیا وہ کافر ہوکر آزمائش میں ناکام ہوگئے اور جنہوں نے یہ علم حاصل نہ کیا یا حاصل کرنے کے بعد اس پر عمل نہ کیا وہ آزمائش میں کامیاب ہوگئے اور اس طرح بنی نوع انسان میں علم سحر کے باقی رہنے کی حکمت بھی پوری ہوگئی اور اس کے عمل کا کفر اور ممنوع ہونا بھی متحقق ہوگیا۔

ایک سوال اور اُس کا حل: اگر یہاں یہ سوال کیا جائے کہ جب یہ کام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی کرسکتے تھے۔ اس پر فرشتوں کو مامور فرمانے کی کیا حکمت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا بنیادی کام یہ تھا کہ وہ لوگوں کو کفر و شرک سے بچنے کی تعلیم دیتے تھے۔ اگر وہ فرشتوں کی طرح لوگوں کو سحر کے اعمال کفریہ و شرکیہ سکھاتے

تو یہ ان کے بنیادی کام کے خلاف ہوتا اس لیئے اللہ تعالیٰ نے اس کام پر فرشتوں کو مامور فرمایا۔

احکام سحر: سحر کی بہت سی اقسام ہیں ہر قسم کا حکم یکساں نہیں جس عملِ سحر میں کفر و شرک یا فسق کا کوئی شائبہ نہ پایا جائے اور کسی ناجائز کام کا اس میں کوئی دخل نہ ہو وہ سحر جائز و مباح ہے۔ اور جس میں فسق اور فعل حرام پایا جائے وہ گناہ ہے اور جو عملِ سحر افعال کفریہ و شرکیہ پر مشتمل ہو جیسا کہ سحر کی قسم اوّل کی وضاحت میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے وہ یقیناً کفر و شرک ہے۔ ایسا ساحر مرتد ہے اس کا حکم شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسے توبہ کے لیئے تین دن کی مہلت دی جائے اگر وہ توبہ نہ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے مسلمانوں کی طرح اس کی تجہیز و تکفین نہ کی جائے نہ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے اس کے لیئے فاتحہ درود اور صدقات کا ایصالِ ثواب بھی نہ کیا جائے۔ انتہی ملخصاً (تفسیر عزیزی۔ ص ۲۶۶، ج ۱)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

اے ایمان والو! (اپنے رسول کو) رَاعِنَا نہ کہو اور اُنْظُرْنَا کہو اور خوب سُن لو اور کافروں کے لیئے دردناک عذاب ہے۔ ۹۱ھ

۹۱ھ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا: صحابہ کرام علیہم الرضوان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم دین حاصل کرنے اور حضور کے ارشادات سننے کے لیئے خدمت اقدس میں حاضر ہوا کرتے تھے ان مومنین میں منافقین بھی آ بیٹھتے تھے۔ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور وعظ و نصیحت کے دوران بعض اوقات صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے راعنا کہتے۔ یعنی حضور ہماری رعایت فرمائیں تاکہ ہم حضور کے فرامین کو پوری طرح سمجھ کر یاد رکھ سکیں۔ لفظ راعنا مراعاۃ سے ماخوذ ہے۔ صحابہ کرام کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کو سن کر بخوبی سمجھیں اور اپنے دل کی گہرائیوں میں انہیں محفوظ کر لیں۔ منافقین جو اصل میں یہودی تھے مسلمانوں سے راعنا سن کر بدنیتی اور گستاخی کے ارادے سے یہی لفظ حضور کی شان میں بولنے لگے۔ یہ لفظ ان کی لغت میں گالی تھا۔ اپنی زبان میں احمق کے لئے بھی وہ یہ لفظ بولا کرتے تھے۔ کبھی وہ رعنا کو کھینچ کر بولتے اور چرواہے کے معنی مراد لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے۔ ابن منذر نے روایت کیا کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ منافقین کی اس چالاکی پر مطلع ہو گئے۔ انہوں نے منافقین سے فرمایا کہ اگر آئندہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یہ لفظ بولا تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ یہودیوں نے کہا مسلمان بھی تو حضور کو راعنا کہتے ہیں۔ حضرت سعد، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں غمگین ہو کر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

اُنْظُرْنَا : یعنی حضور ہمارا انتظار فرمائیں یا ہماری طرف نظر التفات فرمائیں تاکہ آپ کے ارشادات کو ہم پوری طرح محفوظ رکھ سکیں۔

وَاسْمَعُوْا : یعنی بارگاہِ رسالت میں تخاطب کے جو آداب و احکام اس آیت میں بیان فرمائے گئے انہیں اچھی طرح سن لو یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات بغور سن لیا کرو تاکہ تمہیں کوئی تردد لاحق نہ ہو۔

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ : جس کلمہ کے استعمال میں سوء ادب کا ادنیٰ ترین شائبہ پایا جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اس کا بولنا ہرگز جائز نہیں۔ مخفی نہ رہے کہ کلمہ صریحہ محتاج نیت نہیں ہوتا نہ وہ تاویل کو قبول کرتا ہے اس لئے توہین کے معنی میں

جو کلمہ صریح ہو وہ نیتِ توہین کے بغیر بھی توہین ہے۔ اگر اس میں تاویل کی جائے تو درست نہ ہوگی کیونکہ الصراح لا یقبلُ التاویلَ۔ شانِ رسالت میں اس قسم کے کلمات توہین کی نیت کے بغیر بھی توہین ہونے کے باعث کفر ہیں اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔
اس آیت کریمہ سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوا کہ اہل حق کو اس جائز قول و فعل سے بھی روکا جائے گا جو اہل باطل کے کسی غلط نظریہ کی تقویت کا موجب ہو جیسا کہ صحابہ کرام کو راعنا کہنے سے روکا گیا۔ کہ ان کے اس قول سے منافقین کے گستاخانہ رویہ کو تقویت پہنچتی تھی۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ
الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ
مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ
بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

(اے مسلمانو) کفر کرنے والے اہلِ کتاب اور مشرک نہیں چاہتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی (وحی) نازل کی جائے اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے جسے چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ۹۲

۹۲ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: منافقین اپنے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بغض و عناد لئے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو راعنا کہہ کر بظاہر چاپلوسی کرتے اور باطن میں یہ لفظ بول کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے تھے اللہ تعالیٰ نے

آیتِ کریمہ لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا نازل فرما کر منافقوں کو ذلیل فرمایا۔ اسی طرح یہودی مسلمانوں کے ساتھ بظاہر محبت کا دم بھرتے تھے اور دلوں میں اُن کی طرف سے بغض و حسد رکھتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کی حقیقتِ حال بھی مسلمانوں پر عیاں فرمادی کہ مشرکین ہوں یا اہلِ کتاب سب پر اسلام کی صداقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ لیکن اسلام اور مسلمین کی طرف سے جو بغض و کینہ اُن کے دِلوں میں بھرا ہُوا ہے وُہ انہیں اسلام قبول کرنے سے روک رہا ہے۔ وُہ ہرگز اس بات کو پسند نہیں کرتے ہیں کہ مسلمانوں پر ان کے رب کی طرف سے کوئی خیر نازل ہو مگر ان کے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت کے ساتھ مسلمانوں کو خاص کر لیا۔

مضمونِ آیت سے یہ امر واضح ہو گیا کہ اگر باطل پرست لوگ اہلِ حق کے ساتھ دوستی و محبت کا اظہار کریں تو ان پر اعتماد نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ان کے دِل حق پرستوں کے بُغض و عناد سے خالی نہیں۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا
نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ
اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾

جو آیت ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں (تو) اس سے بہتر یا اس جیسی لے آتے ہیں (اے مخاطب) کیا تُو نہیں جانتا کہ بیشک اللہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ ۹۳

۹۳ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ: لفظ نسخ حسب ذیل معانی میں وارد ہُوا ہے۔
۱۔ ازالہ ۲۔ تبدیل ۳۔ تحویل ۴۔ نقل الکتابۃ ۔ ۵۔ انتہائے مدت عمل ۶۔ رفع حکمِ شرعی بحکمِ شرعی۔

نسخِ شرائع پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے صرف یہود اس کے منکر ہیں۔ شریعتِ محمدیہ میں بعض آیاتِ قرآنیہ اور احکام میں نسخ واقع ہونے پر جمہورِ اُمت کا اتفاق ہے۔ ابو مسلم اصفہانی و دیگر معتزلہ نے اس کا انکار کیا ابو مسلم اصفہانی سے منقول ہے کہ اگرچہ شریعتِ محمدیہ میں نسخ عقلاً ممکن ہے مگر واقع نہیں ہوا[1]

متقدمین نے لفظ "نسخ" کو پہلے معنی میں استعمال کیا اور اُنہوں نے کہا کہ کسی چیز کو کسی دُوسری چیز سے زائل کر دینا نسخ ہے اور "ازالہ" کو اُنہوں نے عام رکھا۔ کسی آیت کی تلاوت کا ازالہ بھی نسخ ہے اور کسی حکمِ شرعی کا بدل جانا بھی نسخ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کسی حکمِ شرعی یا آیت کے اوصاف میں سے کسی وصف کے جزوی ازالہ کو بھی اپنی اصطلاح میں وہ نسخ ہی کہتے ہیں مثلاً کسی آیت کا اس کے متبادر معنی سے غیر متبادر معنی کی طرف مصروف ہو جانا، اسی طرح استثناء، نیز تخصیصِ عام، تقییدِ مطلق یا کسی قید کے اتفاقی ہونے کا بیان وغیر ذلک۔ جس آیت یا حکمِ شرعی کے کسی وصف میں اُنہیں ادنیٰ ترین جزوی ازالہ نظر آیا اسی کو اُنہوں نے نسخ سے تعبیر کر دیا۔ اوصافِ آیات کے کسی وصف میں اس نوعیت کا ازالہ بکثرت آیات میں پایا جاتا ہے اس لیے ان کے نزدیک آیاتِ منسوخہ کی تعداد پانچ سو بلکہ اس سے بھی زائد تک پہنچ گئی ——— اور متاخرین نے لفظ نسخ کو صرف ابدال یا تبدیل کے معنی میں استعمال کیا اور مذکورہ بالا نوعیت کے جزوی ازالہ یا جزوی تبدیلی کو اُنہوں نے نسخ نہیں کہا چنانچہ متاخرین اور بعض اصولیین کے نزدیک نسخ کے معنی ہیں .... بَیانُ اِنتِہاءِ التَّعَبُّدِ بِقِراءَتِہا ... اَو اِنتِہاءِ الحُکمِ المُستَفادِ مِنہا ... اَو بِہِما جَمِیعًا ....

(رُوح المعانی۔ ج:۱، ص:۳۱۶) یعنی عبادت سمجھ کر کسی آیت کے پڑھنے کی مُدت ختم ہو جانے کا بیان۔ یا جو حکم اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے بطور عبادت اس پر عمل کرنے کی مُدت کے ختم ہونے کا بیان۔ یا دونوں کی انتہائے مدت کا بیان نسخ ہے ——— اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ آیاتِ منسوخہ کی تعداد میں متقدمین اور متاخرین کا اختلاف ان کی اصطلاح

پر مبنی ہے جس کی حیثیت نزاعِ لفظی سے زیادہ کچھ نہیں۔ لکل ان یصطلح بما شاء۔

واضح رہے کہ قرآن مجید میں کوئی اختلاف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا"، یعنی اگر قرآن مجید غیر اللہ کا کلام ہوتا تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے یعنی نظمِ کلام میں بہت تفاوت ہوتا۔ مضامین بھی متناقض ہوتے۔ کثرتِ الفاظ اور کثرتِ معانی کے لحاظ سے "اِخْتِلَافًا كَثِيْرًا" فرمایا گیا جب کہ قرآن پاک کے نظمِ کلام اور اس کے معانی و مضامین میں ایک بھی اختلاف موجود نہیں جو صداقتِ قرآن کی روشن دلیل ہے۔ اگر کسی نے قرآن میں کہیں اختلاف سمجھا تو یہ اس کے اپنے فہم کی غلطی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کلام تعارض، تناقض اور اختلاف سے پاک ہے۔ قرآن میں نسخ ضرور پایا گیا مگر اختلاف اور تناقض سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مظہری میں ہے۔ وَاَمَّا النَّاسِخُ وَالْمَنْسُوْخُ فَلَيْسَ مِنْ بَابِ الْاِخْتِلَافِ (مظہری۔ ص: ۱۷۰، ج: ۲، پ۲) یہود اور مشرکین عرب نے بعض احکام شرع کے منسوخ ہونے پر مذاق اڑایا تھا۔ اور آج تک بعض ملحدین بھی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کسی حکمِ شرعی کے منسوخ ہونے کا قول اس لئے صحیح نہیں کہ اس سے لازم آتا ہے کہ شارع نے جو حکم پہلے دیا تھا وہ قابلِ عمل نہ تھا۔ جسے منسوخ کرنا پڑا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نسخ کا قول کسی حکمِ شرعی کے ناقص ہونے کو ہرگز مستلزم نہیں نہ اس سے شارع کی لاعلمی ثابت ہوتی ہے۔ نسخ کے معنی پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اہلِ حق جن احکامِ شرع کو منسوخ مانتے ہیں وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ احکامِ منسوخہ ایک وقتِ خاص تک عمل کرنے کے لئے نازل ہوئے تھے۔ جب وہ مدت پوری ہو گئی تو شارع نے اس مدت عمل کی انتہا اور اختتام کو بیان کر دیا۔ یہی نسخ ہے۔ اور اس سے کسی حکم کا ناقص ہونا یا شارع کا "لاعلم ہونا" ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس سے شارع کے کمال علم و حکمت کا اثبات ہوتا ہے۔ ایک طبیب حاذق

کسی مریض کا معائنہ کرنے کے بعد جب نسخہ تجویز کرتا ہے تو مریض کی حالت کے تغیر کے ساتھ وہ اپنے نسخہ میں بھی تغیر و تبدل کرتا ہے جو اس کی حذاقت کی دلیل ہے۔ پورے نظام کائنات میں یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے۔ مثلاً۔ بچہ ایام طفولیت سے لیکر انتہائے شباب تک جب اپنے مراحل زندگی طے کرتا ہے تو ہر مرحلہ پر نسخ کے احکام سے دوچار ہوتا ہے اس کی غذا، دوا اور لباس کے احکام بچپن، جوانی، اور انتہائے شباب تک بدلتے رہتے ہیں۔ جب وہ جوانی کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اس کی طبعی خوراک، لباس اور دوا کا معیار متعین ہو جاتا ہے۔ شریعت کی ابتداء، آدم علیہ السلام سے ہوئی جو نبوت کے مختلف ادوار میں نسخ کے مراحل سے گزرتی ہوئی شریعت محمدی کے زمانہ میں اپنے منتہائے شباب کو پہنچ گئی۔ من حیث الشرع اس کا معیار متعین ہو گیا۔ جس کے بعد نسخ شریعت کی حیثیت سے اس کے منسوخ ہونے کا احتمال منقطع ہو گیا۔ آیت کریمہ "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" میں لفظ "اَلْیَوْمَ" ہمارے اس دعویٰ کی روشن دلیل ہے۔ شریعت محمدیہ میں جو احکام منسوخ ہوئے اور ناسخ احکام نے ان کی جگہ لی درحقیقت وہ طبیعت شرعیہ کے تقاضوں کی تکمیل تھی۔ اور بنی نوع انسان کی طبیعت انسانیہ کو قیامت تک پیش آنے والے تغیر و تبدل کے مراحل میں جو احکام ضروری ہو سکتے تھے ان سب کے اکمال پر تنبیہ ہو گئی۔ "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ" کے بعد مطلقاً نسخ کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا۔ پوری شریعت اور کل احکام عملیہ محکم قرار پائے جو لوگ آج بھی نسخ احکام کے مجوز ہیں۔ "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" پر ان کا یقین نہیں۔ رہا یہ امر کہ "اَلْاَحْکَامُ تَتَغَیَّرُ بِتَغَیُّرِ الْاَزْمَانِ" تو اس سے نسخ مراد لینا حق و انصاف کا خون کرنا ہے زمانہ کے تغیر سے جو احکام متغیر ہوں گے ان کے لئے نہ کوئی جدید وحی آسمانی نازل ہو گی نہ کسی انسان کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ اپنی سمجھ سے جس طرح چاہے احکام کو بدل کر رکھ دے بلکہ یہی مکمل دین جو کتاب و سنت پر مشتمل ہے اس میں ایسے اصول پائے جاتے

ہیں جن کے مطابق مجتہدین اہلِ بصیرت احکام کا استنباط کر سکتے ہیں ہر مدعی علم و بصیرت کا یہ منصب نہیں۔ یہ مقام صرف ان اصحاب فہم و فراست کے لئے مخصوص ہے جو من حیث المجموع اہل حق اُمت محمدیہ کے نزدیک معتمد ہوں لاغیر۔ اس میدان میں لوگوں کو کھلی چھٹی مل جائے تو وہ پوری شریعت مطہرہ کو مسخ کر کے رکھ دیں جیسا کہ اس دور میں مدعیان "فکر و نظر" کے کرتوت سب کے سامنے ہیں۔

"مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ" میں "ما" شرطیہ ہے لیکن اس سے کسی آیت قرآنیہ میں نسخ واقع نہ ہونے پر استدلال صحیح نہیں جیسا کہ آیت کریمہ "يَا بَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى" میں جملہ شرطیہ ہے لیکن بنی آدم کے پاس اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا آنا یقیناً حق ہے۔ آدم علیہ السلام سے لیکر ختم المرسلین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ہی لیکر بنی آدم کے پاس تشریف لاتے رہے۔ اسی طرح آیات قرآنیہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نسخ کا واقع ہونا بھی یقیناً حق ہے۔

نسخ کی اقسام اربعہ

نسخ کی چار اقسام ہیں ۱۔ نسخ الکتاب بالکتاب۔ ۲۔ نسخ السنۃ بالسنۃ ۳۔ نسخ الکتاب بالسنۃ ۴۔ نسخ السنۃ بالکتاب۔ علمائے احناف اور مالکیہ کے نزدیک نسخ القرآن بالسنۃ کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کے جواز کے قائل نہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ آیت قرآنیہ "مَا نَنْسَخْ" کی رُو سے ناسخ کا منسوخ سے بہتر یا اس کی مثل ہونا ضروری ہے کتاب وحی متلو ہے اور سنۃ غیر متلو۔ ظاہر ہے کہ غیر متلو متلو سے نہ بہتر ہو سکتا ہے نہ اس کی مثل۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کلامی لا ینسخ کلام اللہ و کلام اللہ ینسخ کلامی (مشکوٰۃ المصابیح۔ ص: ۳۲) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ ناسخ کا خیر اور مثل ہونا تلاوت میں منحصر نہیں۔ سہولت اور مصلحت کے اعتبار سے بھی خیر اور مثل ہونا ممکن ہے۔ نیز یہ کہ ناسخ کا منسوخ سے بہتر یا اس کی مثل ہونا من جمیع الوجوہ ضروری نہیں۔ بوجہ من الوجوہ بھی خیر اور مثل ہونا کافی ہے۔ کما لا یخفی

لہٰذا مصلحت اور سہولت کے اعتبار سے سنت کا کتاب سے خیر یا مثل ہونا متحقق ہو سکتا ہے اس لئے سنت کتاب کی ناسخ ہو سکتی ہے۔

دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے جو کلام بھی صادر ہوا وہ یقیناً حق ہے عام اس سے کہ من جہۃ البشریۃ ہو یا من جہۃ الرسالۃ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دہن اقدس کی طرف اشارہ کر کے ارشاد فرمایا۔

فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ مَا یَخْرُجُ مِنْہُ اِلَّا حَقٌّ۔ جس ذات پاک کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس کی قسم اس دہن سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ (ابوداود۔ ص: ۱۵۸، ج: ۲) لیکن کلام اللہ کا ناسخ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہی کلام ہوگا جو "اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَہٗ مَعَہٗ" کا مصداق ہے جسے قرآن کریم نے "الحکمۃ" سے تعبیر کیا اسی کو لفظ سنت سے بھی یاد کیا جاتا ہے جس کے سانچے میں احکام شرعیہ ڈھلتے رہے۔ لہٰذا سنت کے ناسخ قرآن ہونے پر کوئی محذور لازم نہیں آتا۔

اَوْ نُنْسِہَا : ابوعمرو اور ابن کثیر وغیرہ نے بفتح النون والسین "نَنْسَاھَا" پڑھا۔ یہ قرأت بعض صحابہ کی طرف بھی منسوب ہے۔ "ننسا" کا ماخذ نساء ہے۔ نساء کے دو معنی ہیں ترک اور تاخیر۔ یعنی بعض آیات کا نازل کرنا ہم نے ترک کر دیا۔ اور تاخیر سے مراد ہے کہ آیت کی تلاوت کو منسوخ فرما دیا اور اس کے حکم کو باقی رکھا۔ یہی باقی رکھنا حکم کا مؤخر کرنا ہے۔ جیسے آیۃ رجم کہ اس کی تلاوت منسوخ ہو گئی اور حکم باقی ہے (مظہری ص: ۱۱۲، ج: ۱، قرطبی۔ ص: ۶۷، جز: ۲)

باقی قراء نے "مُنْسِہَا" بضم النون وکسر السین پڑھا۔ جس کا ماخذ اِنْسَاءٌ یا نِسْیَانٌ ہے۔ جس کے معنی ہیں بھلا دینا اور دل سے محو کر دینا۔ چنانچہ بروایت ابوبکر ابن الانباری علامہ قرطبی اور ابن کثیر دونوں نے ابوامامہ بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث

بیان کی کہ بعض صحابہ رات کو کھڑے ہوئے انہوں نے قرآن کی ایک سورۃ پڑھنا چاہی تو بسم اللہ کے سوا کچھ نہ پڑھ سکے۔ صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سورت کی تلاوت اور حکم دونوں اٹھا لئے گئے۔ کسی آیت کے نازل کرنے کو ترک کرنے کی وضاحت میں کہا جا سکتا ہے کہ مثلاً دن رات میں خمسہ صلوات کی فرضیت کے الفاظ وحی متلو میں کہیں نازل نہیں ہوئے۔ اگرچہ وحی غیر متلو کی صورت میں اس کا حکم موجود ہے۔ مگر اس حکم کے لئے آیت نازل نہیں فرمائی گئی۔ جس میں خمسہ صلوات کے الفاظ موجود ہوں۔ اسی طرح تاخیر کی مثال میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کسی آیت کے بیانِ مفہوم سے متعلقہ آیت کا تاخیر سے نازل کیا جانا ہے جیسے آیت کریمہ "كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ" میں لفظ "مِنَ الْفَجْرِ" "كُلُوا وَاشْرَبُوا" کے نزول کے بعد تاخیر سے نازل ہوا۔ (بخاری۔ ص ۲۵، ج ۱؛ مسلم۔ ص: ۳۴۹، ج ۱)

اسی طور پر آیت کریمہ "إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ"۔ آیت مبارکہ "إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنْتُمْ لَهَا وَارِدُونَ"۔ کے بعد تاخیر سے نازل ہوئی۔

نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا: جو آیت ہم منسوخ کر دیں یا بھلا دیں اس سے بہتر یا اس کی مثل لے آتے ہیں۔ یہاں لفظ "خیر" افضل کے معنی میں نہیں۔ کیونکہ نفسِ فضیلت میں پورا قرآن یکساں ہے۔ بعض کو بعض سے افضل نہیں کہہ سکتے۔ یہاں مصلحت و سہولت یا اجر اخروی کے اعتبار سے بہتر یا اس کی مثل ہونا مراد ہے اگرچہ وحی متلو ہونے کے اعتبار سے قرآن ہی سنت سے بہتر ہے۔ لیکن مصلحت اور سہولت کے اعتبار سے سنت بھی آیت سے بہتر ہو سکتی ہے۔ بعض اوقات کسی حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ بظاہر کوئی دوسرا حکم نہیں لایا جاتا۔ وہاں وہی مصلحت اور سہولت

دُوسرے حُکم کے قائم مقام ہوتی ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ

اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

(اے سُننے والے) کیا تجھے معلُوم نہیں کہ زمینوں اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے؟ اور (اے مُسلمانو) اللہ کے سوا تُمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں ۹۴ھ

۹۴ھ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا لَكُمْ۔ الخ: اِس آیت میں بظاہر حضُور صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہیں لیکن مُراد اُمّت ہے۔ جس کی دلیل اِسی آیت کریمہ میں "مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ"۔ ہے (قرطبی۔ ص: ۶۹، جزء دوم) آیت کریمہ کا خلاصہ یہ ہے کہ زمینوں اور آسمانوں کا مُلک اللہ ہی کے لئے ہے۔ بادشاہ کی شان یہ ہے کہ وُہ اپنی رعایا کی مصلحتوں اور سہُولتوں کا عالم ہو۔ اور اُن کو پُورا کرنے کی قُدرت بھی رکھتا ہو۔ اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کی مصلحتوں اور سہُولتوں کو ازل سے جانتا ہے۔ اور اُنہیں پُورا کرنے پر قادر بھی ہے۔ کسی آیت کو منسُوخ کر دینا یا بھُلا دینا اِسی مصلحت اور سہُولت کے لئے ہے۔ جو لوگ نسخ پر معترض ہیں دراصل وُہ اللہ تعالیٰ کی سلطنت اُس کی حکمت اور اس کے علم و قُدرت کے مُنکر ہیں۔ قیامت کے دن ان کا کوئی حامی و مددگار نہ ہوگا۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا

سُبِيلَ مُوسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ

الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾

کیا تم (بھی) اپنے رسُول سے ایسے (بیہودہ) سوال کرنا چاہتے ہو جیسے پہلے (زمانہ میں) موسیٰ سے کئے گئے۔ اور جو ایمان کے بدلے کُفر اختیار کرے تو بیشک وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔ ۹۵ھ

۹۵ھ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ۔ الآیۃ: اس آیت کریمہ کی شانِ نزول میں حسب ذیل متعدّد اقوال ہیں۔ ۱۔ عبداللہ بن ابی امیہ المخزومی نے حضُور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کہا کہ آپ آسمان سے ایک خط لے آئیں جس میں لکھا ہو کہ "یہ خط رب العٰلمین کی طرف سے ابن ابی امیہ مخزومی کی طرف ہے اے ابن ابی امیہ! تو جان لے کہ بے شک میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو لوگوں کی طرف رسُول بنا کر بھیجا ہے"۔

۲۔ مشرکین عرب نے حضُور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ حضُور انہیں کھلم کھلا اللہ تعالیٰ کی ذات دکھا دیں۔ ورنہ وُہ ایمان نہیں لائیں گے۔

۳۔ قریش نے حضُور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کہا کہ آپ کوہ صفا کو سونا بنا دیں۔ مکہ کی زمین کو ہمارے لئے کُشادہ کر دیں اور اس میں نہریں جاری کر دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔

۴۔ کچھ لوگوں نے سوال کیا کہ آپ اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آئیں۔ ورنہ ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے۔

۵۔ بغوی نے کہا کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ آپ ہمارے پاس آسمان سے پوری کتاب اسی طرح لے آئیں جیسے موسیٰ علیہ السلام توراۃ لائے تھے۔

۶۔ حضرت ابو العالیہ سے مروی ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے گناہوں کے کفارے بھی اسی طرح مقرر ہو جاتے جیسے بنی اسرائیل کے گناہوں کے کفارے مقرر ہوتے تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو کفارے عطا فرمائے ہیں وہ بنی اسرائیل کے کفاروں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ بنی اسرائیل کا حال یہ تھا کہ جب ان میں سے کوئی گناہ کرتا تو وہ اپنا گناہ اور اس کا کفارہ اپنے دروازے پر لکھا ہوا پاتا تھا اگر وہ اس کفارے کو پورا کرتا تو دنیا میں اس کے لئے ذلت ہوتی اور اگر نہ پورا کرتا تو اس کے لئے آخرت میں رسوائی کا سبب بن جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس سے بہتر کفارہ عطا فرمایا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (سورۃ النساء آیت ۱۱۰) یعنی جس نے کوئی برائی کی یا اپنی جان پر ظلم کیا پھر اللہ سے مغفرت طلب کی تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا پائے گا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا پانچ نمازیں اور جمعہ سے جمعہ تک کی نمازیں اور نیکیاں درمیانی گناہوں کے لئے کفارہ ہیں۔

آخری قول کی روشنی میں اَمْ تُرِيْدُوْنَ میں مسلمان مخاطب ہیں۔ آیت کریمہ میں "رَسُوْلَكُمْ" کے ظاہر الفاظ اور حضرت ابو العالیہ کی روایت میں "قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" سے اسی کی تائید ہوتی ہے اور یہود و نصاریٰ کو بھی اس کا مخاطب قرار دیا جا سکتا ہے کہ اے یہود و مشرکین! کیا تم اپنے رسول (یعنی اپنے زمانہ میں اپنی طرف بھیجے ہوئے رسول) محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ایسے ہی سوالات کرنا چاہتے ہو جیسے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کئے گئے۔

شانِ نزول کے اعتبار سے مخاطب کوئی بھی ہو بہر صورت مؤمنین ہی کو اپنے رسُول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے نامناسب سوال کرنے سے روکنا مقصُود ہے. جو چیزیں ابھی تک وقوع پذیر نہیں ہُوئیں ان کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کثرتِ سوال کی ایمان والوں کو ممانعت فرمادی گئی یعنی کسی امر کے واقع ہونے سے پہلے اس کے بارے میں سوال نہ کرو. ہو سکتا ہے کہ کسی سوال کی وجہ سے کوئی حلال چیز حرام ہو جائے. فرضیتِ حج کا حُکم آنے کے بعد ایک صحابی نے عرض کیا۔ "اَکُلَّ عَامٍ یَا رَسُوْلَ اللہِ! حضُور! کیا ہر سال حج فرض ہے۔؟ حضُور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خاموش ہو گئے. صحابی نے تین مرتبہ یہ سوال کیا. تینوں مرتبہ حضُور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خاموشی اختیار فرمائی اس کے بعد فرمایا "لَا" یعنی ہر سال حج فرض نہیں اور فرمایا اگر میں "نعم" یعنی ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا۔ اور اگر ایسا ہوتا تو ہم ہرگز اس کی طاقت نہ رکھتے. حدیث شریف میں وارد ہے. سب سے بڑا مجرم وہ مُسلمان ہے جس نے کسی ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا جو حرام نہیں کی گئی تھی پھر اس کے سوال کی وجہ سے وُہ حرام ہو گئی۔ اِس لیے حضُور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ کسی چیز کے واقع ہونے سے پہلے مُجھ سے سوال نہ کیا کرو. کیُونکہ ہو سکتا ہے کہ اِس سوال کرنے کی وجہ سے وُہ چیز حرام کر دی جائے. (ملخصاً. ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۱)

بنی اسرائیل اسی قسم کے سوالات مُوسیٰ علیہ السلام سے کیا کرتے تھے. مثلاً اللہ تعالیٰ نے ان کو گائے ذبح کرنے کا حُکم دیا اگر وُہ کوئی بھی گائے ذبح کر کے اس حُکم پر عمل کر لیتے تو ان کے لیے کافی ہو جاتا. لیکن اُنہوں نے بکثرت بے جا سوالات کئے. اللہ تعالیٰ نے رسُول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بے جا سوال کر کے اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنے سے مسلمانوں کو منع فرما دیا۔

تنبیہ: مخفی نہ رہے کہ دین کی باتیں اور شریعت کے احکام معلُوم کرنے کے لیے سوال کرنا ہرگز ممنُوع نہیں بلکہ ضروری ہے. حدیث شریف میں ہے۔ "اِنَّمَا شِفَاءُ الْعِیِّ

السؤال" (ابوداؤد۔ ص ۴۹۰، ج ۱) جہالت سے نجات کا ذریعہ سوال ہی ہے۔ جو سوال کسی حلال چیز کے حرام ہونے کا سبب بن جائے عہد رسالت کے بعد متصور نہیں مگر لایعنی اور بیہودہ سوالات ہر زمانہ میں ممنوع ہیں۔

وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ : لوگوں کے لئے رسول کی بعثت کا فائدہ یہی ہے کہ وہ رسول پر ایمان لاکر گمراہی سے بچیں اور نجاتِ اُخروی کا سیدھا راستہ انہیں نصیب ہو۔ مگر معاندین یہود و مشرکین نے سرکشی اختیار کی۔ بیہودہ سوالات کرکے رسول کا مذاق اڑایا اور ایمان لانے کی بجائے کفر پر جمے رہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو قبول نہ کیا۔ اس کے رسول کی دکھائی ہوئی سیدھی راہ اختیار نہ کی۔ گمراہی کی وادیوں میں بھٹکنے لگے اور بالآخر اسی میں ہلاک ہو کر رہ گئے۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۰۹

بہت سے اہل کتاب نے اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہا کہ تمہارے ایمان لانے کے بعد وہ پھر تمہیں کافر بنادیں اس کے بعد کہ حق ان پر خوب ظاہر ہو گیا تو (انہیں) معاف

کر دو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا (کوئی اور) حکم لائے بیشک اللہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ ۹۶

---

۹۶ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ: عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت کریمہ اخطب یہودی کے دو بیٹوں حیی اور ابو یاسر کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہود اس خیال میں تھے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری قوم میں پیدا ہوں گے لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک پیدائش قوم عرب میں ہوئی تو یہودی آتش حسد میں جل بھن گئے اسی حسد کے باعث بہت سے یہودی حق کو پہچاننے کے باوجود چاہتے تھے کہ معاذ اللہ مسلمان مرتد ہو کر ان کے دین میں آجائیں۔ اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آنے تک ان سے درگزر کریں بالآخر وہ وقت آگیا کہ یہود کے غدر کے باعث رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے قتال فرمایا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ ذلیل و خوار ہو کر کیفر کردار کو پہنچے (مظہری ص ۱۴۱ ج ۱) ملخصا۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۱۱۰

اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور جو نیکی تم اپنے لئے پہلے سے بھیج دو گے اسے اللہ کے پاس پاؤ گے بے شک اللہ تمہارے سب کام خوب دیکھ رہا ہے۔ ۹۷

۹۷ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ : یعنی اللہ تعالیٰ کا حکم آنے سے پہلے تم ان سے کوئی تعرض نہ کرو، نماز ادا کرتے اور زکوٰۃ دیتے رہو تم جو بھی نیکی کرو گے اللہ تعالیٰ کے پاس ضرور اُس کا ثواب پاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں وُہ تمہارے نیک کاموں کا اجر تمہیں ضرور عطا فرمائے گا۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا
مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ
قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾

اور اہل کتاب نے کہا کہ ہرگز نہ جائے گا جنّت میں مگر وُہ جو یہُودی یا نصرانی ہو یہ اُن کی (باطل) آرزوئیں ہیں فرما دیجئے اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل لاؤ۔ ۹۸

۹۸ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ۔ الآیۃ : نصاریٰ نجران کا وفد جب بارگاہِ نبوّت میں حاضر ہُوا تو یہُود بھی وہاں پہنچ گئے اور دونوں نے ایک دُوسرے کی تکذیب شروع کر دی۔ یہُود نے کہا کہ یہُود کے سوا کوئی جنّت میں نہ جائے گا اور نصاریٰ نے کہا نصاریٰ کے سوا کوئی جنّت میں نہ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کی تکذیب فرماتے ہُوئے ارشاد فرمایا کہ یہ سب ان کی نفسانی خواہشات اور جھُوٹی تمنائیں ہیں جن پر ان میں سے کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں۔

بَلٰى ق مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ
فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

ہاں کیوں نہیں! جس نے اپنے آپ کو اللہ کے لئے جھکا دیا اور وہ نیکوکار ہے تو اس کے لئے اس کے رب کے پاس اس کا ثواب ہے اور ان پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۹۹ھ

۹۹ھ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ - الآیۃ : اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ دونوں اپنے اس قول میں جھوٹے ہیں جنت میں وہی لوگ جائیں گے جنہوں نے صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے ظاہر و باطن کو جھکا دیا۔ عقیدۂ توحید قبول کر کے نیکی اور بھلائی کی راہ پر استقامت اختیار کی وہی اپنے رب کی طرف سے ثواب پانے والے ہیں اور وہی لوگ آخرت میں بے خوف اور بے غم ہوں گے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ

لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ

النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ

وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ

الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ

يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ

يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور یہود نے کہا کہ نصاریٰ کسی شئی پر نہیں اور نصاریٰ بولے یہود کسی شئی پر نہیں حالانکہ وُہ (آسمانی) کتاب پڑھتے ہیں (اسی طرح (مُشرک) جاہلوں نے (بھی) اُنہی کی سی بات کہی تو اللہ قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ جس بات میں وُہ اختلاف کرتے تھے۔ ۱۰۰؎

۱۰۰؎ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتْ۔ الآیۃ: یہود و نصاریٰ دونوں اہل کتاب ہیں توراۃ عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی تصدیق کرتی ہے اور انجیل توراۃ اور موسیٰ علیہ السلام کی مصدق ہے۔ تلاوتِ کتاب کے باوجود یہود نے عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی تکذیب کی اور نصاریٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ کو جھٹلایا۔ ہر ایک نے دُوسرے کے دین کا انکار کیا۔ مُشرکین عرب بُت پرست اور مجوس نے بھی گزشتہ ادوار میں ایک دُوسرے کا رد کیا۔ اہل حق کو بھی اُنہوں نے اپنی تکذیب کا نشانہ بنایا۔ ان کے اس انکار و باہمی تکذیب کا فیصلہ قیامت کے دِن اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اور ہر ایک کا انجام اس کے سامنے آجائے گا۔ اس آیتِ کریمہ کا مضمون بھی نصاریٰ نجران کے وفد کے واقعہ سے متعلق ہے جب کہ احبارِ یہود اور نصاریٰ نجران کے درمیان تلخ کلامی ہوئی۔ ہر ایک نے دُوسرے کے دین کو جھٹلایا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ

اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ

خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ

اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي

الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

اور اُس سے بڑا ظالم کون ہے جس نے اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا نام ذکر کیے جانے سے روکا اور ان کی ویرانی میں کوشش کی ایسے لوگ اس لائق نہیں کہ وہ مسجدوں میں جائیں مگر ڈرتے ہوئے اُن کے لئے دُنیا میں ذلت اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ ۱۱۴

۱۱۴ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ۔ الآیۃ: رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ کرام کے ساتھ عُمرہ کا احرام باندھ کر مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہُوئے جب مقامِ حدیبیہ میں پہنچے تو مشرکین مکہ نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے روک دیا حتیٰ کہ حضُور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عُمرہ کئے بغیر حدیبیہ سے مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے اللہ تعالیٰ نے حضُور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسجدِ حرام سے روکنے والے مُشرکین کی مذمت میں یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ حضُور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا عُمرہ کے لئے تشریف لے جانا مسجدِ حرام میں اللہ کے ذکر کے لئے تھا۔ مُشرکین کا حضُور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی راہ میں حائل ہونا یقیناً مسجدِ حرام میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کو روکنا تھا۔ مسجدیں اللہ کے ذکر کے لئے ہوتی ہیں۔ اور ان کا آباد ہونا یہی ہے کہ اُن میں اللہ کا ذکر کیا جائے۔ اللہ کی مسجد کو اللہ کے ذکر سے روکنا مسجدوں کو ویران کرنا ہے۔ جس کے مرتکب مُشرکین مکہ ہُوئے اللہ تعالیٰ

نے ان کی شدید مذمت فرمائی اور انہیں سب سے زیادہ ظالم قرار دیا۔ اگرچہ آیت کریمہ مسجد حرام کے بارے میں نازل ہوئی مگر حکم سب مسجدوں کے لئے عام ہے اس لئے مسجد کے بجائے "مساجد اللہ" جمع کا صیغہ استعمال فرمایا۔ قیامت تک ہر مسجد کا حکم یہی ہے۔ کہ اس میں اللہ کے ذکر کو روکنا ظلم ہے اور اللہ کی مسجد کو ویران کرنا ہے۔

ملحوظ رہے کہ یہاں ذکر سے وہی ذکر مراد ہے جس کا تعلق اذان، نماز یا اذکار حسنہ سے ہو۔ جہر شدید کے ساتھ ذکر کرنا جو کسی نمازی یا دوسرے عبادت گزار کے لئے موجب تشویش ہو ہرگز جائز نہیں۔ ایسے جہر شدید سے روکنا ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شدت جہر سے صحابہ کرام کو روکا ہے ارشاد فرمایا۔ "اِرْبَعُوْا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ فَاِنَّکُمْ لَا تَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَلَا غَائِبًا (بخاری۔ ص: ۴۲۰) یعنی تم جہر میں اتنی شدت اختیار نہ کرو۔ اپنی جانوں پر نرمی کرو کیونکہ تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے۔

مخفی نہ رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر اللہ تعالیٰ کے ذکر سے جدا نہیں۔ درود شریف، کلمہ شہادت، اذان اور نماز میں اللہ کے ذکر کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر شامل ہے۔ حضور کے ذکر کے بغیر نہ اذان ہوگی، نہ درود، نہ کلمہ شہادت نہ نماز۔ اللہ و رسول دونوں کے ذکر سے مسجدیں آباد ہوتی ہیں معلوم ہوا کہ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روکنا بھی مسجدوں کو ویران کرنا ہے۔

اَنْ یَّدْخُلُوْهَا : یہاں خبر بمعنی انشا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو امر فرمایا کہ تم مشرکین سے قتال کرو اور انہیں ایسا مغلوب و مقہور کر دو کہ کوئی مشرک خوف زدہ ہوئے بغیر مسجد حرام میں داخل نہ ہو سکے۔ یا یہ کہ کسی مشرک کو مسجد میں داخل ہونے کا موقع ہی نہ دو۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ کسی مشرک کی لائق ہی نہیں کہ وہ بلا خوف و خطر مسجد میں داخل ہو۔ اس آیت کی توجیہ میں ایک قول یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان

سے وعدہ فرمایا کہ مسجد حرام کافر کے تسلط سے آزاد ہو گی اور کوئی مشرک دہشت زدہ اور خائف ہوئے بغیر مسجد حرام میں داخل نہ ہو سکے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ فتح مکہ کے وقت پورا فرما دیا۔

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ : شرک دنیا میں ذلت و خواری اور آخرت میں دردناک عذاب کا موجب ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ عزت و احترام کے ساتھ کسی مشرک کو مسجد میں لانا قطعاً حرام ہے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ

وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ

اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اور مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے ہیں تو جہاں کہیں تم (قبلہ کی طرف) منہ کرو وہیں اللہ (تمہاری طرف متوجہ) ہے بے شک اللہ (بڑی) وسعت والا بہت جاننے والا ہے۔ ۱۰۲ھ

۱۰۲ھ **وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ** : تمام زمینیں اور آسمان اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں مشارق و مغارب کا خالق و مالک وہی ہے۔ وہ قیم موجودات ہے۔ تمام مخلوقات اس کے وجود کا مظہر اور اس کے نور کی جلوہ گاہ ہے۔ اس نے خود فرمایا **اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ**۔ اس کی ذات موجود ہے مگر کسی زمان و مکان کے ساتھ مختص نہیں۔ امر قبلہ تعبدی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندے کو اس کی طاقت سے زیادہ کسی حکم کا مکلف نہیں بنایا۔ مثلاً خوفِ دشمن کی وجہ سے اگر استقبال قبلہ کی طاقت

نہ ہو تو جس طرف ممکن ہو رُخ کر کے فرض پڑھنا جائز ہے۔ اس میں کچھ گناہ نہیں اسی طرح اگر سمت قبلہ کہیں مشتبہ ہو جائے اور تحری کر کے فرض ادا کر لیا جائے اس کے بعد معلوم ہو کہ تحری سمت قبلہ کے خلاف تھی تو نماز ہو جائے گی اور اس میں کوئی گناہ نہیں یا بحالتِ سفر اگر سواریوں سے اُترنا اور رفتار کو منقطع کرنا تکلیف کا باعث ہو تو چلتے ہوئے جس طرف بھی سواری کا رُخ ہو نوافل پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

آیتِ کریمہ کی شانِ نزول میں یہی آخری قول راجح اور اصح ہے۔ جیسا کہ مُسلم، ترمذی اور نسائی نے عبداللہ بن عُمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تشریف لاتے وقت سواری پر چلتے ہوئے جدھر بھی سواری کا رُخ ہوتا تھا نوافل پڑھتے تھے۔ اس کے بعد ابن عُمر نے پڑھا وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ۔ اور فرمایا: "وَفِيْ هٰذَا أُنْزِلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ" یہ آیت اسی بارے میں نازل ہوئی (ترمذی، ص: ۱۲۰، ج: ۲) مُجاہد کا قول بھی ہے کہ یہ آیت کریمہ سفر میں سواری کے جانور پر بیٹھے ہوئے نوافل پڑھنے کے بارے میں ہے یعنی جس طرف بھی سواری کا رُخ ہو چلتے ہوئے اس پر نوافل پڑھنا جائز ہیں۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم دونوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ یہ آیت کریمہ یہود و مشرکین کے اُس اعتراض کے جواب میں نازل ہوئی جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے "سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا" میں فرمایا۔ لیکن اس اعتراض کا جواب تو اسی جگہ "قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ" نازل فرما کر دے دیا گیا ہے لہٰذا تحویلِ قبلہ کے واقعہ کو اس کی شانِ نزول قرار دینا صحیح نہیں "وجہ" چہرے کو کہتے ہیں جس سے ذات بھی مُراد ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ چہرہ سے پاک ہے اور اس کی ذات مقدس زمان و مکان سے بالاتر ہے۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔

أَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ: کے معنی یہ ہیں کہ تم جہاں ہو جہت

مامور بہا کی طرف اپنا رُخ پھیر لو۔ اللہ کا قبلہ تمہارے لئے وہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہیں اللہ کی رضا اور اُس کی رحمت تمہاری طرف متوجہ ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت متشابہات میں سے ہے جس کے معنی اللہ جل مجدہٗ اس کے رسُول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور مقربین حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا (ملخصاً از تفسیر مظہری۔ جلد اوّل۔ ص: ۱۱۶، ۱۱۷)۔

اس آیت کریمہ سے اللہ تعالیٰ کے لئے جہت یا مکان ثابت کرنا جہالت و ضلالت ہے۔ بعض لوگ اس آیت کریمہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ سفر میں جس طرف چاہو رُخ کر کے فرض نماز ادا کر لو۔ یہ صحیح نہیں۔ جو حدیث ہم نے اُوپر نقل کی ہے اُس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ تنگی سے بچنے کے لئے سفر میں محض نوافل میں مُسافر کو اختیار ہے کہ جانور پر سوار ہونے کی حالت میں نوافل پڑھ لے خواہ سواری کا رُخ کسی جانب بھی ہو۔ فرض اور وتر نماز کے لئے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہمیشہ سواری سے اترتے تھے اور قبلہ رو ہو کر نماز ادا فرماتے تھے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ

وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

اور اُنہوں نے کہا اللہ نے اپنی اولاد بنائی وہ (ہر عیب سے) پاک ہے بلکہ سب اُسی کی ملک ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں ہے سب اُس کی بارگاہ میں جھکے ہوئے ہیں۔

۱۰۳ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ : یہ آیت کریمہ یہود و نصاریٰ اور مُشرکین عرب کے رد میں نازل ہوئی۔ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ

نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہا اور مشرکین عرب نے کہا فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں کسی کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا یا بیٹی کہنا یا اللہ تعالیٰ کے لئے بیوی ثابت کرنا شرک قبیح اور جہل شنیع اور بارگاہِ حضرت حق سبحانہٗ وتعالیٰ میں شتم اور گالی ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری تکذیب کی اور مجھے گالی دی۔ اس کی تکذیب یہ ہے کہ اس نے معاد کا انکار کر دیا اور شتم یہ کہ اس نے کہا کہ اللہ کی اولاد ہے حالانکہ میں احد صمد ہوں نہ میں کسی کا باپ ہوں نہ بیٹا۔ کوئی میرا مثل نہیں۔ اھ۔ ممکن واجب کا مماثل نہیں اور مخلوق خالق کی مجانس نہیں۔ جب کہ والد اور ولد میں مجانست و مماثلت ضروری ہے۔ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ ولد سے پاک ہے۔ بلکہ زمین و آسمان کی ہر چیز، ممکنات کا ہر فرد اور موجودات کا ہر ذرہ اسی کا مملوک و مخلوق ہے وہ سب کا خالق بھی ہے اور مالک بھی۔ سب اسی کے فرمانبردار اور اس کی توحید کے گواہ ہیں۔ جن کی شہادت اور گواہی کو اپنے مشاعر قلوب سے ارباب قلوب ہی سمجھتے ہیں یا وہ اصحاب عقول جو اپنی ذوات ممکنہ اور اپنی ہر احتیاج سے وجودِ واجب پر استدلال کی صلاحیت رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ذات واجب الوجود ولد سے اور ہر حاجت سے پاک اور سب کا خالق و مالک اور محتاج الیہ ہے۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى

اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

بغیر مثال کے پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمینوں کا اور جب وہ کسی بات کا فیصلہ فرماتا ہے تو اس کے لئے یہی فرماتا ہے کہ "ہو جا" وہ فوراً ہو جاتی ہے۔ ۱۰۴

۱۱۷ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : اللہ تعالیٰ بغیر کسی مثالِ سابق کے سب آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمانے والا ہے وُہ زمان و مکان سے منزہ ہے اس نے بغیر کسی آلہ و مادہ کے زمین، آسمان اور اُن کے مابین کو بلکہ ہر چیز کو محض اپنی قدرت کاملہ سے پیدا فرمایا۔ جب کسی شے کے وجُود سے اس کا ارادہ متعلق ہوتا ہے اس کے لئے صرف "کُنْ" فرما دیتا ہے وہ چیز ہو جاتی ہے۔

کُنْ فَیَکُوْنُ : مضمونِ آیت کے بارے میں جو ہمارا اعتقاد ہونا چاہیئے اس کا خُلاصہ یہ ہے کہ وجُود میں آنے والے تمام معلُومات کا اللہ تعالیٰ ازل سے آمر ہے۔ مقدورات اور معلُومات کے متاخر ہونے کے باوجُود وہ ازل سے ہر مقدور کا قادر اور ہر معلُوم کا عالم ہے۔ اس آیت سے جو زمانہ استقبال پر دلالت مفہوم ہوتی ہے وہ مامورات کے اعتبار سے ہے کیُونکہ مامورات حادث ہیں اور حادث عدم سے وجُود میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف جو صفات منسُوب ہیں وہ ازلی اور قدیم ہیں لفظ کُن صفت تکوین کا تقاضا کرتا ہے۔ صفت تکوین قدیم ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ انتہیٰ۔

رُوح المعانی میں ہے محققین سادات حنفیہ اس طرف گئے ہیں کہ یہاں "کُن" امر کا صیغہ حقیقت پر محمول ہے۔ وُہ فرماتے ہیں کہ تکوین اشیاء میں سنت الٰہیہ اسی طرح جاری ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی تکوین کلمہ "کُن" سے فرماتا ہے اگرچہ اس کلمہ کے بغیر بھی اشیاء کی تکوین ممتنع نہیں اور "اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ" سے کلام ازلی مُراد ہے اس لئے کہ کلام لفظی حادث ہے جس کا قیام اللہ تعالیٰ کے ساتھ ممکن نہیں (رُوح المعانی، ص ۲۳۹، پ ۱)

یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب امر سے حقیقت امر مُراد ہے تو کُن کا مخاطب معدُوم کو قرار دیں گے یا موجُود کو۔ معدوم خطاب کا اہل نہیں اور موجُود کو مخاطب فرمانا ایجادِ موجُود ہے جو تحصیلِ حاصل ہونے کی وجہ سے ممکن نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ پیدا فرمانا چاہتا ہے وُہ خارج میں موجُود نہیں ہوتی لیکن علمِ الٰہی میں اس

کی صورت موجود ہوتی ہے۔ وہی صورتِ علمیہ امرِ کُن کا مخاطب ہے

علامہ الوسی نے آگے چل کر فرمایا کہ معتزلہ اور کثیر اہل سُنّت کا مذہب یہ ہے کہ یہاں "کُن فیکُون" سے حقیقت امر اور اس کا بجالانا مُراد نہیں بلکہ جس چیز کے ساتھ ارادۂ الٰہیہ متعلق ہو جائے۔ بلا تاخیر اس کے حصُول کے لئے بطور تمثیل یہ کلام وارد ہے کہ جس طرح کوئی مامُور اور مطیع اپنے آمر اور مطاع کا حکم بلا توقف بجالائے اسی طرح مُرادِ الٰہی بغیر کسی مہلت اور توقف کے حاصل ہو جاتی ہے۔ اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السّلام کے متعلق فرمایا "خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" کہ اللہ نے آدم علیہ السّلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر ان سے کُن (ہو جا) کہا "فَيَكُوْنُ" تو وہ ہو گئے جب ہر چیز کی پیدائش امرِ کُن سے ہوتی ہے پھر آدم علیہ السّلام کو مٹی سے پیدا کرنے کے بعد کُن فرمانا اور کُن کے فوراً بعد ان کا ہو جانا کیوں کر قابلِ فہم ہو سکتا ہے۔ جب کہ کُن بعد میں فرمایا گیا اور وُہ پیدا پہلے ہو چکے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں خَلَقَ بمعنی قَدَّرَ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السّلام کے جسم کو مٹی سے پیدا کرنا مقدر فرما دیا پھر ان سے "کُن" کہا تو وہ ہو گئے (مدارک۔ ج:۱، ص ۲۳۵)

ایک اشکال کا حل : اگر یہاں یہ اشکال وارد کیا جائے کہ اجسام اور مادیات کی تکوین بسرعت و سہولت نہیں ہوتی۔ زمین، آسمان کی پیدائش چھ دن میں ہوئی انسانی تخلیق مٹی کے ست سے شروع ہو کر ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا آخر تک نطفہ، علقہ، مضغہ، عظام، لحم کے مراحل سے گزرتی ہوئی نو، دس ماہ کی مُدت میں مکمل ہوتی ہے۔ تمام حیوانات، نباتات کا یہی حال ہے کہ عرصہ دراز میں یہ سب اشیاء معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ تدریج و تاخیر بظاہر "كُنْ فَيَكُوْنُ" کے خلاف ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ مشیّت الٰہیّہ کے مُطابق اشیا کا وجود میں آنا "کن فیکون" کے معنی ہیں لہٰذا جہاں مشیت الٰہیّہ کا تعلق تدریج و تاخیر سے ہو وہاں تدریج و تاخیر ہی "کُن فیکون" کے معنی ہوں گے۔ جس درجہ اور

جس لمحہ میں کسی چیز کے وجود میں آنے سے مشیت الٰہیہ کا تعلق ہو۔ اگر اس سے ذرا پہلے یا بعد وہ چیز وجود میں آئے تو مشیت الٰہیہ کے خلاف ہوگا۔ اور یقیناً یہ "کن فیکون" کے منافی قرار پائے گا۔ لہٰذا اسے "کُن فیکون" کے خلاف سمجھنا درست نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں یہاں اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھ لیا جائے کہ تاخیر و تدریج کا ہر مرحلہ بیشمار تکوینات کا نتیجہ ہے۔ غور فرمائیے اگر آپ چراغ میں سرِ شام تیل ڈال کر اُسے روشن کر دیں اور اُس کی لو کو بغور دیکھتے رہیں۔ وہ آپ کو بالکل متصل ایک حال پر نظر آتی رہے گی جب چراغ بجھنے لگے تو آپ دیکھیں گے کہ تیل کا آخری قطرہ ختم ہوتے ہی چراغ گل ہو جائے گا دراصل یہ اس بات کا مشاہدہ ہے کہ تیل کا ہر قطرہ جو ہزارہا اجزاء پر مشتمل ہے نہایت سُرعت کے ساتھ چراغ کی لَو کی صُورت میں آپ کے سامنے موجود ہے۔ جسے دیکھ کر عارف بے ساختہ بول اٹھتا ہے۔

؎ کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

پس سمجھ لیجئے کہ اسی طرح تدریجی اشیاء کا وجود بھی لاتعداد تکوینات پر مشتمل ہے یہ تدریجی نظام بے شمار حکمتوں پر مبنی ہے۔ جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں مختصراً اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ اگر عالم مادیات میں یہ تدریجی نظام نہ ہوتا تو اسباب مادیہ بیکار ہو کر رہ جاتے۔ حالانکہ ہمارے رب نے کوئی چیز بیکار نہیں بنائی۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ
لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ
قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ
قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اور (مشرک) جاہل بولے اللہ (خود) ہم سے کیوں نہیں کلام کرتا یا (کیوں نہیں) آتی ہمارے پاس کوئی نشانی؟ اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے (بھی) انہی جیسی بات کہی ان (سب) کے دل ایک جیسے ہو گئے بے شک یقین کرنے والوں کے لئے ہم نے نشانیاں ظاہر فرما دیں۔ ۱۰۵

---

۱۰۵ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ والآیۃ: قتادہ نے کہا اَلَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ سے مراد مشرکین قریش ہیں کیونکہ آسمانی تعلیمات اور کتب منزلہ میں سے کسی کتاب کا انہیں کچھ علم نہ تھا نہ وہ کسی آسمانی کتاب کو مانتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہاں یہود مراد ہیں مجاہد نے کہا کہ نصاریٰ مراد ہیں۔ مشرکین قریش ہوں یا یہود و نصاریٰ محض عناد کی وجہ سے کہتے تھے کہ رسول بھیجنے کی کیا ضرورت ہے جو کچھ اسے کہنا ہے بلاواسطہ ہم سے کہہ دے یا یہی بتا دے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم میرے رسول ہیں یا ان کے صدقِ نبوت کی کوئی نشانی ہمارے پاس آجائے۔ وہ توحید و رسالت کے منکر تھے۔ سُنّت الٰہیہ اور حکمت ایزدی سے ان کو کوئی تعلق نہ تھا۔ ان سے پہلے لوگ بھی ایسے ہی تھے اس طرح دونوں نے ایک جیسی بات کہی یہ سب معاند ہیں ان میں سے کوئی بھی طالبِ یقین نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو طالبِ یقین ہو۔ اور اس میں شک نہیں کہ اگر کوئی شخص یہ طے کرلے کہ میں کبھی نہ مانوں گا اس کے آگے آپ کیسی ہی قطعی یقینی روشن دلیلیں رکھیں وہ نہ مانے گا۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا

تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾

(اے حبیب) یقیناً ہم نے آپ کو حق کے ساتھ خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا ہوا بھیجا

۱۰ اور دوزخیوں کے بارے میں آپ سے کوئی سوال نہ کیا جائے گا۔ ۱۰۶

۱۰۶ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا : آپ کا بشیر و نذیر ہونا حق ہے۔ اب اگر کوئی از راہِ عناد منکر ہو کر جہنمی ہو جائے تو آپ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔

وَلَنْ تَرْضٰى

عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾

اور یہود و نصاریٰ آپ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک آپ ان کے دین کی پیروی نہ کریں۔ فرما دیجئے بے شک اللہ کی ہدایت ہی (سیدھے راستہ کی) ہدایت ہے اور (اے مخاطب) اس کے بعد کہ تیرے پاس علم آچکا اگر تُو نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو تجھے اللہ (کی گرفت) سے بچانے کے لئے نہ کوئی دوست ہو گا اور نہ مددگار۔ ۱۲۰

شانِ نزول۔ یہود و نصاریٰ اچھی طرح جان گئے تھے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام وہی نبی برحق ہیں جن کی بعثت کی تو بید صحائف میں سنائی گئی ہے۔ لیکن اُن کی توقعات کے برعکس سرکار کی ولادت باسعادت بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسمٰعیل (قریش) میں ہوئی اور مزید

یہ کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قبلہ بیت المقدس سے تبدیل ہو کر حرم مکہ مقرر ہوا تو انہوں نے حسد اور تعصب کی وجہ سے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم اس نبی پر قطعاً ایمان نہیں لائیں گے۔ بلکہ ان کو اپنے مذہب کی طرف پھیریں گے۔ اور سرکار سے معجزات طلب کرنے لگے۔ یہ تلاشِ حق کی نیت سے نہیں بلکہ بغض، عناد اور عاجز کرنے کی غرض سے تھا (خازن، ج:۱) اس کا ذکر قرآن پاک میں متعدد مقامات پر ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل آیت ۹۰ تا ۹۱ ملاحظہ ہو۔ "اور انہوں نے کہا ہم آپ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔ یہاں تک کہ آپ ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ جاری کر دیں یا آپ کے لئے کوئی باغ ہو کھجوروں کا اور انگوروں کا پھر آپ اس کے درمیان بہتی ہوئی نہریں جاری کریں"۔ دراصل یہ ایمان نہ لانے کے بہانے تھے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ارشاد فرمایا (اے حبیب) اگر آپ اہلِ کتاب کے پاس تمام معجزات لے آئیں پھر بھی وہ آپ کے قبلہ کی پیروی نہ کریں گے"۔

نیز سورۂ اعراف میں ارشاد ہے "اور اگر وہ سب معجزے دیکھ لیں پھر بھی ایمان نہ لائیں گے"۔ مذکورہ بالا حالات میں "وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى" الآیہ نازل ہوئی۔

زیرِ بحث آیت میں من حیث القوم یہود و نصاریٰ کے تعصب کو بیان کیا گیا ہے۔ تاہم اُن میں سے بعض حضرات جنہیں حق کی تلاش تھی وہ ایمان لے آئے جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور اُن کے بعض رفقاء۔ رہا یہ امر کہ قربِ قیامت میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد تمام اہلِ کتاب مسلمان ہو جائیں گے۔ جیسا کہ سورۂ نساء میں ہے۔ "وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ"۔ یعنی نزول مسیح علیہ السلام کے بعد اہلِ کتاب میں سے کوئی نہ ہوگا مگر وہ ضرور ضرور ایمان لائے گا عیسیٰ پر ان کے موت سے قبل۔ حالانکہ۔ "وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ

اَلْیَھُوْدُ وَلَا النَّصَارٰی الایہ: "میں یہود و نصاریٰ کے ایمان کی نفی کی گئی ہے؟ اس کے بارے میں عرض ہے کہ آیت مذکورہ میں اہلِ کتاب کی ضد، کجروی، حسد اور بُغض کو بیان فرمایا گیا ہے یعنی جب تک یہ بغض و حسد اُن میں باقی رہے گا وہ قطعاً ایمان نہ لائیں گے۔ لیکن نزولِ عیسٰے علیہ السلام کے بعد جب وہ حضرت عیسٰے علیہ السلام کو شریعت محمدیہ پر عمل پیرا دیکھیں گے تو ان کے قلوب بے راہ روی کی آلائش سے پاک ہو جائیں گے اور ایمان لے آئیں گے۔ اور اسی بات کو وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ الایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَھُمْ۔ یہاں تک آپ اُن کی ملت کی پیروی کریں۔

مِلَّت: ان احکام کو کہا جاتا ہے جو پروردگار نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے اپنی کتابوں میں اور انبیاء کرام علیہم السلام کی زبان پر جاری فرمائے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کو "ملت" بھی کہہ دیتے ہیں اور اس آیت میں ملت سے شریعت و طریقہ مُراد ہے۔

اہلِ کتاب اپنے زعمِ باطل میں یہ سمجھتے تھے کہ وہ سرکارِ دو عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنی خود ساختہ شریعت و طریقہ پر لے آئیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ یہ اُمید انہیں اس وقت ہوئی جب سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا شروع فرمائی۔ (تفسیر خازن۔ ص: ۷۷، ج: ۱) چنانچہ حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَھُمْ۔ میں ان کے ارادے کا بیان فرماتے ہوئے اس کا رد "قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی" سے فرمایا۔ یعنی اے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آپ فرمادیں جس چیز کو تم ہدایت قرار دے رہے ہو وہ گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہدایت تو وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اور وہ اسلام ہے (خازن۔ ص: ۷۷، ج: ۱)

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ ۔ درحقیقت یہاں اُمتِ محمدیہ کو یہود و نصاریٰ کی پیروی اور اتباع سے روکا گیا ہے۔ اِس لئے جلیل القدر صحابہ کرام اور مفسرینِ قرآن نے فرمایا کہ بظاہر یہاں خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے لیکن مُراد اُمت کو تنبیہ کرنا ہے کیونکہ یہ بات سرکار کی عظمت کے منافی ہے کہ آپ یہود و نصاریٰ کی پیروی کریں۔ یہ خطاب اس طرح ہے جیسے رئیس القوم کو مخاطب کرکے قوم کو تنبیہ کرنا مقصود ہو (قرطبی۔ ص: ۱۶۲، ج: ۲، خازن۔ ص: ۱۷۸، ج: ۱، شیخ زادہ)

سورۂ زمر میں ارشاد فرمایا: لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ (اے مخاطب) اگر تُو نے اللہ کے ساتھ شرک کیا تو تیرے سب عمل ضائع ہو جائیں گے اور تُو ضرور نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہو جائے گا۔ اِس آیتِ کریمہ میں شرک سے اِجتناب کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے اور یہ بات واضح ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے شرک کا صدور ممکن ہی نہیں کیونکہ انبیاء کرام توحید کے علمبردار ہوتے ہیں۔ اور وہ شرک کو مٹانے کے لیے مبعوث ہوتے ہیں چہ جائیکہ وہ خُود شرک میں مُبتلا ہو جائیں۔ (تفسیر نیشاپوری، شیخ زادہ) جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ (اے حبیب، یقیناً آپ سیدھے راستے کی طرف ہدایت فرماتے ہیں"۔ نیز اُن کو رسالت و دلیعت فرمانا اس امر کی دلیل ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے کفر و شرک صادر نہ ہوگا۔ قرآن مجید میں ہے۔ "اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ۔ اللہ! اپنی رسالت رکھنے کی جگہ کو خُوب جانتا ہے"۔ خُلاصہ کلام یہ ہُوا کہ "وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ" اور "لَئِنْ اَشْرَكْتَ" جیسی دیگر آیاتِ مُبارکہ میں درحقیقت اُمت ہی کو تنبیہ ہے۔

جب یہ واضح ہو چکا کہ اگرچہ بظاہر یہاں خطاب نبی سے ہے مگر مُراد اُمت کو تنبیہ کرنا ہے۔ تو اَب "بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ" کا مفہوم یہ ہوگا۔

اے میرے محبوبؐ کی اُمّت، قرآن و سنّت اور شریعت کے آجانے کے بعد بھی اگر تُم نے اہلِ کتاب کی پیروی کی تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمہارا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ ہی کوئی مددگار۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖؕ اُولٰٓىٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ(۱۲۱)ع

جنہیں ہم نے کتاب دی وہ اُسے پڑھتے ہیں جیسے اُسے پڑھنا چاہیئے وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اس کے مُنکر ہیں تو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

شانِ نزول: بعض صحابہ نے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی اور وہاں کے بادشاہ "نجاشی" کو قرآن کے ذریعہ اسلام کا دلدادہ بنالیا۔ جب سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے مدینہ منوّرہ کی طرف ہجرت فرمائی تو یہ حضرات بھی بذریعہ کشتی سرکار کی طرف روانہ ہوئے ان ہی حضرات کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ یہ آیت کریمہ اھل سفینہ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ جو حضرت جعفر بن ابی طالب کے ساتھ حضور اکرم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تھے اُن کی تعداد چالیس تھی بتیس حبشہ کے تھے اور آٹھ شامی راہب

چونکہ سابقہ آیت میں بھی اہلِ کتاب کا ذکر ہے اس لئے "اَلْكِتٰبَ" سے مُراد تورات و انجیل ہے۔ مگر بعض مفسّرین نے قرآن مجید کا قول بھی کیا ہے۔ یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اوصافِ حمیدہ

مذکور تھے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے آپ اور آپ کے صحابہ کرام کی بعض صفات کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ "ذَالِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ" اُن کی مذکورہ صفات تورات میں ہیں "وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ" اور اُن کی مثال انجیل میں۔ الخ ۔ تو اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے تحریف کے بغیر کتاب کی تلاوت کی اور ان کے احکام کو تسلیم کرتے ہوئے ایمان لائے۔ نیز حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُن تمام صفات کے ساتھ متصف پاکر تصدیق کی جو آپ کے متعلق درج تھیں تو اُن کا ذکر "يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ" سے فرمایا۔ اور وہ لوگ جنہوں نے کتابوں میں تحریف کی ان کے پڑھنے کا حق ادا نہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق بشارتوں کو چھپایا' ان کی گمراہی اور ضلالت کا تذکرہ "وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ" سے کیا۔

حَقَّ تِلَاوَتِهِ ۔ کتاب کو بغیر تحریف کے صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اور معانی و مفاہیم سمجھ کر اُن کے احکام پر عمل کرنا حقِ تلاوت ہے۔ امام کلبی نے "يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ" کی ضمیر "ہٗ" سے سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک مُراد لی ہے۔ دریں صورت یہاں تلاوت کا مفہوم یہ ہوگا، جو اہلِ کتاب اپنے صحیفہ میں درج حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صفات کو بعینہٖ بیان کرتے ہوئے آپ کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہی ایمان والے ہیں۔ آیت مذکورہ میں محض مؤمنین کا بیان ہو تو "الکتاب" سے قرآن مجید مُراد ہوگا۔ اِس صورت میں آیت کی وضاحت اِس طرح ہے کہ مؤمنین اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت و اتباع کرتے ہوئے قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں، حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانتے ہیں۔ اور آیت کریمہ کے آخر میں مؤمنین سے تنبیہاً فرمایا جنہوں نے قرآن مجید کا انکار کیا وہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

يٰبَنِيْٓ

اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ

عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾

اے آل یعقوب یاد کرو میری وہ نعمتیں جو میں نے تم پر انعام کیں اور یہ کہ میں نے (تمہارے زمانہ کے) سب لوگوں پر تمہیں فضیلت دی۔ ۱۰۸

---

۱۰۸ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا : مضمون آیت پر اس سے پہلے ضروری امور ہم بیان کر چکے ہیں۔ قصے کا آغاز چونکہ اسی حکم سے ہوا تھا کہ وہ اللہ کی نعمتوں کو یاد کرتے رہیں اور ان کے شکر کی بجاآوری سے کبھی غافل نہ ہوں، ان کے ضائع کرنے سے بچیں کیونکہ انہی نعمتوں کے باعث وہ قیامت کی ہولناکیوں سے محفوظ رہ کر ابدی سعادت حاصل کر سکیں گے۔ قصے کے اختتام پر نتیجۂ کلام کے طور پر تذکیر نعمت کا مکرر حکم دیا گیا۔ نیز خیر خواہی کے لئے انہیں اس حقیقت کی طرف بھی متوجہ کیا گیا کہ یہ سب نعمتیں اور فضیلتیں ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ان کی نسبت کی وجہ سے ہیں لہٰذا ہر حال میں انہیں ملت ابراہیمی کو اختیار کرنا چاہیئے۔ ان کا یہ انحراف ہی سب فضیلتوں اور نعمتوں سے ان کی محرومی کا موجب ہے۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا

وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ

وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور اس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کی طرف سے کچھ بدلہ نہ دے گا اور نہ اس سے فدیہ قبول

کیا جائے گا اور نہ کسی کو (اذن الٰہی کے بغیر) کوئی شفاعت نفع دے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔ ۱۰۹ھ

۱۰۹ھ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا : دُنیا کے حکام کی عدالتوں میں روزانہ فیصلے ہوتے ہیں جن میں ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کسی دُوسرے کی طرف سے کچھ بدلہ دے دے یہاں فدیہ دیکر گلو خلاصی ممکن ہے، سفارش بھی چل سکتی ہے ایک کا دُوسرے کی مدد کرنا بھی ممکن ہے لیکن احکم الحاکمین کی عدالت کا صرف ایک ہی دن مقرر ہے جس کا نام روز قیامت ہے۔ یوم الدین اور یوم الجزاء بھی اسی کو کہتے ہیں۔ اس دن ان چاروں باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اثر انداز نہ ہو سکے گی۔ کوئی کسی کا بوجھ نہ اُٹھائے گا۔ نہ کسی جُرم کی سزا سے فدیہ دیکر جان چھڑانا ممکن ہوگا نہ اذنِ الٰہی کے بغیر کوئی سفارش قبول ہوگی نہ اللہ کے سامنے کوئی اپنا زور چلا کر کسی کی مدد کر سکے گا۔

یہود کو اس بات پر بڑا ناز تھا کہ ہم نبیوں کی اولاد ہیں۔ شفاعت وغیرہ کے ذریعہ ہماری نجات ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بتا دیا کہ میری عدالت میں ایمان کے بغیر کوئی چیز نفع نہ دے گی۔ اس لئے میری نعمتوں کا شکر ادا کرو۔ تم نے جو کفر اختیار کیا ہوا ہے اس کا انجام دائمی اور ابدی عذاب کے سوا کچھ نہیں۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور جب ابراہیم کو ان کے رب نے کئی باتوں سے آزمایا تو انہوں نے وہ (سب) پوری کر دیں، اللہ نے فرمایا بے شک میں آپ کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں (ابراہیم

نے) کہا اور میری اولاد سے (بھی) فرمایا ظالموں کو میرا عہد نہیں پہنچتا۔ ۱۲۴

---

۱۲۴ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمَاتٍ۔ الایۃ: بنی اسرائیل کی فضیلتوں اور نعمتوں کا مرکزی نقطہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی کڑی آزمائش اور اس میں ان کی عظیم الشان کامیابی کا بیان فرما کر قیامت تک کے لوگوں کا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو امام بنانے کا ذکر فرمایا اور ملتِ ابراہیمی کی اتباع کو نشانِ ہدایت قرار دیا حتیٰ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم دیا۔ "اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا" کہ آپ ملتِ ابراہیمی کی اتباع کریں۔ لہٰذا کسی کے لیے ملتِ ابراہیمی کی اتباع کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا۔ ملت ابراہیمی ہی دین اسلام ہے جس کے داعی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اب بنی اسرائیل ہوں یا کوئی دوسری قوم کسی کے لیے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر ملتِ ابراہیم کی اتباع اور نجات پانا ممکن نہیں۔ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سب خوبیوں اور کمالات کا خالق خود اللہ تعالیٰ ہے اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کمالات معلوم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کی آزمائش فرمائی بلکہ اس آزمائش کا مقصد اُن کے بالقوۃ کمالات کو بالفعل کرنا اور چھپی ہوئی خوبیوں کو لوگوں پر ظاہر کرنا تھا۔ تاکہ ان کے وہ فضائل و کمالات ان کی امامت مطلقہ پر دلیل بن جائیں۔ "كَلِمَاتٌ" سے مراد وہ کام ہیں جن کا خصوصیت کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کو مکلف بنایا گیا تھا۔ ان کے بارے میں علما کا اختلاف ہے۔ ایک قول کے مطابق وہ تیس شرائع اسلام ہیں۔ جن میں دس کا ذکر سورۂ "برأۃ" میں ہے۔ "اَلتَّآئِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ" الایۃ۔ سے لیکر آخر آیت تک۔ اور دس کا ذکر سورۂ "احزاب" میں ہے۔ "اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ" سے لیکر آخر آیت تک۔ اور دس کا ذکر سورۂ "المؤمنون" میں ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ" سے لیکر "عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ" تک۔ اور اسی طرح ان کا ذکر سورۂ "سَاَلَ سَائِلٌ"

میں بھی ہے۔ اِذَا الْمُصَلِّیْنَ سے لیکر عَلٰی صَلَاتِہِمْ یُحَافِظُوْنَ تک اور بعض نے کہا "کَلِمَاتٍ" سے امر و نہی مُراد ہے۔ مثلاً اپنے اہل و ذریت کو "وادی غیرِ ذی زَرْع" میں ٹھہرانے کا حُکم بعض کے نزدیک بیٹے کو ذبح کرنا مُراد ہے۔ بعض نے کہا اللہ تعالیٰ کے پیغامات کا پہنچانا مُراد ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں سے ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش فرمائی وہ خاص مناسکِ حج ہیں حضرت حسن بصری کا قول ہے وُہ چھ خصلتیں ہیں، ان میں سے تین یہ ہیں۔ جب اُنہوں نے ستارہ، چاند اور سُورج کو چمکتا ہُوا دیکھنے کے بعد ڈوبتا ہُوا دیکھا تو ستارہ پرست قوم سے فرمایا کہ تُم ڈوبنے والے کو رب مانتے ہو؟۔ یہ ہرگز رب نہیں ہو سکتے۔ مَیں تمہارے شرک سے بری ہُوں۔ چوتھی خصلت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نارِ نمرُود میں بلا تامّل داخل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اسے برد و سلام بنا دیا۔ پانچویں خصلت ان کی ہجرت ہے کہ حُکم الٰہی کے مطابق اپنے وطن مضافاتِ بابل کو چھوڑ کر فلسطین کی طرف ہجرت فرمائی اور اللہ تعالیٰ کے حُکم کے مطابق انہوں نے اپنی ختنہ بھی کی یہ ان کی چھٹی خصلت ہے۔ (قرطبی۔ جزو ثانی، ص: ۷، تا ۹۸) حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک دُوسری روایت میں چھ کی بجائے سات خصلتیں مروی ہیں اور وُہ ساتویں خصلت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنے بیٹے کو ذبح کرنا ہے (مظہری۔ ج ۱، ص ۱۲۲)

حضرت ابُو ہریرہ فرماتے ہیں مَیں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا حضُور ارشاد فرماتے تھے۔ پانچ چیزیں فطرت سے ہیں۔ ختنہ، مُونے زیرِ ناف صاف کرنا، لبیں تراشنا، ناخن تراشنا، بغلوں کے بال صاف کرنا۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ دس چیزیں فطرت سے ہیں۔ لبیں تراشنا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈال کر اُسے صاف کرنا، ناخن تراشنا، انگلیوں کے ظاہری حصّہ کی گانٹھوں کو دھونا، بغل کے بال صاف کرنا، مُونے زیرِ ناف صاف کرنا اور پانی سے استنجا کرنا۔ اس حدیث کے راوی حضرت مصعب فرماتے ہیں کہ مَیں

دسویں چیز بھول گیا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نکلی کرنا ہو (خازن۔ ص: ۹۷، ج: ۱) اسی حدیث کے ہم معنی حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ دس قسم کی طہارتوں سے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آزمائش فرمائی۔ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ یہ سب کام ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر فرض تھے ہمارے لئے سنت ہیں۔ تفسیر خازن میں ہے علماء نے فرمایا "فطرت" کے معنی سنت ہیں یعنی یہ سب کام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنتوں میں ہیں۔ بعض نے کہا "فطرت" سے ملت مراد ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ "فطرت" سے طریقہ مراد ہے (خازن۔ ص: ۹۷، ج: ۱) علامہ نووی نے شرح مسلم میں اسی حدیث کے تحت فرمایا کہ "فطرۃ" دین کو کہتے ہیں۔ (مسلم۔ ص: ۱۲۸، ج: ۱)

تنبیہ ضروری: "فطرۃ" کے بیان میں جو چار قول ہم نے نقل کئے ہیں وہ سب متقارب المعنیٰ ہیں ان میں تعارض سمجھنا صحیح نہیں۔ البتہ یہ بات ضرور سمجھنے کے لائق ہے کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جن کاموں سے آزمایا گیا وہ سب "فطرۃ" سے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی طبائع مقدسہ فطری امور سے مانوس رہتی ہیں بالخصوص ایسے امور جن کا تعلق کمال طہارت و نظافت سے ہو اور حسن صورت و سیرت کا ان سے گہرا تعلق ہو۔ ایسی صورت میں یہ بات بعید از فہم ہو جاتی ہے کہ سب سے پہلے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ دس کام کئے یعنی ان سے پہلے کسی نبی یا رسول نے ان کاموں میں سے کوئی کام نہیں کیا۔ نہ لبیں ترشوائیں، نہ پانی سے استنجا کیا، نہ مونے زیر ناف صاف کئے، نہ کلی کی، نہ ناک میں پانی ڈالا، نہ ناخن کٹوائے۔ ایک ادنیٰ مسلمان بھی جانتا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ظاہری و باطنی پاکیزگی سے متصف ہوتے ہیں ان کی طبیعتیں عام لوگوں کے طبائع سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں اعلیٰ درجہ کی طہارت و نظافت پائی جاتی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ان پاکیزہ خصلتوں سے محروم رہے ہوں؟ لہٰذا یوں کہنا چاہیئے کہ ہر نبی ان خصائل حمیدہ سے متصف تھا۔ اور اس نے اپنی طبیعت مقدسہ کے تقاضے کے مطابق طہارت و نظافت کے

یہ سب کام کیئے مگر ان خصائل پر عمل کرنا ان میں سے کسی پر فرض نہ تھا۔ حکمتِ ابتلاء کے لیئے ان امورِ خاصہ کی فرضیت سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ہوئی اور وہ ان فرائض پر اس خوبی کے ساتھ عمل پیرا رہے کہ آزمائش میں کامیاب ہو گئے۔ ان سے پہلے کسی نبی کی آزمائش ان امور کے ساتھ نہ ہوئی تھی یہ نہیں کہ ان سے پہلے کسی نبی کے عمل میں یہ پاکیزہ خصائل نہ پائے گئے ہوں۔ خصائلِ حمیدہ کے اعتبار سے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان سے پہلے انبیاؑ میں صرف اتنا فرق تھا کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ابتلاؑ کے بعد بطور فرض یہ کام کرتے تھے اور ان سے پہلے انبیاؑ علیہم الصلوٰۃ والسلام محض اپنی طبیعتِ مقدسہ کے تقاضے سے ان پاکیزہ کاموں کو بجالاتے تھے۔ ان کلمات "کے متعلق دیگر اقوال کے پیشِ نظر صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ان آزمائشی امور میں چند کام ایسے تھے جو ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے مخصوص تھے مثلاً ذبحِ ولد اور نارِ نمرود میں بلا تامل چلا جانا ایسے امورِ خاصہ کے بارے میں یہ کہنا درست ہے کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے کسی نبی نے یہ کام نہیں کیئے۔ طہارت اور پاکیزگی کے باقی امور جن میں ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خصوصیت کا یہ پہلو نہیں پایا جاتا اور وہ سب فطرۃ سے ہیں ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے نبیوں کا ان کاموں کو کرنا کسی دلیلِ شرعی کے خلاف نہیں اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے بطورِ احکامِ شرعیہ کسی نبی نے یہ کام نہیں کیئے۔ کیونکہ ان کی شریعتوں میں یہ احکام نازل ہی نہیں ہوئے تھے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اپنے طبعی تقاضے سے یہ کام نہ کیئے ہوں۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے"۔ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ "آپ اپنے کپڑوں کو پاک رکھیں اور بتوں کو چھوڑے رہیں"۔ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو لباس پاک رکھنے کا حکم اس لیئے دیا کہ لباس مبارک (معاذ اللہ) ناپاک ہو جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سید الطیبین والطاہرین ہیں۔ ظاہری و باطنی ہر قسم کی نجاست سے ہر وقت اور ہر حال میں پاک ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی طہارت کے تقاضے کے مطابق ابتدا ہی سے اپنے لباس مبارک کو پاک رکھتے تھے۔ اسی طرح بتقاضائے طبیعتِ مقدسہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بتوں سے نفرت فرماتے تھے۔ لباس مبارک کی طہارت اور بتوں سے نفرت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طبعی تقاضا تھا اس لئے ابتدا عمر شریف سے چالیس برس تک اپنے لباس کو پاک رکھا اور بتوں سے بھی نفرت فرماتے رہے اللہ تعالیٰ نے یہ دو آیتیں "وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ" نازل فرما کر گویا یہ فرمایا کہ اپنے لباس کو پاک رکھنا اور بتوں سے نفرت کرنا جو آپ کا طبعی تقاضا ہے ہم اسی کو حکمِ شرعی کی حیثیت دے رہے ہیں۔ اب یہ دونوں کام آپ پر فرض کر دیئے گئے۔

خلاصۃ الکلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں سے ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا اگرچہ ان کے بارے میں اقوال مختلف ہیں لیکن ان میں تعارض اور تضاد نہیں۔ جیسا کہ علامہ قرطبی نے ابو اسحٰق زجاج کا قول نقل کیا۔ وَهٰذِهِ الْاَقْوَالُ لَيْسَتْ بِمُتَنَاقِضَةٍ لِاَنَّ هٰذَا كُلَّهٗ مِمَّا ابْتَلٰى بِهٖ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَام۔" (قرطبی جز ثانی، ص ۹۸۰، ج ۱:)
یعنی یہ اقوال آپس میں متناقض نہیں کیونکہ ان سب امور کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آزمایا۔

اس عظیم آزمائش میں ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسی نمایاں کامیابی حاصل فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا۔ وَاِبْرَاهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى۔ اور ابراہیم جنہوں نے آزمائش کو پورا کر دکھایا۔ اس ابتلاءِ عظیم میں ابراہیم علیہ السلام کی شاندار کامیابی پر انہیں عظیم و جلیل انعام عطا فرمایا کہ قیامت تک لوگوں کا انہیں امام بنا دیا اور ارشاد فرمایا۔ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔

اس عظیم آزمائش میں ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسی نمایاں کامیابی حاصل

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا : امام۔ مقتدا، اور پیشوا کو کہتے ہیں۔
تفسیر کبیر میں ہے: "فَالْاِمَامُ اسْمٌ مَنْ یُّؤْتَمُّ بِهٖ" یعنی امام اس کا نام ہے جس کی اقتداء کی جائے۔ اسی آیت کے تحت امام ابنِ جریر فرماتے ہیں: "فَقَالَ اللّٰهُ یَا اِبْرَاهِیْمُ اِنِّیْ مُصَیِّرُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا یُّؤْتَمُّ بِهٖ وَیُقْتَدٰی بِهٖ" یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے ابراہیم! میں آپ کو سب لوگوں کے لئے وہ امام بناتا ہوں جس کی اتباع اور اقتداء کی جائے۔ تفسیر ابنِ کثیر میں ہے: "جَعَلَهُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اِمَامًا یُّقْتَدٰی بِهٖ وَیُحْتَذٰی حَذْوَهٗ" یعنی اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو سب لوگوں کے لئے پیشوا بنایا جنہیں مقتدا مان کر ان کے طریقے کی اتباع کی جائے۔ (ابنِ کثیر ج ۱ ص ۲۰۵)

اِس آیت میں امامت سے نبوت مُراد ہے یا دینی پیشوائی کا منصب عام

تفسیر مظہری میں ہے: "وَالْمُرَادُ بِالْاِمَامَةِ هٰهُنَا النُّبُوَّةُ اَوْ مَا هُوَ اَعَمُّ مِنْهُ اَعْنِیْ مَنْ یُّؤْتَمُّ بِهٖ وَیَجِبُ اِطَاعَتُهٗ وَلَیْسَ الْمُرَادُ بِهِ السَّلْطَنَةُ اَوِ الْاِمَامَةُ بِالْمَعْنَی الْاَخَصِّ الَّذِیْ اخْتَرَعَهُ الْاِمَامِیَّةُ وَلَیْسَ لَهٗ فِی اللُّغَةِ وَ الشَّرْعِ اَصْلٌ" یعنی امامت سے مُراد یہاں نبوت نہ ہے یا امامت کے عام معنے مُراد ہیں۔ اس کے پیشِ نظر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے ابراہیم! میں آپ کو وہ امام بناتا ہوں جس کی اقتداء کی جائے اور اس کی اطاعت واجب ہو۔ امامت سے یہاں سلطنت مُراد نہیں۔ نہ امامت کے وہ خاص معنے مُراد ہیں جو امامیہ (روافض) کی اختراع ہیں۔ لُغت و شرع میں اُن کی کوئی اصل نہیں پائی جاتی۔ انتہیٰ (جلد ۱، ص ۱۲۳)

امامیہ کے نزدیک امامت پر ایمان لانا نبوت و رسالت پر ایمان لانے کی طرح ضروری ہے بلکہ وہ امامت کو نبوت و رسالت سے بھی افضل سمجھتے ہیں۔

اس آیت یا اس جیسی دیگر آیات سے ان کا یہ دعویٰ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ

امام وہی ہے جس کی امامت منصوص من اللہ ہو۔ یہ حصر کسی دلیل سے ثابت نہیں۔ ہاں! اللہ تعالیٰ کا کسی کو امام بنانا ضرور ثابت ہے جس میں کسی مسلمان کو اختلاف نہیں۔ علاوہ ازیں اُمتِ مسلمہ کا بالاتفاق کسی کو اپنا امام مقرر کر لینا بھی درحقیقت اللہ ہی کا مقرر کرنا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اجماعِ اُمت کو بھی شرعی دلیل قرار دیا ہے اور جو کام دلیلِ شرعی کے موافق ہو وہ یقیناً رضاءِ الٰہی کے مطابق ہوتا ہے۔ لہٰذا حصر کا دعویٰ دُرست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لغت میں امام کے معنے پیشوا و مقتدا ہونے کے سوا کچھ نہیں۔ خواہ وہ پیشوائی ہدایت میں ہو یا گمراہی میں۔ اس لئے قرآن میں ہدایت اور گمراہی دونوں کے پیشواؤں کو ائمہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔ وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا۔ اور ہم نے بنی اسرائیل میں سے ایسے امام اور پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت دیتے تھے۔ اور فرمایا۔ وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ۔ اور ہم نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو نارِ جہنم کی طرف بلانے والا امام اور پیشوا بنایا۔ چونکہ امامت کے معنے صرف پیشوائی کے ہیں۔ اس لئے امامِ صلوٰۃ کو بھی امام کہا جاتا ہے کہ نمازی ارکانِ صلوٰۃ ادا کرنے میں اس کی اقتداء کرتے ہیں۔ فقہ کے پیشواؤں کو بھی امام کہا جاتا ہے۔ جیسے امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔ نیکی، تقویٰ اور ہدایت میں اتباع اور اقتداء کے لائق بزرگوں کو بھی اسی لئے امام کہا جاتا ہے کہ نیکی کے کاموں میں ان کی اقتداء کی جاتی ہے۔ سب اہلِ بیتِ اطہار اور صحابہ کبار اسی معنے میں ہمارے امام ہیں۔ امامیہ اہلِ بیتِ اطہار کو جس معنے میں امام کہتے ہیں اہلِ سُنت اس معنے میں کسی کو امام نہیں کہتے۔ بلکہ صرف تفسیر و حدیث، فقہ، شریعت، طریقت، ہدایت اور تقویٰ میں لائقِ اتباع و اقتداء سمجھ کر انہیں امام کہتے ہیں۔ اسی معنے میں مسلمانوں کی یہ دُعا قرآن کریم میں وارد ہے۔ "وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا"

یعنی اے اللہ ہمیں پاکیزگی، نیکی اور تقویٰ عطا فرما کہ ہمارے بعد آنے والے متقی ہماری اقتداء کریں اور ہم ان کے امام یعنی مقتدا ہو جائیں۔ اُمراءِ مسلمین صالحین کو امام کہنے کی بھی یہی وجہ ہے کہ لوگوں پر ان کے جائز احکام کی اتباع واجب ہے۔ اس آیت کا مفاد یہ ہے کہ اے ابراہیم ہم آپ کو تمام لوگوں کے لیے مقتداء اور پیشوا بنانے والے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو ابُوالانبیاءؑ ہونے کا منصبِ عظیم عطا فرمایا۔ بایں طور کہ ابراہیم علیہ السلام کے بعد جو نبی پیدا ہُوا وہ ان کی نسل میں پیدا ہُوا۔ عیسیٰ علیہ السلام تک نبیوں کی پیدائش بنی اسرائیل میں ہُوئی اور نبی آخرالزمان حضرت محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بنو اسمٰعیل میں پیدا ہُوئے۔ بنو اسرائیل اور بنو اسمٰعیل سب ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ آدم علیہ السلام ابُوالبشر ہُوئے۔ ان کے بعد نوح علیہ السلام آدم ثانی قرار پائے اس لیے کہ بقول جمہُور انہیں کی ذرّیت باقی رہی اور ابُوالانبیاء ہونے کی حیثیت سے ابراہیم علیہ السلام آدم ثالث قرار پائے۔ جن کے بعد ہر نبی انہیں کی نسل میں پیدا ہُوا اور انہیں کی مِلّت کی اتباع کی۔ حتیٰ کہ حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھی حکم ہُوا کہ آپ مِلّتِ ابراہیمی کی اتباع کریں۔ اِس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قیامت تک سب لوگوں کا مقتداء اور امام بنا دیا۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ابراہیم علیہ السلام، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے افضل ہیں۔ کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کو یہ شرف رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے طفیل حاصل ہُوا۔ اِسی لیے شبِ معراج بیت المقدس میں انبیاء علیہم السلام کی امامت حضرت محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمائی۔

قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ : ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لیے بھی امامت کی درخواست کی کہ میری بعض ذرّیت کو بھی امام بنا دے۔

یہاں "مِن" تبعیضیہ ہے۔ جس کے معنے ہیں بعض۔ رُوح المعانی میں ہے۔ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ فِیْ مَعْنٰی بَعْضِ ذُرِّیَّتِیْ۔" یعنی "مِنْ ذُرِّیَّتِیْ کے معنے ہیں میری بعض ذرّیت (رُوح المعانی۔ ج:۱، ص:۳۳۷) (ابو سعود حاشی۔ ج:۱، ص:۱۲۷) تفسیر کبیر میں ہے۔ قَوْلُہٗ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ یَدُلُّ عَلٰی اَنَّہٗ عَلَیْہِ السَّلَامُ طَلَبَ اَنْ یَّکُوْنَ بَعْضُ ذُرِّیَّتِہٖ اَئِمَّۃً لِلنَّاسِ"۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بعض ذُرّیت کے امام ہونے کی دُعا فرمائی (تفسیر کبیر۔ جلد:۱، ص:۱۱۷) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بعض ذُرّیت سے ان کی مُراد خاص مؤمن ہیں یا مطلقاً بعض ذُرّیت مُراد ہے۔ مؤمن ہو یا کافر؟ میں عرض کروں گا کہ "مِنْ ذُرِّیَّتِیْ" کے الفاظ میں اگرچہ اطلاق پایا جاتا ہے مگر بعض ذُرّیت سے اُن کی مُراد خاص مؤمنین یعنی غیر ظالمین ہی ہیں۔ ظالمین و کافرین ہرگز مُراد نہیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کوئی ظالم نبی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ کوئی ظالم و مُشرک دینی پیشوائی کا اہل ہے۔ پھر کیوں کر ہو سکتا ہے کہ وہ کُفّار و مُشرکین و ظالمین کے لیے نبی یا دینی پیشوا ہونے کی دُعا فرمائیں۔ یہ ایسی بدیہی بات ہے جو کسی ادنےٰ مسلمان سے بھی مخفی نہیں۔ چہ جائیکہ ابُوالانبیاء حضرتِ ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اس بات کو نہ جانتے ہوں۔

رہا یہ امر کہ اس بات کو جاننے کے باوجُود کہ کوئی ظالم نبی نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی کافر و مُشرک دینی پیشوائی کا اہل ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے مطلقاً من ذرّیتی کیوں فرمایا؟ اور مؤمن صالح ہونے کی قید کیوں نہ لگائی۔؟ — اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت وُہ اس بات کی طرف متوجہ نہ تھے کہ ان کی ذُرّیت میں ظالم و کافر بھی ہوں گے۔ اللہ تعالےٰ نے "لَا یَنَالُ عَہْدِی الظّٰلِمِیْنَ" فرما کر انہیں اس امر کی طرف متوجہ فرما دیا کہ ان کی اولاد میں ظالم بھی ہوں گے جنہیں یہ عہدِ امامت نہ پہنچے گا۔ شیخ زادہ علی البیضاوی میں ہے۔ "فَاِنْ قِیْلَ اِنَّ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کَانَ عَالِمًا بِاَنَّ مَا عُھِدَ اِلَیْہِ مِنَ الْاِمَامَۃِ لَا نَصِیْبَ لِلْکَافِرِ مِنْہُ فَکَیْفَ اَطْلَقَ الذُّرِّیَّۃَ؟۔ وَاُجِیْبَ

بِاَنَّهٗ كَانَ يَعْلَمُ ذٰلِكَ لٰكِنْ لَّا يَعْلَمُ حَالَ ذُرِّيَّتِهٖ فَبَيَّنَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنَّ فِيْهِمْ مَّنْ هٰذَا حَالُهٗ" یعنی اگر کہا جائے کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس بات کو خوب جانتے تھے کہ ان کے اس عہدِ امامت میں کافر کا کوئی حصہ نہیں۔ اس کے باوجود اُنہوں نے مؤمن کی قید لگائے بغیر مطلقاً۔ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ" کیوں فرمایا؟۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اس حقیقت کو جانتے تھے کہ کافر و ظالم اس امامت کا اہل نہیں۔ لیکن وہ اپنی ذرّیت کے حال کو نہ جانتے تھے (یعنی اس وقت وہ اس کی طرف متوجہ نہ تھے) تو اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرما دیا (یعنی ابراہیم علیہ السلام کو اس طرف متوجہ فرما دیا) کہ ان کی ذُرّیت میں ظالم بھی ہوں گے جو اس امامت کے اہل نہیں انتہیٰ (ص ۱۱۲ ج ۱)

اس عبارت میں لَا يَعْلَمُ بمعنی لَا يَلْتَفِتُ ہے۔ عدم علم بمعنی عدمِ التفات کلام عرب میں مستعمل ہے۔ آیتِ قرآنیہ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ میں بھی لَا عِلْمَ لَنَا سے عدم التفات مُراد ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ فرمانے کے بعد اُنہیں اپنی ذرّیت کا حال معلوم ہوا ہو۔ اور یہ بات ان کی شان کے خلاف نہیں مگر اولیٰ یہی ہے کہ نفیِ علم کو نفیِ التفات پر محمول کیا جائے۔ بلا امتیاز مؤمن و کافر کر اپنی اس دُعا میں شامل کرنا ابراہیم علیہ السلام کی شان کے ہرگز لائق نہیں۔ خواہ ان کی یہ دُعا نبوّت سے پہلے ہو یا بعد۔ اس لئے کہ کافر کو نبوّت و رسالت اور دینی پیشوائی کا اہل سمجھنا سوءِ اعتقاد اور جہلِ قبیح ہے۔ جس کی مذمت قرآن کی اس آیت میں فرمائی گئی۔ وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ۔ یعنی مُشرکینِ قریش نے کہا ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمیں بھی ویسا ہی نہ ملے جیسا اللہ کے رسُولوں کو ملا۔ مشرکین کا اپنے لئے نبوّت و رسالت طلب کرنا اسی جہالتِ قبیحہ اور سوءِ اعتقاد پر مبنی تھا کہ وہ کافر و مُشرک کو نبوّت و رسالت اور دینی پیشوائی کا اہل سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مذمت کے طور پر

ان کا یہ قول ذکر فرمایا۔ اور اس کا رد فرمانے کے لئے ارشاد فرمایا "اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ"۔ اللہ خوب جانتا ہے جہاں اپنی رسالت رکھے۔

ایسی جہالتِ قبیحہ کہ مؤمن کے ساتھ کافر کو بھی نبوت و رسالت اور دینی پیشوائی کا اہل سمجھ لیا جائے نہ قبل النبوۃ کسی نبی کے لائق ہے نہ بعد النبوۃ۔ لہٰذا ابراہیم علیہ السلام اس بات سے پاک ہیں کہ وہ بلا امتیاز مؤمن و کافر کو اپنی اس دُعا میں شامل کر لیں۔ معلوم ہُوا کہ اپنی بعض ذُرّیت سے ان کی مُراد غیر ظالمین ہی ہیں لیکن ان کے کلام میں اطلاق پائے جانے کی وجہ سے اُن کی یہ مُراد صراحت کے ساتھ واضح نہ تھی۔ حکمت کا تقاضا تھا کہ مُرادِ ابراہیمی واضح ہو جائے اور ظالم کے امام نہ ہونے پر نصِ صریح بھی قائم ہو جائے اِس لئے اللہ تعالیٰ نے لَا یَنَالُ عَہْدِی الظّٰلِمِیْنَ فرما کر ان کی ذُرّیت کا حال بھی بیان فرما دیا۔ جس سے اُن کی مُراد صراحتاً واضح ہو گئی اور ظالم کا نبوت و رسالت یا دینی پیشوائی کا نااہل ہونا بھی منصوصِ قطعی ہو گیا۔ اس تحقیق سے ثابت ہُوا کہ بعض لوگوں کا یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ: "حضرت خلیل اللہ نے جب ایک دُعا میں اپنی پُوری ذُرّیت کو بغیر امتیاز مؤمن و کافر کے جمع کیا تھا تو حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ارشاد آیا تھا کہ یہ دُعا مؤمنوں کے حق میں قبول ہے ظالم مُشرکوں کے حق میں قابلِ قبول نہیں۔ مؤمن و کافر اگرچہ اطلاقِ کلام میں شامل ہیں لیکن مُرادِ ابراہیمی میں کوئی کافر شامل نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے یہ دُعا اپنی بعض ذُرّیت کے خاص افراد مؤمنین صالحین کے لئے کی ہے۔ جب کوئی ظالم و مُشرک ان کی اس دُعا میں شامل ہی نہیں تو پھر یہ کہنا کہ "حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ارشاد آیا تھا کہ یہ دُعا مؤمنوں کے حق میں قبول ہے ظالم مشرکوں کے حق میں قابلِ قبول نہیں"۔ دُعائے ابراہیمی کی عظمت کے خلاف گستاخانہ جسارت نہیں تو کیا ہے؟۔

خُلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ کے ارشاد لَا یَنَالُ عَہْدِی الظّٰلِمِیْنَ کا یہ مفہوم نہیں کہ یہ

دُعا مؤمنوں کے حق میں قبول ہے ظالم مشرکوں کے حق میں قابلِ قبول نہیں"۔ کیونکہ ظالم مُشرکوں کے حق میں ابراہیم علیہ السلام نے یہ دُعا فرمائی ہی نہیں جسے ناقابلِ قبول کہا جائے۔ بلکہ اِس ارشادِ خُداوندی کے معنے یہ ہیں کہ ظالم و کافر اس امامت کا اہل نہیں۔ اِسی لیئے اجلّہ مفسّرین نے اس ارشادِ الٰہی کو اس بات کی دلیل قرار دیا کہ نبی نبوت سے پہلے بھی معصوم ہے اور نبوت کے بعد بھی۔ کیونکہ اللہ کا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔

قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ : یہاں عہد سے عہدِ امامت مُراد ہے جو "اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" میں مذکور ہے۔ اس عہدِ امامت میں تین احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ وہ صرف نبوت و رسالت ہو۔ دُوسرے امامت کا وہ منصب عام جو نبوت و رسالت اور اس کے علاوہ ہر قسم کی دینی پیشوائی کو شامل ہو۔ تیسرے نبوت و رسالت کے بغیر دینی و مذہبی پیشوائی۔ پہلی صُورت میں "ظالمین" سے غیر معصومین مُراد ہیں۔ یعنی غیر معصوم نبوت و رسالت کا اہل نہیں۔ دُوسری اور تیسری صُورت میں ظالمین سے غیر صالحین مُراد ہیں۔ یعنی غیر صالح جس طرح نبوت کا اہل نہیں اسی طرح کسی قسم کی دینی پیشوائی کا بھی اہل نہیں۔ نبوت و رسالت کے لیئے معصوم ہونا شرط ہے اور معصوم یقیناً صالح ہوتا ہے اور نبوت و رسالت کے علاوہ عام پیشوائی کے لئے فسق و فجور سے پاک ہونا ضروری ہے۔ ایسے لوگوں میں محفوظین بھی شامل ہیں اور یہ سب صالحین ہیں۔ آیتِ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ غیر معصوم۔ نبوت و رسالت کا اہل نہیں۔ اور غیر صالح فاسق و فاجر مطلقاً میرے اس عہدِ امامت کا اہل نہیں۔ خواہ وہ نبوت ہو یا ماسوائے نبوت مُسلمانوں کی پیشوائی کا کوئی منصب۔ غیر صالح فاسق و فاجر کو اپنا مقتدا۔ پیشوا اور امیر بنانا جائز نہیں۔ مُسلمانوں کی پیشوائی کا اہل صرف مؤمنِ صالح ہے جو فسق و فجور سے پاک ہو۔

وَاِذْ جَعَلْنَا

الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ
مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ
وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ
وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

اور (یاد کرو) جب ہم نے کعبہ کو لوگوں کے لئے مرکزِ اجتماع اور (مقامِ) امن بنایا اور (حکم دیا کہ) مقامِ ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالو اور ہم نے تاکید فرمائی ابراہیم اور اسمٰعیل کو کہ پاک رکھو میرے گھر کو طواف والوں اور اعتکاف والوں اور رکوع اور سجود والوں کے لئے۔ ۱۱۱

۱۱۱ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ : البیت سے خانہ کعبہ مُراد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے لوگوں کا مرجع بنایا۔ لفظ مثوبۃ کا معنی ہے جائے رجوع۔ مشرق و مغرب اور جنوب و شمال سے ہر سال لوگ حج کے لئے کعبہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ویسے بھی خانہ کعبہ عوام و خواص کے لئے زیارت گاہ ہے۔ حج کے علاوہ عمرہ و طواف کعبہ کے لئے لوگ کعبہ کی طرف رجوع کرتے ہیں ایسا کوئی وقت نہیں ہوتا جب کعبہ کے اردگرد زائرین کا ہجوم نہ ہو۔ ایسی جگہ کا مقامِ امن ہونا عقلاً بھی ضروری تھا اگر وہاں محبت و شوق سے آنے والوں کے لئے امن نہ ہو تو لوگ وہاں کیسے آئیں گے گویا خانہ کعبہ کا مرجع خلائق ہونا اس کے مقام امن ہونے کا مقتضی ہے۔ بیت اللہ اپنی ان خصوصیات کے ساتھ ملت ابراہیمی اور دین اسلام کی صداقت کا ایسا چمکتا ہوا نشان ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے لیکر اب تک دنیا اس کا مشاہدہ کر رہی ہے اور قیامت تک اس

کا مُشاہدہ اسی طرح ہوتا رہے گا۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى : مقام ابراہیم سے وہ پتھر مُراد ہے جس پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ معظمہ کی تعمیر فرمائی۔ ابراہیم علیہ السلام کے قدمین مطہرین کے نشانات اس پر ثبت ہیں۔ طوافِ کعبہ کے بعد طواف کی رکعتیں اسی مقام ابراہیم کے پیچھے پڑھی جاتی ہیں۔ اس میں بھی اتباعِ ملتِ ابراہیمی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدمین مطہرین کے نشانات کو وہ عظمت عطا فرمائی کہ قیامت تک طواف کعبہ کرنے والوں کو حکم دیا کہ مقام ابراہیم کے پیچھے (دو رکعت) نماز پڑھو۔ سات مرتبہ پُورا طواف کعبہ کرنے کے بعد طواف کی دو رکعتیں مسجد حرام میں پڑھنا واجب ہیں لیکن مستحب یہ ہے کہ انہیں مقامِ ابراہیم کے پیچھے پڑھا جائے۔

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ الخ : اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کو حکم دیا کہ میرے اس گھر خانہ کعبہ کو طواف اور اعتکاف کرنے والوں کے لئے ہر قسم کی ظاہری و باطنی نجاستوں سے پاک رکھیں مساجد کو ہر ناپاکی سے پاک اور صاف ستھرا رکھنے کی اصل یہی آیت کریمہ ہے کفر و شرک، ظلم و جور اور ہر قسم کی ظاہری ناپاکی اور خس و خاشاک سے مساجد کو پاک رکھنا وہ حکمِ شرعی ہے جو ابتدائے ملت ابراہیمی سے لیکر اب تک چلا آرہا ہے۔ اور اخیر زمانہ تک جاری رہے گا۔

وَاِذْ قَالَ

اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ

اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ
اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

اور (یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا اے میرے رب اس جگہ کو امن والا شہر کر دے، اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے روزی دے جو ان میں سے ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر فرمایا اور جس نے کفر کیا تو میں اُسے (بھی) تھوڑا سا فائدہ پہنچاؤں گا پھر (اُس کی موت کے بعد) میں اُسے دوزخ کے عذاب کی طرف بے بس کر دوں گا۔ اور (وہ) بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ ۱۱۲ھ

۱۱۲ھ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا : ابراہیم علیہ السلام کی یہ دُعا سورۂ ابراہیم میں بھی وارد ہے مگر یہاں سورۂ بقرہ میں "بلداً" نکرہ ہے اور سورۂ ابراہیم میں "البلد" معرفہ واقع ہُوا۔ بعض نے سمجھا کہ یہ ایک ہی دُعا ہے اِسی لئے اُنہوں نے سورۂ بقرہ اور سورۂ ابراہیم دونوں جگہ اس دُعا کا ایک ہی ترجمہ کر دیا کہ "اے میرے رب! اس شہر کو امن والا بنا دے"۔ مگر اصح یہ ہے کہ یہ ایک دُعا نہیں بلکہ دو الگ دُعائیں ہیں۔ اِسی لئے تفسیر ابنِ کثیر میں سُورۃ بقرہ کی دُعا "رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا" میں هذا سے بقعۂ زمین مُراد لیا ہے یعنی جس غیر آباد زمین میں ابراہیم علیہ السلام نے اپنے شیر خوار لختِ جگر حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ کو ٹھہرایا تھا۔ اسی موقعہ پر وہاں سے جاتے وقت اُنہوں نے دُعا کی کہ "اے میرے رب! اِس بے آب و گیاہ غیر آباد زمین کو امن والا شہر بنا دے"۔ اُس وقت وہاں بیابان کے سوا کچھ نہ تھا۔ اِسی لئے اس دُعا میں "بلداً" نکرہ واقع ہُوا ہے۔ اور سورۂ ابراہیم میں جو دُعا مذکور ہے وہ بنائے کعبہ کے بعد کی دُعا ہے جب ابراہیم علیہ السلام اپنے صاحبزادے اسمٰعیل علیہ السلام کی مدد سے

کعبہ مکرمہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے اس وقت یہ دُعا فرمائی: "رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا" یعنی اے میرے رب! اس شہر کو امن والا کر دے۔ اِسی لئے یہاں "البلد" معرف ہے۔ (ملخصاً ابن کثیر ج:۱، ص:۱۷۴) سورۂ بقرہ کی دُعا "رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا" کے تحت ابن کثیر کے علاوہ جمہور مفسرین نے بھی یہی لکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ دُعا اس وقت کی تھی جب وادیٔ غیر ذی زرع میں وہ اپنے شیر خوار لختِ جگر حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ کو ٹھہرا کر واپس جا رہے تھے۔ مختصر یہ کہ سورۂ بقرہ کی دُعا بنا کعبہ سے پہلے کی ہے اور ہذا سے مُراد وُہ غیر آباد زمین ہے جہاں کعبہ مطہرہ کی جگہ کے قریب ابراہیم علیہ السلام نے شیر خوار حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ کو ٹھہرایا تھا۔ اور سورۂ ابراہیم کی دُعا بنائے کعبہ کے بعد کی ہے جب کہ کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہو کر ابراہیم علیہ السلام نے دُعا فرمائی "رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا" یعنی اے میرے رب! اس شہر کو امن والا بنا دے۔ یہی اصح ہے۔

سوال: بعض لوگوں کے ذہن میں یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے لق و دق صحرا اور بیابان میں جہاں کانٹوں، ریت کے ٹیلوں اور خشک پہاڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا وہاں زراعت تھی نہ پھل۔ حتیٰ کہ پانی کا نام و نشان تک نہ تھا بلکہ وہاں کوئی انسان بھی نظر نہ آتا تھا جو کسی وقت مونس و غم خوار ہو سکے۔ ایسی جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُودھ پیتے بچے حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ کو لے جا کر کیوں ٹھہرایا جب کہ بیوی بچوں کا نان و نفقہ، ان کی تربیت اور حقوق کی ادائیگی عقلاً و شرعاً ضروری ہے۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت کو اس وادی میں خود نہیں ٹھہرایا بلکہ ان کا یہ ٹھہرانا صرف امرِ الٰہی سے تھا جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ہاجرہ نے حضرت ابراہیم سے پوچھا آپ ہمیں یہاں کیوں چھوڑے جا رہے ہیں "آللّٰهُ اَمَرَكَ بِهٰذَا" کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے۔؟ حضرت

ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ نعم۔ ہاں اللہ نے مجھے اس کا حکم دیا ہے۔ اس پر حضرت ہاجرہ مطمئن ہو کر بولیں۔ "اِذًا لَّا یُضَیِّعُنَا" پھر اللہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ (بخاری ج: ۱ ص: ۴۷۰) حضرت ہاجرہ نے اس بات کو سمجھ لیا کہ اللہ کا حکم دلیل ہے کہ اب ہمارے نان و نفقہ کی کفالت اور حقوق کی رعایت و حفاظت ابراہیم علیہ السلام کے ذمہ نہیں رہی بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ ہمارا کفیل و محافظ ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ جس کا کفیل و محافظ ہو جائے اسے ضائع نہیں کرتا۔ لہٰذا یقین ہے کہ وہ ہرگز ہمیں ضائع نہ فرمائے گا۔ اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ اقدام عقلاً و شرعاً قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا۔

اس واقعہ کے جو نتائج بعد کو سامنے آئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دیا جانا بے شمار حکمتوں پر مبنی تھا۔ مثلاً ملت ابراہیمی جس کی اتباع اخیر زمانے تک لوگ کریں گے اسے انسانی محاسن کی عملی، اعتقادی اور عملی بنیادوں پر استوار کرنا، امرِ الٰہی کی اطاعت، اللہ تعالیٰ کی ضمانت و کفالت پر یقینِ محکم جس کا مظاہرہ حضرت ہاجرہ نے "اِذًا لَّا یُضَیِّعُنَا" کہہ کر فرمایا۔ اسی طرح قناعت اور اللہ پر توکل، مصائب و مشکلات پر صبر و استقامت، عجائباتِ قدرت کا ظہور، زمزم کا جاری ہونا۔ غیر آباد جگہ کا شہر کی صورت اختیار کر لینا اسمٰعیل علیہ السلام کی سعادت مندی اور اپنے والد ماجد کی فرمانبرداری، پھر ان سب کے بعد حضرت اسمٰعیل کی قربانی۔ تعمیرِ کعبہ کا موجبِ برکت و ہدیٰ ہونا۔ قیامت تک پیدا ہونے والی مسلم قوم کے اجتماعی مرکز کا قیام۔ توحید الٰہی کا چمکتا ہوا نشان، ذکرِ الٰہی کی نعمت، قربانی کی یادگار، انفاق فی سبیل اللہ غربا و مساکین کے ساتھ حسنِ سلوک، اخوت و اتحادِ اسلامی کا ظہور، اقامت صلوٰۃ، حج و عمرہ کی بنیاد، اللہ کی محبت کا اظہار اور ان کے علاوہ بے شمار منافع دینی و دنیوی کا حصول جیسی عظیم حکمتیں اس واقعہ سے ظہور میں آئیں جنہیں ذہن نشین کر لینے کے بعد بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی ذریت کو وادی غیر ذی زرع میں ٹھہرانا ہرگز عقل و شرع کے خلاف نہ تھا بلکہ ان کا ایسا کرنا محکم الٰہی کی

تعمیل اور اُس کے فوائد پر مبنی تھا۔

وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ. الخ : نعمتِ رزق کے حق دار دراصل اللہ تعالیٰ کے مؤمن بندے ہی ہیں جو شکرِ نعمت بجالاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ" اے ایمان والو! ہماری پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا فرمائیں اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔ نیز فرمایا۔ "فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ" تو اس سے کھاؤ جو اللہ نے تمہیں حلال پاکیزہ رزق دیا اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔۔۔۔ ابراہیم علیہ السلام نے اسی حقیقت کے پیشِ نظر طلبِ رزق کی دعا میں اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لانے والوں کا ذکر کرتے ہوئے عرض کی۔ "وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ" یعنی اس شہر کے رہنے والوں میں اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان لانے والوں کو پھلوں سے رزق عطا فرما۔ مگر سُنّت الٰہیہ یہ ہے کہ ایمان والوں کے طفیل اللہ تعالےٰ کافروں کو بھی اپنے رزق سے دُنیا میں فائدہ پہنچاتا ہے۔ جو قلیل فائدہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا" یعنی میں اپنے رزق سے کافر کو بھی تھوڑا فائدہ پہنچاؤں گا اور وہ محض دُنیوی فائدہ ہوگا۔ اگرچہ کافروں کو ڈھیل دینے اور ان کی آزمائش کی بنا پر وہ بظاہر کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو مگر مؤمنین کے فوائد کے مقابلے میں وہ قلیل ہی ہے۔ اس لئے کہ وہ دنیوی زندگی تک محدود ہے اور مؤمنین کا رزق ان کے لئے دُنیا اور آخرت دونوں جہان میں متاعِ کثیر ہے۔

ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ : پھر میں کافر کو دوزخ کے عذاب اور بُرے ٹھکانے کی طرف پہنچا دیتا ہوں جہاں وہ اپنے کفر کے

باعث دائمی اور ابدی عذاب میں مُبتلا رہے گا۔

مخفی نہ رہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی پہلی دُعا جس میں اُنہوں نے اپنی بعض ذرّیت کے لیے اللہ تعالیٰ سے امامت طلب فرمائی تھی اِس کے الفاظ "وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ" میں اطلاق پائے جانے کی وجہ سے ان کی مُراد میں کچھ ابہام تھا جس کا ازالہ ارشادِ الٰہی "لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ" سے ہو گیا تھا۔ اس دُعاءِ طلبِ رزق میں بھی اگرچہ مؤمنین اہلِ مکہ ہی ان کی مُراد تھے لیکن مِنْ ذُرِّیَّتِیْ کی طرح اَهْلَهٗ میں بھی اطلاق پائے جانے کی وجہ سے ان کی مُراد کچھ غیر واضح تھی۔ سابق ارشادِ الٰہی لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ کے پیشِ نظر ابراہیم علیہ السلام نے اس دُوسری دُعا میں اَهْلَهٗ سے بدل البعض کے طور پر مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ کا اضافہ کر کے اپنی مُراد کو واضح فرما دیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اس دُعاءِ طلبِ رزق کو مؤمنین سے کیوں خاص فرمایا؟۔ کیا وُہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ اللہ تعالےٰ کافروں کو بھی رزق دیتا ہے؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام یقیناً جانتے تھے کہ کافروں کا رازق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ نظامِ ربوبیت ان کے سامنے تھا۔ وُہ دیکھ رہے تھے کہ مؤمن و کافر سب کو رزق مِل رہا ہے اور رزق دینے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ ایسی بدیہی بات جو کسی سے بھی مخفی نہ ہو ابراہیم علیہ السلام کیوں کر اس سے بے خبر ہو سکتے تھے۔ بلا امتیاز ہر مؤمن و کافر کو رزق دینا سنتِ الٰہیہ ہے لیکن اس کے باوجود انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان یہی ہے کہ وہ صرف مؤمن کے لئے رزق کی دُعا کریں۔ کسی نبی نے کسی کافر کے لئے رزق کی دُعا نہیں کی۔ بحرِ محیط میں ہے۔ دَعَا لِلْمُؤْمِنِیْنَ بِالْاَمْنِ وَالْخِصْبِ لِاَنَّ الْکَافِرَ لَا یُدْعٰی لَهٗ بِذٰلِكَ اَلَا تَرٰی اَنَّ قُرَیْشًا لَمَّا طَغَتْ دَعَا عَلَیْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْاَتَكَ عَلٰی مُضَرَ وَاجْعَلْهَا

عَلَيْهِمْ سِنِيْنَ كَسِنِيْ يُوْسُفَ۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے مؤمنین اہلِ مکہ کے لئے امن اور فراخیٔ رزق کی دُعا کی۔ مؤمن کی تخصیص اِس لئے فرمائی کہ کافر کے لئے امن اور فراخیٔ رزق کی دُعا نہیں کی جاتی۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ مُشرکین اور کفارِ قریش نے جب حد سے زیادہ سرکشی اِختیار کی تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ان پر یہ دعاءِ ضرر فرمائی کہ اے اللہ قبیلۂ مضر پر اپنی گرفت کو سخت کر دے۔ اور اسے یُوسف علیہ السلام کے زمانے کی قحط سالی کی طرح شدید قحط سالی کی صُورت میں ان پر مُسلّط فرما دے (بحرِ مُحیط ص: ۳۸۳، جلد ۱)

رہا یہ امر کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ "وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيْلًا"۔ یعنی جو کُفر کرے میں اسے بھی تھوڑا سا فائدہ پہنچاؤں گا۔ یہ ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کے خلاف نہیں۔ کیُونکہ ابراہیم علیہ السلام نے مؤمنوں کے لئے رزق کی دُعا فرمائی تھی کافروں کو رزق نہ دینے کی دُعا نہیں فرمائی۔ ابراہیم علیہ السلام کی شان کے لائق یہی بات تھی کہ وُہ صِرف مُؤمنوں کے لئے رزق کی دُعا کریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وُہ مُؤمن و کافر سب کا رازق ہے۔ فرق صِرف اتنا ہے کہ مؤمن کا رزق دُنیا و آخرت دونوں جہان میں اس کے لئے نفعِ کثیر کا مُوجب ہے اور کافر کا رزق صِرف دُنیا میں اسے تھوڑا سا نفع دیتا ہے۔ آخرت میں اس کے لئے اس کا کچھ نفع نہیں بلکہ نفع کی بجائے وُہ اس کے لئے عذابِ نار کا موجب ہے۔ اِس لئے کہ اس رزق پر نہ اس نے اللہ کا شُکر ادا کیا نہ اللہ کی رضا کے مطابق اسے خرچ کیا۔ لہٰذا کافر کو نفعِ قلیل کے سوا اس کے رزق سے کچھ حاصل نہ ہُوا۔

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ
وَإِسْمٰعِيْلُ ۚ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۚ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ

اور (یاد کیجئے) جب اُٹھاتے تھے ابراہیم (خانۂ) کعبہ کی بنیادیں اور اسمٰعیل (بھی یہ کہتے ہوئے کہ) اے ہمارے ربّ ہم سے قبول فرما بے شک تُو ہی بہت سُننے والا خُوب جاننے والا ہے۔ ۱۱۳

۱۱۳ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؛ قَوَاعِدُ قَاعِدَةٌ کی جمع ہے۔ جمہور اہلِ لغت نے قاعدہ کا ترجمہ اساس اور بُنیاد کے الفاظ سے کیا ہے۔ کسائی نے کہا۔ اَلْقَاعِدَةُ = اَلْجِدَارُ قاعدہ دیوار کو کہتے ہیں۔ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر فرمائی اور اسمٰعیل علیہ السلام ان کے ساتھ اس خدمت میں شریک رہے اتنی بات قطعی ہے جس میں کسی تردّد کی گنجائش نہیں۔ قُرآنِ مجید کی عبارت النص میں یہی مضمون وارد ہے۔ رہے باقی اُمور کہ بیت اللہ شریف کی تعمیر سب سے پہلے کس نے کی یا بناءِ کعبہ کتنی مرتبہ واقع ہُوئی، ابراہیم علیہ السلام نے تعمیرِ کعبہ کی بُنیاد کب اور کن حالات میں کی ملائکہ اور آدم علیہ السلام کا تعمیرِ کعبہ، اس کا طواف حضرت آدم علیہ السلام کا حج اور حج کے لئے ہند سے کعبۂ مکرمہ تک آنا اور جانا وغیرہ ایسے اُمور ہیں جن کے متعلق مفسّرین نے بکثرت روایات اور قصص ارقام فرمائے۔ مطولات میں وُہ سب مندرج ہیں لیکن محققین نے صرف اسی بات پر اعتماد کیا ہے جو کتاب و سُنّت سے ثابت ہے۔

علّامہ ابُوحیان نے بحرِ محیط میں اس موضُوع پر مفصّل کلام کرتے ہُوئے فرمایا۔ وَطَوَّلُوْا فِيْ ذٰلِكَ بِاَشْيَاءَ لَمْ يَتَضَمَّنْهَا الْقُرْاٰنُ وَلَا الْحَدِيْثُ الصَّحِيْحُ وَبَعْضُهَا يُنَاقِضُ بَعْضًا۔ یعنی مفسّرین نے اس میں ایسے طویل قصّے بیان کئے ہیں جو قُرآنِ مجید میں نہیں ہیں۔ کسی صحیح حدیث میں بھی وہ وارد نہیں ہُوئے۔ اِن میں بعض روایات ایسی بھی ہیں

جن میں تناقض پایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے فرمایا۔ مفسرین اپنی عادت کے مطابق وہ تمام روایات اپنی تصانیف میں درج کر دیا کرتے ہیں جو انہیں پہنچی ہوں مگر اعتماد اسی چیز پر کیا جا سکتا ہے جو کتاب و سنت میں وارد ہو۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں۔ وَلَا يَنْبَغِيْ اَنْ يُعْتَمَدَ اِلَّا عَلٰى مَا صَحَّ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ " یعنی قرآن اور صحیح حدیث کے سوا کسی دوسری چیز پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ (تفسیر البحر المحیط۔ جلد اوّل۔ ص: ۳۸۷۔ طبع ریاض)

تاریخ بناءِ کعبہ: علامہ قسطلانی نے شرح بخاری میں فرمایا۔ بناءِ کعبہ دس مرتبہ واقع ہوئی۔ ۱۔ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے فرشتوں نے کعبہ بنایا۔ ۲۔ پھر آدم علیہ السلام نے بناءِ کعبہ فرمائی۔ ۳۔ ان کے بعد ان کے بیٹوں نے کعبہ بنایا (بعض روایات میں حضرت شیث علیہ السلام کا نام وارد ہے) وہ تعمیر نوح علیہ السلام کے زمانے تک باقی رہی۔ پھر طوفان نے اس کو ختم کر دیا۔ ۴۔ پھر ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ بنایا۔ ۵۔ ان کے بعد عمالقہ نے کعبہ تعمیر کیا۔ ۶۔ پھر قبیلۂ جرہم کے الحارث بن مضاض الاصغر نے بناءِ کعبہ کی۔ ۷۔ پھر قصی بن کلاب نے خانہ کعبہ تعمیر کیا۔ ۸۔ پھر قریش نے کعبہ بنایا۔ ۹۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خانہ کعبہ کو منہدم کر کے اسے از سر نو تعمیر کیا (یہ تعمیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسبِ منشاء تھی۔ اس طرح کہ اس کے زمین سے متصل دو دروازے بنائے۔ ایک، کعبہ میں داخل ہونے کا۔ دوسرا باہر آنے کا۔ اور حجر کو۔ جسے لوگ حطیم کہتے ہیں۔ بیت اللہ شریف کی عمارت میں شامل کر دیا)۔ ۱۰۔ اس کے بعد حجاج بن یوسف ثقفی نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بناء کو بدل کر بناءِ قریش کے مطابق اسے بنا دیا۔ حجاج بن یوسف ثقفی کی بناء آج تک اسی طرح موجود ہے (ارشاد الساری لشرح صحیح البخاری للامام القسطلانی جلد ۳۔ ص: ۱۴۳، ۱۴۴۔ طبع مصر)

اکثر مفسرین نے امام قسطلانی کے مطابق دس مرتبہ بناءِ کعبہ کا ذکر کیا۔ لیکن سیر حلبی

میں ہے۔ وَالْحَقُّ اَنَّ الْکَعْبَۃَ لَمْ تُبْنَ جَمِیْعُھَا اِلَّا ثَلٰثَ مَرَّاتٍ اَلْاُوْلٰی بِنَاءُ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَالثَّانِیَۃُ بِنَاءُ قُرَیْشٍ وَکَانَ بَیْنَھُمَا اَلْفَا سَنَۃٍ وَسَبْعُ مِائَۃِ سَنَۃٍ وَّخَمْسٌ وَّسَبْعُوْنَ سَنَۃً۔ وَالثَّالِثَۃُ بِنَاءُ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ الزُّبَیْرِ وَکَانَ بَیْنَھُمَا نَحْوُ اثْنَیْنِ وَثَمَانِیْنَ سَنَۃً۔ وَاَمَّا بِنَاءُ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَبِنَاءُ اٰدَمَ وَبِنَاءُ بَنِیْہِ فَلَمْ یَصِحَّ وَاَمَّا بِنَاءُ جُرْھُمٍ وَالْعَمَالِقَۃِ وَقُصَیٍّ فَاِنَّمَا کَانَ تَرْمِیْمًا وَلَمْ تُبْنَ بَعْدَ ھَدْمِھَا جَمِیْعًا اِلَّا مَرَّتَیْنِ مَرَّۃً زَمَنَ قُرَیْشٍ وَمَرَّۃً زَمَنَ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ الزُّبَیْرِ۔ انتہٰی۔ یعنی حق یہ ہے کہ پُورا کعبہ صرف تین مرتبہ تعمیر ہُوا۔ پہلی مرتبہ ابراہیم علیہ السلام نے بنایا۔ دُوسری مرتبہ قریش نے۔ دونوں کے درمیان دو ہزار سات سو پچہتر سال کا فاصلہ تھا۔ اور تیسری مرتبہ ہدم کعبہ کے بعد کعبہ کی پُوری تعمیر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمائی۔ ان دونوں کے درمیان بیاسی برس کا فاصلہ تھا۔ اور فرشتوں کی بناءِ کعبہ اور آدم علیہ السلام اور ان کے بیٹوں کی تعمیر کعبہ کا صحیح ہونا پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا۔ اور قبیلہ جرہم و عمالقہ اور قصی بن کلاب کی بنا پُورے کعبہ کی نہ تھی بلکہ وہ جُزوی تعمیر اور ترمیم تھی۔ ہدم کے بعد پُورے کعبہ کی تعمیر صرف دو مرتبہ ہُوئی۔ ایک مرتبہ قریش کے زمانے میں اور دُوسری دفعہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے دُور میں۔ انتہٰی۔ ہمارے نزدیک بھی یہی اصح اور لائقِ اعتماد ہے۔

قریش کی بناءِ کعبہ میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم شریک تھے

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قریش نے جب کعبہ تعمیر کیا تو حضُور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضُور کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کعبہ کے لئے پتھر اُٹھا کر لا رہے تھے کہ حضرت عباس نے حضُور علیہ السلام سے کہا کہ آپ اپنی ازار شریف اپنے مُبارک کاندھے پر رکھ لیجئے۔ پتھر کی تکلیف سے آپ محفُوظ رہیں گے۔ آپ نے

حضرت عباس کا کہنا مان لیا۔ اسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے ہوش ہو گئے۔ اور آپ کی مبارک آنکھیں آسمان کی طرف کھلی رہ گئیں۔ افاقہ ہوتے ہی حضور نے فرمایا میری ازار۔ میری ازار۔ حضرت عباس نے فوراً ازار مبارک حضور پر باندھ دی۔ (بخاری۔ ص: ۵۲، ۲۱۵، ۵۴۰۔ ج: ۱)۔

سوال: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ازار کھول کر کاندھے پر رکھ لینا شرم وحیا کے خلاف اور معیوب و قبیح ہے۔ حضرت عباس نے ایسا کام کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیوں کہا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا کہنا کیسے مان لیا جب کہ حضور تو کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ حیادار تھے اور معیوب و قبیح امور سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طبعاً نفرت تھی۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی نوعمری کے زمانہ میں پیش آیا جب اس عمر میں ایسا کرنا حیا کے خلاف سمجھا جاتا تھا نہ کسی کی نظر میں معیوب و قبیح تھا۔ اور بفحوائے "عم الرجل صنو ابیہ" حضرت عباس حضور کے چچا ہونے کی وجہ سے بمنزلہ شفیق باپ کے تھے۔ جن کا کہنا نہ ماننا سعادت مندی کے خلاف تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طبعاً سعادت مند تھے اس لئے ان کا کہنا مان لیا لیکن ان کے کہنے پر عمل کرتے ہی حضور بے ہوش ہو گئے اور حضور کی مبارک آنکھیں آسمان کی طرف کھلی رہ گئیں۔ افاقہ ہوتے ہی فرمایا "میری ازار، میری ازار" حضرت عباس نے فوراً ازار مبارک باندھ دی۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمال حیا کا ظہور تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبعی سعادتمندی اور فطری حیا کی دلیل ہے کسی عیب یا قبح سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کا تعین: قریش مکہ کی بنا کعبہ کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کے تعین کے متعلق امہات کتب حدیثیہ

میں سے کسی کتاب میں ایسی کوئی حدیث وارد نہیں ہوئی جس میں اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کا تعین صراحۃً مذکور ہو۔ البتہ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم اور حضرت ابو الطفیل رضی اللہ عنہ، اور ان کے علاوہ بعض تابعین کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نیز محدثین و مفسرین کرام کے اقوال بعض کتب حدیث و تفسیر اور شروح حدیث میں پائے جاتے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ حضرت ابو الطفیل رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ بنیان کعبہ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نزول وحی کے درمیان پانچ سال کا عرصہ تھا۔ اس قول کے مطابق بناء کعبہ کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف پینتیس ۳۵ سال قرار پائی۔ قرطبی نے کہا اس قول کو عبد الرزاق نے بروایت معمر عن عبد اللہ بن عثمان حضرت ابو الطفیل سے روایت کیا۔ محمد بن اسحٰق اور محمد بن جبیر بن مطعم سے بھی یہ قول مروی ہے۔

۲۔ ابن اسحٰق وغیرہ نے کہا کہ قریش کی بناء کعبہ کے وقت حضور کی عمر شریف پچیس سال تھی۔ یہ قول مجاہد، عروہ بن زبیر اور محمد بن جبیر بن مطعم وغیرہم سے بھی منقول ہے۔

۳۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نوجوان تھے۔

۴۔ ابن بطال اور ابن تین کا قول ہے کہ بناء کعبہ کے وقت حضور کی عمر شریف پندرہ سال تھی۔

۵۔ امام زہری نے فرمایا بناء کعبہ کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم لڑکے تھے ابھی جوان نہ ہوئے تھے۔ ازرقی نے بھی یہ قول نقل کیا کہ بناء کعبہ کے وقت حضور لڑکے تھے جوان نہ ہوئے تھے۔

۶۔ امام زہری نے یہ بھی فرمایا کہ قریش کی بناء کعبہ کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم حد بلوغ کو نہ پہونچے تھے۔

یہ مختلف اقوال ہمارے سامنے ہیں اِن میں ایک ہی قائل کے دو مختلف قول بھی موجود ہیں۔ ہمارے نزدیک ان اقوال میں امام زہری کا یہ قول سب سے زیادہ پسندیدہ اور راجح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت حد بلوغ کو نہ پہنچے تھے یعنی نوعمر تھے۔ امام زہری کا یہ قول اس لئے راجح ہے کہ اس کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی عیب اور قبح کی نسبت نہیں ہوئی نہ حضور کے کمالِ حیا کی نفی لازم آتی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ علامہ عینی نے بھی اسی قول کے تحت حسب ذیل کلام کر کے ہمارے موقف کی تائید فرمائی۔ وہ فرماتے ہیں: "ذکر مَا فِیْہِ مِنَ الْفَوَائِدِ مِنْهَا اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کَانَ فِیْ صِغَرِہٖ مَحْمِیًّا عَنِ الْقَبَائِحِ وَاَخْلَاقِ الْجَاهِلِیَّةِ مُنَزَّهًا عَنِ الرَّذَائِلِ وَالْمَعَائِبِ قَبْلَ النُّبُوَّةِ وَبَعْدَهَا۔ وَمِنْهَا اَنَّهٗ کَانَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ جَبَلَهُ اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی اَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ وَالْحَیَاءِ الْکَامِلِ حَتّٰی کَانَ اَشَدَّ حَیَاءً مِّنَ الْعَذْرَاءِ فِیْ خِدْرِهَا فَلِذٰلِکَ غُشِیَ عَلَیْہِ وَمَارُئِیَ بَعْدَ ذٰلِکَ عُرْیَانًا۔ اھ (عمدۃ القاری۔ جلد: ۴، ص: ۲۷۰۔ طبع مصر) یعنی اس حدیث میں حسب ذیل فوائد پائے جاتے ہیں۔ ۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بچپن میں سب قباحتوں اور اخلاقِ جاہلیت سے محفوظ تھے۔ نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد تمام رذائل اور معائب سے منزہ تھے۔ ۲۔ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو احسن اخلاق اور حیاءِ کامل پر مخلوق فرمایا تھا۔ حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کنواری لڑکیوں سے زیادہ حیادار تھے جو اپنے پردے کے اندر چھپی ہوئی ہوں۔ اس لئے چادر شریف اُتارتے ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی عریاں نہ دیکھے گئے (عمدۃ القاری۔ جلد: ۴۔ ص: ۲۷۰۔ طبع منیریہ مصر) اس وقت بھی حضور کو عریاں دیکھے جانے کا یہ مفہوم نہیں کہ حضور

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شرمگاہ مُبارک پر کسی کی نظر پڑی ہو کیوں کہ عُریاں اسے کہتے ہیں جس کے بدن پر کپڑا نہ ہو۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے۔ حضُور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا۔ اِنَّکُمْ مَحْشُوْرُوْنَ حُفَاۃً عُرَاۃً غُرْلاً۔ یعنی قیامت کے دِن تمہارا حشر اس حال میں ہوگا کہ تمہارے پاؤں میں جُوتا ہوگا نہ بدن پر کپڑا۔ نہ تُم ختنہ شدہ ہوگے۔ حضرت عائشہ نے عرض کی "حضُور! مَرد عورتیں ایک دُوسرے کی شرمگاہ دیکھیں گے" فرمایا! "ہر ایک کو اپنی فکر ہوگی۔ کوئی کسی (کی شرمگاہ) کو نہ دیکھ سکے گا۔ (بخاری۔ جلد: ۲۔ ص: ۹۶۶)۔ یہ حدیث صحیح مُسلم اور سنن نسائی میں بھی ہے۔ حاکم اور ابُوبکر بن ابی شیبہ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا۔ ثابت ہُوا کہ عَاب اور عُرْیَان اسے کہتے ہیں جس کے بدن پر کپڑا نہ ہو۔ ضروری نہیں کہ اس کی شرمگاہ پر کسی کی نظر بھی پڑے۔ لہٰذا حضُور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے عُریاں ہونے سے ہرگز لازم نہیں آتا کہ حضُور کی شرمگاہ مُبارک کو کسی نے دیکھا ہو۔

شاید کوئی کہے کہ قیامت پر دُنیا کا قیاس صحیح نہیں۔ مَیں عرض کروں گا کہ ہم نے قیامت پر دُنیا کا قیاس نہیں کیا بلکہ یہ ثابت کیا ہے کہ عُرْیَان اسے کہتے ہیں جس کے بدن پر کپڑا نہ ہو۔ اگر اس کی شرمگاہ پر کسی کی نظر نہ پڑے پھر بھی وُہ عُریاں ہے۔ جن لوگوں نے حضُور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے غیر پر حضُور کا قیاس کیا۔ وہ بتائیں کہ ان کا یہ قیاس کیُوں کر صحیح ہو سکتا ہے۔ کیا یہ حقیقت ان کے سامنے نہیں کہ ہجرت کی رات کفّار کے درمیان سے حضُور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نکلے اور وُہ حضُور کو نہ دیکھ سکے۔ غارِ ثور میں حضُور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم جلوہ فرما ہے اللہ تعالےٰ نے حضُور کو دُشمنوں کی نگاہوں سے محفُوظ رکھا۔ پھر بتائیے اگر اس موقع پر اللہ تعالےٰ نے حضُور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی عورتِ مقدّسہ کو لوگوں کی آنکھوں سے محفُوظ رکھا ہو تو اس میں کونسا استحالہ لازم آتا ہے۔ یہ حفاظت حضُور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے کمالِ حیاً

اور عظمت و کرامت پر مبنی تھی۔ حتیٰ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔
"مَارَأَیْتُ فَرْجَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَطُّ" یعنی میں نے حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک شرمگاہ کو کبھی نہیں دیکھا (شمائل ترمذی ص۲۶)
حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسی واقعہ سے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی کی ایک منقولہ روایت میں "عُرْیَانًا" کی بجائے "عَوْرَتُہٗ" وارد ہے۔ جو ہمارے نزدیک حقائق مذکورہ کی روشنی میں فہم راوی کے مطابق روایت بالمعنے پر محمول ہے۔ مختصر یہ کہ حقائق مذکورہ کے پیش نظر ہمارے نزدیک امام زہری کا قول کہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدِ بلوغ کو نہ پہنچے تھے راجح اور پسندیدہ امر ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ: مخفی نہ رہے کہ امام زہری کا یہ قول علامہ عینی نے "لَمْ یَبْلُغِ النَّبِیُّ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ الْحُلُمَ" کے الفاظ میں نقل کیا ہے۔ یعنی اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدِ بلوغ کو نہ پہنچے تھے۔ اور امام زہری کا یہی قول فتح الباری میں "لَمَّا بَلَغَ رَسُوْلُ اللّٰہِ الْحُلُمَ"۔ کے الفاظ میں منقول ہے مگر دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ کیونکہ لفظ "بَلَغَ" کبھی کسی چیز کے قریب پہونچنے کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے قرآن مجید میں ہے۔ "وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَھُنَّ فَاَمْسِکُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ"۔ یعنی تم جب عورتوں کو طلاق دو پھر وہ اپنی عدت کے قریب پہنچ جائیں تو تم انہیں اپنے عقدِ نکاح میں بھلائی کے ساتھ روک لو۔ یا نیکی کے ساتھ انہیں چھوڑ دو۔ عدت ختم ہو جانے کے بعد وہ بائنہ ہو جائیں گی۔ ایسی صورت میں انہیں روکنا جائز ہی نہ ہوگا۔ معلوم ہوا کہ یہاں بَلَغْنَ اَجَلَھُنَّ سے عدت کو پہنچنا مراد نہیں بلکہ پہنچنے کے قریب ہونا مراد ہے۔ اسی طرح امام زہری کے الفاظ "لَمَّا بَلَغَ الْحُلُمَ"۔ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حدِ بلوغ کو پہنچنا مراد نہیں بلکہ حدِ بلوغ کے قریب ہونا مراد ہے جو

ان کے الفاظ "لَمْ یَبْلُغِ الْحُلُمَ" سے صاف ظاہر ہے۔

حجرِ اسود کو نصب کرنے میں قبائلِ قریش کے اختلاف کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

امام قرطبی نے بھی قریش کی بناءِ کعبہ کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں اُنہوں نے اپنی تفسیر میں بطریقِ معمر عن الزہری ایک روایت نقل کی جس کا خُلاصہ یہ ہے کہ حجرِ اسود کے نصب کرنے میں قبائلِ قریش میں اختلاف ہُوا۔ اس اختلاف کو ختم کرنے کے لئے اُنہوں نے یہ طے کیا کہ اس راستے سے سب سے پہلے جو آنے والا ہمارے سامنے آئے ہم اسی کو اپنا حَکَم مقرر کر لیں اور سب اس کے فیصلے کو مان لیں۔ فَاطَّلَعَ عَلَیْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ وَهُوَ غُلَامٌ۔ تو سب سے پہلے اُن کے سامنے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔ اس حال میں کہ ابھی آپ لڑکے تھے جوان نہیں ہُوئے تھے۔ حضُور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دھاری دار چادر زیبِ تن فرمائے ہُوئے تھے۔ تمام قبائلِ قریش نے حضُور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا حَکَم مان لیا۔ حضُور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک چادر پر حجرِ اسود رکھوا دیا۔ پھر ہر قبیلے کے سردار سے فرمایا کہ سب مل کر یہ چادر پکڑیں پھر حضُور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجرِ اسود اُٹھا کر اس کی جگہ اسے نصب فرما دیا۔ (تفسیر القرطبی۔ جزو: ۲۔ ص: ۱۲۳ طبع)

بناءِ ابراہیمی امرِ الٰہی سے ہُوئی: اس میں شک نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کی بناءِ کعبہ ارشادِ الٰہی کے مطابق ہُوئی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ۔ اور یاد کیجئے کہ جب ابراہیم کے لئے ہم نے کعبہ بنانے کی جگہ متعین کر دی۔ (پ۱۷۔ الحج۔ آیت: ۲۶) آیت کریمہ کے ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ارشادِ الٰہی کے مُطابق کعبہ مطہرہ کی بناء فرمائی۔

آیت کریمہ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ میں ابراہیم

اور اسمٰعیل دونوں "یَرْفَعُ" کا فاعل ہیں لیکن اس کے باوجود مفعول کا فاصلہ بعض علماء کے نزدیک اس امر کو ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ اصل بانی کعبہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں اور اسمٰعیل علیہ السلام ان کے تابع اور معاون ہیں۔ ملاحظہ ہو روح المعانی جلد ۱، ص ۳۵۸ طبع دیوبند۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ : سیدنا ابراہیم و سیدنا اسمٰعیل علیہما السلام نے تعمیرِ کعبہ کے اس عملِ خیر کی قبولیت کے لئے یہ دعا کمالِ خشوع و خضوع کے ساتھ اعترافِ عبدیت کے طور پر فرمائی اور اپنے ربِ کریم کی بارگاہِ الوہیت میں عرض کی کہ اے ہمارے رب! بناءِ بیت کی یہ خدمت ہم سے قبول فرمالے۔ تو ہماری دعا کو سنتا اور ہمارے خلوصِ نیت کو خوب جانتا ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

اے ہمارے رب اور کر دے ہم دونوں کو خاص اپنے لئے (مزید) فرمانبردار اور ہماری اولاد میں سے ایک اُمت فرمانبردار خاص اپنے لئے اور بتا ہمیں ہمارے حج کے احکام اور ہم پر اپنی رحمت کے ساتھ رجوع فرما بے شک تو ہی رجوع برحمت ہونے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۱۴

---

۱۱۴ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ : یعنی اے ہمارے رب! ہمیں اپنا فرمانبردار اور احکامِ اسلام پر قائم رہنے والا بنا دے یا بالفاظِ دیگر ہمیں اپنے لئے مخلص اور موحد کر دے — اگر یہاں یہ شبہ وارد کیا جائے کہ ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام پہلے

ہی اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار اور احکامِ دین پر قائم، موحّد و مخلص تھے پھر اس دُعا کا کیا مقصد ہے؟ تو اس کا ازالہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور احکامِ اسلام کی پیروی نیز اخلاص اور توحید کے بے شمار مراتب و درجات ہیں۔ بنا بریں اُس دُعا سے ترقیٔ درجات اور زیادتِ مراتب کی طلب مقصود ہے یا ان اوصافِ حمیدہ پر ثابت قدم رہنا اس دُعا کا مقصد ہے۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ : جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے اپنی امامت کا مژدہ پاکر اپنی بعض ذُرّیت کے لئے امامت کی درخواست کی تھی، اسی طرح بنائے کعبہ کے موقع پر ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام دونوں نے اپنے لئے دُعا کرتے ہوئے بکمالِ شفقت اپنی اولاد میں سے بھی ایک اُمّتِ مسلمہ کی دُعا فرمائی۔ اِس سے اگلی آیت میں اِسی اُمّت کے ذکر پر اس دُعا کا اِختتام ہُوا ہے۔ اُسی جگہ ہم اس کی وضاحت کریں گے۔

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا : یعنی ہمارے دین کے احکام اور حج کی نشانیاں ہمیں دکھا دے! نُسک اصل میں غایتِ عبادت کو کہتے ہیں۔ پھر اس لفظ کا اِستعمال اعمالِ حج کے معنے میں عام ہو گیا۔ کیونکہ اعمالِ حج ادا کرنے میں اکثر تکلیف ہوتی ہے۔ امام بغوی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام دونوں کی دُعا کو قبول فرما لیا۔ اور جبریل علیہ السلام کو بھیج کر یومِ عرفہ میں اُنہیں مناسکِ حج دکھا دیئے۔ جب عرفات پہنچے تو جبریل علیہ السلام نے کہا، اے ابراہیم علیہ السلام! آپ نے اپنے مناسک کے احکام کو پہچان لیا؟ آپ نے فرمایا ہاں! اِسی لئے اس وقت اور اس جگہ کا نام "عرفہ" رکھ دیا گیا۔[1]

وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ : یعنی عبادات اور احکامِ حج بجا لانے میں اگر کسی قسم کی کوتاہی ہم سے سرزد ہو جائے تو ہم پر اپنی رحمت

کے ساتھ رجوع فرما۔ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے اپنی دُعا میں یہ بات تواضعاً اور کسرِ نفسی کی بناء پر کہی۔ ساتھ ہی اس میں اپنی ذُرّیت کی رہنمائی بھی مقصُود تھی۔ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ یعنی اے ربِّ کریم! جو تیری بارگاہ میں تائب ہو یقیناً تُو اس کی توبہ کو بہت قبُول فرمانے والا، اُس پر بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ ع

اے ہمارے رب اور ان میں ایک (عظمت والا) رسُول بھیج انہی میں سے کہ ان پر تیری آیتیں پڑھے اور انہیں قرآن اور حکمت سکھائے اور اُنہیں پاک کرے۔ بے شک تُو ہی بڑا غالب ہے بہت حکمت والا۔ ۱۱۵ھ

۱۱۵ھ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ : یہ اختتام ہے ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی دُعا کا۔ اُنہوں نے عرض کی۔ اے ہمارے ربّ! انہی میں سے ان میں ایک عظمت والا رسُول بھیج۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعا قبول فرمائی اور حضرت محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان میں مبعُوث فرما دیا۔ ربیع کا قول ہے کہ اس دُعا کے بعد ابراہیم علیہ السلام سے کہا گیا آپ کی دُعا قبُول ہوئی۔ وُہ رسُول آخری زمانے میں مبعوث ہوں گے (تفسیر البحر المحیط جلد: ۱، ص: ۳۹۲)۔ اس مقام پر علامہ ابُو حیان نے فرمایا۔ وَلَا خِلَافَ اَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ یعنی اس میں کسی کا اِختلاف نہیں کہ وہ رسُول حضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ (البحر المحیط۔ جلد: ۱، ص: ۳۹۲)

تفسیرِ قرطبی میں اس مقام پر حضرت خالد بن معدان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اَنَا دَعْوَةُ اَبِیْ اِبْرَاهِیْمَ وَبُشْرٰی عِیْسٰی" میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں اور عیسٰی علیہ السلام کی بشارت ہوں (قرطبی۔ جلد ۱۰ ص ۱۳۱)

اور اسی آیتِ کریمہ کے تحت تفسیر مظہری میں ہے۔ حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ میں اللہ کے نزدیک خاتم النبیین لکھا ہوا تھا اور آدم علیہ السلام اپنی مٹی کے خمیر میں گندھے ہوئے تھے۔ اب میں تمہیں اپنے اوّلِ امر کی خبر دیتا ہوں۔ میں ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور عیسٰی علیہ السلام کی بشارت اور اپنی والدہ ماجدہ کا وہ خواب ہوں جو انہوں نے میری پیدائش کے وقت دیکھا تھا میری ولادت کے موقع پر ان سے ایک ایسا نور ظاہر ہوا جس سے ان کے لئے شام کے محلات روشن ہو گئے۔ اس حدیث کو بغوی نے شرح السنۃ میں روایت کیا اور امام احمد نے یہ حدیث حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی۔ ان کی روایت سَاُخْبِرُکُمْ سے آخر حدیث تک ہے (تفسیر مظہری۔ جلد ۱، ص ۱۳۱)

یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ: وہ اُن پر تیری آیتیں تلاوت فرمائیں اور انہیں کتاب و حکمت سکھائیں تفسیر البحر المحیط میں ہے۔ وَالْاٰیٰتُ هُنَا اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ۔ یہاں آیات سے قرآن کی آیتیں مراد ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر تلاوت فرمائیں۔ اور یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ۔ کے تحت فرماتے ہیں۔ "هُوَ الْقُرْاٰنُ" یعنی کتاب سے قرآن مراد ہے۔ "وَالْمَعْنٰی اَنَّهٗ یُفْهِمُهُمْ وَیُلْقِیْ اِلَیْهِمْ مَعَانِیَهٗ" اور معنے یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں قرآن سمجھاتے ہیں اور اس کے معنے انہیں سکھاتے ہیں (تفسیر البحر المحیط۔ جلد: ۱، ص: ۳۹۲)

حکمت سے مراد شریعت اور اس کے احکام کا بیان کرنا ہے۔ قتادہ کا قول ہے۔ اَلْحِكْمَةُ اَلسُّنَّةُ وَبَیَانُ النَّبِیِّ الشَّرَائِعَ۔ یعنی حکمت سے سنت مراد ہے اور نبی علیہ

الصلوٰۃ والسلام کا احکام کو بیان فرمانا۔ مالک اور ابُورزین نے کہا حکمت فقہ فی الدین کو کہتے ہیں اور وُہ فہم جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا ہُوا نُور ہے۔ مُجاہد نے کہا حکمت فہم القرآن ہے۔ مقاتل نے کہا حکمت سے مُراد علم باعمل ہے۔ جب تک علم و عمل کو جمع نہ کرے کوئی شخص حکمت والا نہیں ہو سکتا ایک قول یہ ہے کہ حکمت سے حُکم اور مقدمات کا فیصلہ کرنا مُراد ہے۔ بعض نے کہا کہ حکمت وہ چیز ہے جو رسُول کے بتائے بغیر معلُوم نہ ہو سکے۔ ابنِ زید نے کہا ہر وُہ کلمہ حکمت ہے جس سے نصیحت حاصل ہو یا وُہ بزرگی کی طرف بُلانے والا ہو یا کسی بُرائی سے روکنے والا ہو۔ بعض نے کہا یہاں حکمت سے کتاب مُراد ہے۔ تاکید کے لئے اس کا ذکر مکرر فرمایا۔ ابُوجعفر مُحمد بن یعقُوب نے کہا ہر دُرست قول جس کا نتیجہ صحیح فعل ہو حکمت ہے۔ یحییٰ بن معاذ نے کہا حکمت اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے جسے اللہ تعالیٰ قلُوب عارفین کی طرف بھیجتا ہے جو دُنیا کا ہیجان ان سے دُور کر دیتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ہر چیز کو اُس کی جگہ پر رکھنا حکمت ہے اور کہا گیا کہ ہر واجب العمل قول حکمت ہے۔ حکمت کے بارے میں یہ سب اقوال قریب المعنیٰ ہیں۔ دو قولوں میں یہ سب اقوال جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک اَلْقُرْآن ہے اور دُوسرا اَلسُّنَّۃ۔ کیوں کہ سب کا منبع یہی دو چیزیں ہیں۔ حکمت کی تفسیر میں ایک قول یہ ہے کہ حکمت وُہ سُنّت ہے جو کتاب میں (صراحتاً مذکور) نہ ہو۔

یُزَكِّيهِمْ : ان کو جسمانی، قلبی اور ظاہری باطنی پاکیزگی کے ساتھ پاک اور سُتھرا کر دیں۔ کفر و شرک اور گُناہوں سے انہیں پاکیزگی نصیب ہو جائے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کے مالوں سے زکوٰۃ لیں۔ ابن کیسان نے کہا کہ قیامت کے دن ان کی عدالت کی گواہی دیں۔

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ : بے شک تُو بڑا غالب بڑی حکمت والا ہے۔ عزیز غالب کو کہتے ہیں۔ یا ایسے طاقتور کو جس کا مقابلہ نہ کیا جا سکے۔

ابنِ کیسان نے کہا جسے کوئی شے عاجز نہ کر سکے وُہ عزیز ہے۔ ابنِ عباس نے فرمایا جس کی کوئی مثل نہ ہو وُہ عزیز ہے۔ کلبی نے کہا بدلہ لینے والے یا قوت والے کو عزیز کہتے ہیں۔ حکیم سے مُراد ذوالحکمۃ البالغہ ہے۔ یعنی جس کی حکمت منتہائے کمال کو پہنچی ہُوئی ہو۔

اپنی ذُرّیت میں ایک اُمّت مُسلمہ پیدا ہونے کی دُعا

ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام نے اپنی ذرّیت میں سے ایک اُمّتِ مُسلمہ کی دُعا فرمائی اور اسی اُمّت میں سے ایک رسُول کے مبعوث ہونے کی دُعا کی۔ جس کا مفاد یہ ہے کہ وُہ اُمّتِ مُسلمہ اور رسُول دونوں ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کی ذُرّیت سے ہوں۔ اور اس اُمّتِ مُسلمہ کا مصداق وہی جماعت ہے جو حضراتِ خُلفاء راشدین اور مومنینِ قریش پر مشتمل ہے۔ جو سب ذرّیت ابراہیمی میں شامل ہیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم انہیں میں سے مبعوث ہُوئے اور ان پر قُرآن کی آیات تلاوت فرمائیں۔ کتاب و حکمت کی اُنہیں تعلیم دی اور اُنہیں پاک فرمایا۔ جس طرح وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ۔ کا مصداق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں۔ اِسی طرح وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ کا مصداق یہی حضرات ہیں۔ اگر ان حضرات کو معاذ اللہ منافق کہہ کر ان کے مُسلمان ہونے کی نفی کر دی جائے تو ابراہیم علیہ السلام کی یہ دُعا مقبول اور مستجاب قرار نہیں پاسکتی۔

حجیت حدیث کا ثبوت

ابراہیم علیہ السلام کی اس دُعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تین منصب بیان ہُوئے ہیں۔ ۱۔ تلاوتِ آیات۔ ۲۔ تعلیم کتاب و حکمت۔ ۳۔ تزکیۂ نفوس۔ قُرآن پڑھنا تلاوتِ آیات ہے۔ ان کے مطالب و معانی کا بیان فرمانا تعلیمِ کتاب و حکمت ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جو قُرآن نازل ہوتا تھا حضُور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

ہے۔ رغبت کے صلہ میں اِلٰی آئے تو اس کے معنے ہیں چاہنا اور ارادہ کرنا اور عَنْ کے ساتھ اس کا صِلہ آئے تو اس کے معنی ہیں ترک اور روگردانی۔ لفظ مِلَّۃ کی اصل اَمْلَلْتُ الْکِتَابَ ہے۔ چونکہ احکام شرع بھی لکھوائے جاتے ہیں۔ اِس لئے انہیں لفظ مِلّت سے تعبیر کیا گیا۔ "مِلّت" "دین" کی طرح ہے اور اصل میں وُہ اُن احکام کا نام ہے جنہیں اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کے لئے انبیاء علیہم السّلام کی مقدس زبانوں پر مشروع فرمایا۔ تاکہ وُہ ان کے ذریعے سے قربِ الٰہی حاصل کر سکیں۔ جن چیزوں کو مشروع فرمایا ان کے اِعتبار سے ان احکام کو "مِلّت" کہا جاتا ہے۔ اور ان احکام مشروعہ کو قائم کرنے والے کے اعتبار سے ان کا نام "دین" ہے کیونکہ دین کے معنیٰ ہیں "طاعت"۔ اللہ کے احکام کو قائم کرنا اللہ کی طاعت ہے۔ لفظِ دین اور لفظِ مِلّت کے استعمال میں فرق ہے وُہ یہ کہ لفظِ دین اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہوتا ہے جیسے لَا تَأْخُذْکُمْ بِہِمَا رَأْفَۃٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ۔ انبیاءِ کرام علیہم الصّلوٰۃ والسّلام کی طرف بھی اس کی اضافت ہوتی ہے۔ جیسے قُلْ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ شَکٍّ مِّنْ دِیْنِیْ۔ اور اُمّت کی طرف بھی۔ وُہ افراد آحاد ہوں یا مجموعِ اُمّت جیسے وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ حتّٰی کہ لفظ "دین" مجازی معنے میں کافر کی طرف بھی مضاف ہوتا ہے جیسے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ۔ اور لفظِ مِلّت ان انبیاء علیہم السّلام کی طرف مضاف ہوتا ہے جن کے ذریعے وہ احکامِ مشروعہ بندوں کو دیئے گئے جیسے مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰھِیْمَ۔ اُمّت کے آحاد اور افراد کی طرف اس کی اضافت نہیں ہوتی۔ مثلاً۔ مِلَّۃُ زَیْدٍ نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح مِلَّۃُ اللّٰہِ کی ترکیب بھی مستعمل نہیں[1]۔ رہا یہ شبہ کہ مِلّتِ باطلہ کے لئے بھی لفظِ مِلّت استعمال ہوتا ہے حدیث میں ہے۔ تَفْتَرِقُ اُمَّتِیْ عَلٰی ثَلٰثٍ وَّسَبْعِیْنَ مِلَّۃً۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ مِلّت کے اِستعمال میں جب وسعت پیدا ہو گئی تو مِلّتِ باطلہ کو بھی مجازاً مِلّت کہا

جانے لگا جیسے "اَنَکْفُرُ بِمِلَّۃٍ وَّاحِدَۃٍ؟"۔

مخفی نہ رہے کہ لفظِ شریعت۔ عقائد، اصُول و قواعدِ احکامِ شرعیہ اور احکامِ جزئیہ سب کو شامل ہے۔ اور لفظِ ملت سے وہ قواعد اور اصُول مُراد ہیں جن سے احکامِ شرعیہ جزئیہ مستنبط کیے جائیں۔ ہمارا ملت ابراہیمی کی اتباع کرنا احکامِ جزئیہ میں نہیں بلکہ اصُول اور قواعدِ احکامِ شرعیہ میں ہے۔ عقائدِ دینیہ کسی نبی کے زمانے میں مختلف نہیں ہوتے۔ نہ ان میں کبھی اختلاف ہو سکتا ہے کیونکہ وہ اصل دین ہیں اور تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہے۔

آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ملتِ ابراہیمی سے روگردانی کرنے والوں پر اِنکار فرمایا اور اُسے علم و عقل کے خلاف قرار دیا۔ یہ روگردانی بداھۃً بیوقوفی اور جہالت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "ملت ابراہیمی" اِسلام سے الگ کوئی چیز نہیں۔ "اَسْلِمْ" فرما کر اسی مِلّتِ ابراہیمی پر ثابت قدم رہنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو دیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی۔ "اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"۔ "رب العٰلمین" کے لئے میں نے گردن رکھ دی۔ یعنی اسلام پر استقامت اِختیار کی۔ معلوم ہوا کہ ملت ابراہیمی اسلام ہے۔ اسی لئے اس مِلّت کی اتباع کرنے والوں کا نام ابراہیم علیہ السلام نے "مسلمین" رکھا جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا۔ "ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ" یعنی اے مسلمانو! ابراہیم علیہ السلام نے تمہارا نام مُسلمان رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی دُعا میں "۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ" وارد ہُوا۔ یعنی اے اللہ! تو اپنے لئے ہمیں اسلام پر ثابت قدم رکھ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذُرّیت میں سے ایک "اُمّتِ مسلمہ" کی دُعا فرمائی۔ "اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ" یعنی اے اللہ! میری اولاد میں سے اپنے لئے مُسلمان اُمّت بنا دے۔

ان تمام آیات سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ ملّتِ ابراہیمی دینِ اسلام ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السّلام کے علمی و عملی کمالات و فضائل اور ان کے "اِمَامًا لِّلنَّاس" ہونے کے منصبِ عظیم کا ذکر فرمایا۔

اس آیتِ کریمہ میں ابراہیم علیہ السّلام کے وُہ فضائل و کمالات ہیں جن کا کوئی اسرائیلی یا قریشی منکر نہ تھا۔ سب ان کے قائل تھے اور عظمتِ ابراہیمی سب کے نزدیک حقیقتِ ثابتہ تھی۔ دونوں قومیں ابراہیم علیہ السّلام کی نسل سے تھیں۔ بنو اسرائیل یعقوب علیہ السّلام کی اولاد اور قریش، اسمٰعیل علیہ السّلام کی نسل سے تھے۔ اس طرح یہ دونوں قومیں ذُرّیتِ ابراہیم علیہ السلام سے تھیں اور نسبتِ ابراہیمی پر دونوں کو بڑا فخر تھا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دینِ اسلام کو "ملّتِ ابراہیمی" کے لفظ سے تعبیر فرمایا تاکہ یہ نسبت قریش اور بنو اسرائیل دونوں کے لئے دینِ اسلام کی طرف کمالِ رغبت اور کشش کا باعث ہو۔ اتمامِ حجت کے لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام کی طرف مائل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں فرمایا۔ مگر ابتداءً قریش کے چند خوش نصیب لوگوں مثلاً حضرت ابُوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی وغیرھم رضی اللہ عنہم اجمعین نے کمالِ خلوص اور محبت کے ساتھ اسے قبول کیا۔ یہ وہی لوگ تھے جن کا ذکر دُعاءِ ابراہیمی میں "اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ" کے الفاظ میں وارد ہے۔ دُعاءِ ابراہیمی "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا" کے مصداق عظمت والے رسُول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر اللہ کی آیتیں تلاوت فرمائیں، انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی۔ اور ان کے ظاہر و باطن کو پاک فرمایا۔ مگر افسوس ان صنادیدِ کفارِ قریش پر جنہوں نے ملّتِ ابراہیمی کو قبول کرنے کی بجائے اس کے خلاف اپنی تمام طاغوتی قوتوں کو جمع کر لیا اور اسلام دشمنی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اسی طرح بنو اسرائیل کے خوش قسمت لوگ جیسے حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ رضی اللہ عنہم اجمعین اسلام میں داخل ہوئے اور انہوں نے کمالِ رغبت و خلوص سے اسلام کو قبول کیا۔ لیکن بنو اسرائیل کے بڑے سرداروں بالخصوص

یہود نے ملتِ ابراہیمی یعنی اسلام کے خلاف اپنے وسائل کو جمع کر کے اسلام دشمنی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ حالانکہ نسبتِ ابراہیمی کے باعث ان سب کو بکمالِ رضا و رغبت ملتِ ابراہیمی کی اتباع کرنا تھی۔ اللہ تعالےٰ نے ان کی اس روگردانی پر اِنکارِ شدید کے ساتھ ان کی سخت مذمت فرمائی اور ان کے اس طرزِ عمل کو علم و عقل کے خلاف سفاہت و جہالت قرار دیا۔

اس آیتِ کریمہ کی شانِ نزول یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دو بھتیجوں سلمہ اور مہاجر کو اسلام کی دعوت دی اور فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں فرمایا کہ میں اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے ایک نبی بھیجوں گا جن کا نام "احمد" ہوگا۔ جو اُن پر ایمان لائے وہ ہدایت پر ہوگا اور نجات پائے گا۔ اور جو ان پر ایمان لانے سے انکار کرے وہ ملعون ہوگا۔ چنانچہ سلمہ ایمان لے آیا اور مہاجر نے ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ تب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔[1]

اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ : "سفہ" اصل میں خِفّت کو کہتے ہیں خفتِ نفس مستلزم ہے اہانتِ نفس اور اہلاکِ نفس کو۔ اور خفتِ رائے مستلزم ہے جہل کو۔ اِس لئے سَفِهَ نَفْسَهٗ بطور استعارہ اہانتِ نفس اور اہلاکِ نفس کے معنے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور "سَفِهَ نَفْسَهٗ"۔ "جَهِلَ نَفْسَهٗ" کے معنیٰ میں آتا ہے۔ یعنی وہ اپنے آپ سے جاہل ہو گیا۔ ابنِ کیسان اور زجاج نے کہا کہ یہاں "سَفِهَ نَفْسَهٗ" کے معنے ہیں جَهِلَ نَفْسَهٗ۔ کیونکہ غیر اللہ کی عبادت کرنے والا اللہ کو نہیں پہچانتا جو اس کا خالق ہے۔[2] اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقلِ سلیم اور علمی و عملی کمالات سے مزیّن فرمایا۔ اگر انسان اپنی عقلِ سلیم کو صحیح طور پر استعمال کرے تو ممکن نہیں کہ وہ حق و صداقت سے اعراض کر سکے۔ ملتِ ابراہیمی سے جو عین اسلام اور حق و صداقت کی رُوحِ رواں ہے روگردانی کرنے والا وہی ہو سکتا ہے جس نے اپنی علمی و عملی قوتوں کو ناکارہ بنا کر اپنے آپ کو احمق و بے وقوف

بنا لیا ہو۔ اور علم و عقل سے بیگانہ ہو کر وہ جاہل ہو کر رہ گیا ہو۔ یقیناً اس نے اپنے آپ کو ذلیل و خوار کیا اور وہ ہلاکت کے گڑھے میں جا گرا۔ نفسِ انسانی قدرتِ الٰہیہ کا عظیم شاہکار بلکہ حسنِ الوہیت کا آئینہ دار ہے۔ اس کی معرفت عین معرفتِ ربِ ذوالجلال ہے۔ عارفِ کامل حضرت یحییٰ بن معاذ متوفی ۲۵۸ھ کا مشہور مقولہ ہے۔ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ کم از کم وہ اپنے آپ کو اتنا ہی پہچان لے کہ میں واجب نہیں ممکن ہوں۔ میرا وجود و قیام اور بقاء میرے اختیار میں نہیں بلکہ واجب الوجود کے اختیار میں ہے۔ میں خود پیدا نہیں ہوا میرا خالق اللہ ہے۔ تب بھی اسے فی الجملہ رب تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے گی جس کے باعث وہ مظاہرِ کائنات کی عبادت اور شرک سے محفوظ رہے گا۔ ملتِ ابراہیمی کی اتباع کے لئے اللہ تعالیٰ کی اتنی معرفت بھی اس کے لئے کافی ہو گی۔

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا : قیامت تک آنے والے لوگوں کو جس ملت کی اتباع کا حکم دیا گیا اس کی عظمت و صداقت اور اس کے واجب القبول ہونے کو واضح فرمانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ابراہیم علیہ السلام کے برگزیدہ فرمانے، آخرت میں ان کے صالحین میں سے ہونے کا ذکر اہتمام کے ساتھ فرمایا۔ اور یہ اہتمام ملتِ ابراہیمی کی عظمت کو ظاہر فرمانے کے لئے کیا گیا۔ تاکہ یہ بات ذہن نشین ہو جائے کہ ایسی ملت سے روگردانی جاہل اور سفیہ کے سوا کسی سے متصور نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی برگزیدگی کا مفہوم یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے جن ظاہری، باطنی، روحانی و جسمانی کمالات سے متصف تھے وہ اس وقت کسی دوسرے میں نہیں پائے گئے۔

وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ : دنیا میں ان کے یہ کمالات و فضائل آخرت میں ان کے صالحین میں سے ہونے کو مستلزم ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام

کو چُن لیا۔ اُنہیں سب اِنسانی کمالات، رُوحانی فیوض و برکات اور نبوت و رسالت کے خصُوصیات سے متصف فرما کر امامتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز فرمایا۔ اور آخرت میں ان کے صالحین کاملین میں سے ہونے کی نصِ صریح فرمائی۔ اس کے بعد ان کی ملّت کا واجب الاتباع ہونا متعین ہو گیا۔ اب یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جاہل و سفیہ اور طاغی و باغی کے سوا کوئی شخص ان کی ملّت سے انحراف نہیں کر سکتا۔ اِس آیت کریمہ سے اِس حقیقت پر بھی روشنی پڑ گئی کہ دین کی عظمت، دین کے سربراہ سے وابستہ ہوتی ہے۔ جس دین کا سربراہ صاحبِ فضل و کمال نہ ہو اس دین میں کوئی فضیلت و عظمت نہیں پائی جاتی۔

اِذْ قَالَ لَهٗ

رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾

(یاد کیجئے) جب ان کے رب نے اُن سے فرمایا (اپنی) گردن میری طاعت میں رکھ کہا میں نے گردن رکھ دی تمام جہانوں کے رب کے لئے۔ ۱۱۷ھ

۱۱۷ھ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ الآیۃ: جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا۔ اے ابراہیم! اسلام پر استقامت اِختیار کیجئے تو اُنہوں نے عرض کی میں نے ربّ العٰلمین کے لئے اسلام پر استقامت اختیار کی۔ اور میں نے اپنے سب کام اللہ کے سپرد کر دیئے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اوّلِ امر سے اسلام پر ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں اَسْلِمْ سے اسی وقت اسلام لانا مُراد نہیں بلکہ اسلام پہ ثابت قدم رہنا مُراد ہے (خازن۔ جلد: ۱، ص ۸۵)

ابراہیم علیہ السلام کی استقامت اتنی محکم تھی کہ جب نارِ نمرود میں آپ کو ڈالا گیا تو جبریل علیہ السلام نے حاضر ہو کر عرض کی: "هَلْ لَكَ حَاجَةٌ؟" آپ کی کوئی حاجت

ہے ؟۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: "اَمَّا اِلَیْكَ فَلَا" اے جبریل! آپ کی طرف میری کوئی حاجت نہیں۔ جبریل علیہ السلام نے عرض کی۔ آپ اپنے رب سے اپنی حاجت کا سوال کریں۔ فرمایا! میرے سوال کے لئے یہی کافی ہے کہ میرا رب میرا حال جانتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے سب کام اللہ کے سپرد کر دیئے تو اس تفویض کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے نار کو گلزار کر دیا۔ اور "یٰنَارُ كُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِیْمَ" فرما کر ابراہیم علیہ السلام پر اس آگ کو ٹھنڈک اور سلامتی بنا دیا۔ (تفسیر مظہری۔ جلد ۱، ص ۱۳۳)

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ ؕ
یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّیْنَ
فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

اور اسی دین کی وصیت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے (بھی) کہ اے میرے بیٹو بے شک اللہ نے یہ دین تمہارے لئے چن لیا۔ پس تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔ ۱۱۸ھ

۱۱۸ھ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ : ابراہیم علیہ السلام نے اسی کلمۂ اخلاص یا ملّتِ حنیفیہ کی وصیت اپنے بیٹوں کو فرمائی۔ ابراہیم علیہ السلام کے آٹھ بیٹے تھے۔ ۱۔ اسمٰعیل۔ ۲۔ اسحٰق۔ ۳۔ مدین۔ ۴۔ مداین۔ ۵۔ نہشان۔ ۶۔ زمران۔ ۷۔ نشیق۔ ۸۔ شیوخ۔ (مؤرخین نے ان اسماء میں اختلاف کیا ہے کما فی المطولات)

ابراہیم علیہ السلام کی طرح یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنے بارہ بیٹوں کو یہی وصیت فرمائی۔ محی السنہ علاؤ الدین علی بن محمد نے ان کے نام حسب ذیل لکھے ہیں۔ ۱۔ روبیل۔ ۲۔ شمعون۔ ۳۔ لاوی۔ ۴۔ یہودا۔ ۵۔ ربالون۔ ۶۔ بشجر۔ ۷۔ دان۔ ۸۔ نفتالی۔ ۹۔ جاد۔ ۱۰۔ آشر۔ ۱۱۔ یوسف

۱۲۔ تبیان (خازن۔ جلد ۱۔ ص: ۸۵، طبع مصر)

یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّیْنَ۔ الآیۃ یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے دینِ اسلام کو چن لیا ہے لہذا تم اسی دین پر قائم رہو تاکہ جب بھی تمہیں موت آئے تمہارا خاتمہ اسلام ہی پر ہو۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تم ہمیشہ نیک گمان رکھو تاکہ اسی حسنِ ظن کی حالت میں تمہیں موت آئے۔ یا یہ کہ تم ہمیشہ ایمان اور اخلاص پر قائم رہو درانحالیکہ تمہارے سب کام اللہ کے سپرد کئے ہوئے ہوں تاکہ اسی حال میں تمہاری موت واقع ہو۔[۲]

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ
الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ
قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ
وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

کیا تم حاضر تھے؟۔ جب یعقوب کو موت آئی جب اُنہوں نے اپنے بیٹوں سے فرمایا میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟۔ اُنہوں نے کہا ہم عبادت کریں گے آپ کے معبود کی اور آپ کے باپ دادا ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق کے معبود، ایک معبود کی اور ہم سب اسی کے لئے (جھکنے والے) فرمانبردار ہیں۔ [۱۱۹]

---

۱۱۹ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ۔ الآیۃ: یہود کا دعویٰ تھا کہ یعقوب علیہ السلام نے وفات کے وقت اپنی اولاد کو دینِ یہود پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے

فرمایا۔ تمہارا دعویٰ غلط ہے۔ تم یا تمہارے اکابر یہود تو اس وقت حاضر ہی نہ تھے جب یعقوب علیہ السلام اپنی پوری نسل کو خالص عقیدۂ توحید پر ثابت قدم رہنے کے لئے بطورِ تاکید و توثیق اپنے بیٹوں سے فرما رہے تھے کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے بالاتفاق کہا کہ ہم اسی ایک معبودِ حقیقی کی عبادت کریں گے جو آپ کا اور آپ کے آباءِ کرام حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰق علیہم السلام کا معبودِ برحق ہے۔ توحیدِ خالص ہی دینِ اسلام اور ملتِ ابراہیمی کی رُوحِ رواں ہے۔

قریشِ مکہ اور یہودِ مدینہ دونوں نسلِ ابراہیمی پر فخر کرتے تھے۔ زبان سے ملتِ ابراہیمی کا اقرار کرنے کے باوجود اس سے منحرف اور ایمان و عمل کی دولت سے یکسر محروم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نسلِ ابراہیمی سے عظیم و جلیل فرزندِ جمیل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دینِ اسلام کی صورت میں ملتِ ابراہیمی کی رُوح عطا فرما کر مبعوث فرمایا۔ اور اس طرح تمام ادیانِ عالم پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو غالب فرما دیا۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٤﴾

وہ ایک اُمت ہے جو گزر چکی۔ اس کے لئے وہ ہے جو اس نے کیا اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے کیا اور ان کے کاموں کے بارے میں تم سے (کوئی) پُرسش نہ کی جائے گی۔[۱۲۰]

۱۲۰۔ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ : یہ ایک اُمت ہے جو گزر گئی۔ اُمت سے مُراد ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام اور ان کے بیٹے ہیں۔ اُمت، اصل میں مقصود کو کہتے ہیں۔ جماعت کو اُمت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ متفرق لوگ جمع ہونے کا قصد کرتے ہیں۔ اس لئے جماعت کو اُمت کہا گیا۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ. الآیۃ : ان کے تمام اعمالِ صالحہ انہیں کے نفع کے لئے ہیں. اگر تم چاہو کہ ان کے ساتھ تمہاری نسبت کا محض دعویٰ ان کی نیکیوں سے تمہیں کچھ نفع پہنچائے تو یہ تمہارا خیال خام ہے. جب تک اعتقاد و عمل میں تم ان کے ساتھ موافقت نہ کرو۔ تم مشرک ہو وہ موحد تھے۔ تم اللہ تعالیٰ کے نافرمان ہو وہ فرمانبردار تھے. ان کے لئے ان کے عمل ہیں اور تمہارے لئے تمہارے عمل. ان کے اعمال کے بارے میں تم سے کچھ نہ پوچھا جائے گا۔ اسی طرح تمہارے کسی کام کے متعلق ان سے کوئی سوال نہ ہوگا۔ بلکہ کسی سے بھی کسی دوسرے کے عمل کے متعلق پرسش نہ ہوگی. ہر شخص اپنے ہی عمل کی جواب دہی کرے گا۔

وَقَالُوا كُونُوا

هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ

حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٣٥﴾

اور (اہل کتاب) بولے یہودی یا نصرانی ہو جاؤ راہ پا جاؤ گے. آپ فرما دیجئے (نہیں) بلکہ (ہم نے اختیار کیا) طریقہ ابراہیم کا جو ہر باطل سے ہٹ کر حق پر قائم رہنے والے تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔ ۱۲۱ھ

۱۲۱ھ وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ۔ الآیۃ۔ : اس آیت کریمہ کی شانِ نزول میں بروایت سعید بن جبیر اور حضرت عکرمہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ ابن صوریا یہودی نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ ہدایت ہمارے دین میں منحصر ہے. آپ ہماری اتباع کریں۔ اسی طرح نصاریٰ نے بھی حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

سے یہی بات کہی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت نقل کی کہ مدینہ منورہ میں کعب بن اشرف، مالک بن صیف، وہب بن یہودا اور ابو یاسر بن اخطب روسائے یہود اور نصاریٰ نجران، السید اور العاقب اور ان کے ساتھیوں نے مسلمانوں کے ساتھ دین کے بارے میں مخاصمت کی اور دونوں فرقوں میں سے ہر ایک نے کہا کہ ہمارا دین ہی اللہ کا دین ہے۔ یہود بولے! ہمارے نبی موسیٰ ہیں جو افضل الانبیاء ہیں اور ہماری کتاب تورات ہے جو سب کتابوں سے افضل ہے اور ہمارا دین سب دینوں پر فضیلت رکھتا ہے۔ یہود نے عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل اور محمد عربی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کا انکار کیا۔ اور نصاریٰ نے کہا کہ ہمارے نبی عیسیٰ ہیں جو افضل الانبیاء ہیں اور ہماری کتاب انجیل ہے جو سب کتابوں سے افضل ہے اور ہمارا دین سب دینوں سے بہتر ہے۔ ان لوگوں نے بھی حضرت محمد عربی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کا انکار کیا۔ ہر فریق نے مسلمانوں سے یہی کہا کہ ہمارے دین پر آجاؤ کہ اس کے سوا اور کوئی دین نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى نازل فرمائی۔ یعنی یہود و نصاریٰ دونوں نے یہی کہا کہ اے مسلمانو! اگر تم ہدایت چاہتے ہو تو ہمارے دین پر آجاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا۔ الآیۃ: اے محبوب! فرما دیجئے۔ تم دونوں کا خود ساختہ دین، یہودیت اور نصرانیت خالص کفر و شرک ہے۔ جو ہرگز لائق اتباع نہیں۔ میں تو ملتِ ابراہیمی کا متبع ہوں جو اسلام ہے۔ ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے یعنی تمام ادیانِ باطلہ سے بیزار ہو کر صرف دینِ اسلام کی طرف مائل اور اسی پر استقامت پذیر تھے وہ ہرگز مشرک نہ تھے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا

بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ

وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى
وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ
بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

(مسلمانو) تم کہو ایمان لائے ہم اللہ پر اور جو کچھ ہماری طرف اُتارا گیا اور جو نازل ہوا ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر اور جو دیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو (دوسرے) نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے عطا ہوا۔ نہیں فرق کرتے ہم ان میں سے کسی کے درمیان (ایمان لانے میں) اور ہم اسی (رب) کے فرمانبردار ہیں۔[۱۳۳]

۱۳۲؎ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ۔ الآیۃ: اے مسلمانو! یہود و نصاریٰ سے تم صاف کہہ دو کہ ہم تو اللہ پر ایمان لائے اور اللہ کے اس کلام پر جو ہماری طرف نازل ہوا اور ان سب صحائف اور تعلیماتِ الٰہیہ پر جنہیں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر نازل فرمایا۔ تفسیر مظہری میں ہے۔ دس صحیفے ابراہیم علیہ السلام پر نازل کئے گئے جن کے مطابق ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے بیٹوں اور پوتوں نے عبادت کی اور ان کے احکام پر عمل پیرا رہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے بیٹوں اور پوتوں کی طرف ان کے نازل کرنے کی نسبت اِسی طرح فرمائی جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں "وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا" فرما کر ہماری طرف قرآن مجید نازل کرنے کی نسبت فرمائی گئی۔

یہود و نصاریٰ تمہارے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن پر ایمان لائیں یا نہ لائیں تم ان سے کہہ دو کہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام اور اللہ کے باقی نبیوں کو جو کچھ بھی اللہ کی طرف سے دیا گیا ہم سب پر ایمان لائے۔ ہم تمہاری طرح ان میں سے کسی کے درمیان تفریق

نہیں کرتے جیسا کہ تم کسی نبی پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہو اور کسی کے ساتھ کفر کرتے ہو۔ اسی طرح آسمانی کتابوں میں سے کسی کو مانتے ہو کسی کا انکار کرتے ہو، ہم ایسا نہیں کرتے۔ اللہ کے سب نبیوں پر ہمارا ایمان ہے جن میں موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام بھی شامل ہیں۔ اور اللہ کی سب کتابوں کی ہم تصدیق کرتے ہیں۔ ہم تورات پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور انجیل پر بھی۔ ہم اللہ ہی کے لیے اپنی گردنیں رکھنے والے اور اُسی کے لیے اپنا سر جھکانے والے ہیں۔ اسی لیے ہم اس کے ہر نبی اور اس کی ہر کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾

پھر اگر وہ ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے تو بیشک اُنہوں نے راہ پائی اور اگر وہ منہ پھیریں تو (سمجھ لیجئے کہ) وہ صرف ضد میں (پڑے ہوئے) ہیں۔ تو (اے حبیب) عنقریب ان (کے شر) سے (بچانے میں) اللہ آپ کے لیے کافی ہوگا اور وہ بہت سُننے والا خُوب جاننے والا ہے۔

اس آیت شریفہ میں مؤمنین سے ارشاد ہوا کہ جس طرح تم اللہ کی وحدانیت اور دیگر تمام عقائد پر اخلاصِ نیت کے ساتھ ایمان لائے ہو۔ اگر اہلِ کتاب بھی اسی طرح لائیں تو ہدایت پا جائیں گے۔ بصورتِ دیگر نہ تو وہ ہدایت یافتہ ہوں گے اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کچھ بگاڑ سکیں گے کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کے لیے کافی ہے۔

اِس بیان سے معلوم ہُوا کہ کوئی شخص کسی مذہب یا فرقہ سے متعلق ہو جب تک بدعقیدگی بے راہ روی اور نفاق سے اجتناب کرتے ہُوئے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسُولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہ لائے ہدایت یافتہ نہیں ہو گا۔

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰه : اللہ تعالیٰ نے حضُور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت و نگہبانی اپنے ذمہ کرم پر لی اور فرمایا اللہ تعالیٰ آپ کو اُن سے محفُوظ رکھے گا۔ واضح رہے کہ مکمل حفاظت دشمن کی حرکات و سکنات اور تدبیر کے علم کے بغیر نہیں ہوتی اور ربّ العٰلمین نے وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ فرما کر اُنہیں آگاہ کر دیا کہ ان کی کوئی خُفیہ تدبیر اُس سے پوشیدہ نہیں۔ اِس بات کا اظہار سورۃ انفال میں اِس طرح فرمایا۔

"يَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ! وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ؕ" اور وہ اپنے مکر میں لگے ہُوئے تھے اور اللہ! اپنی خفیہ تدبیر فرما رہا تھا۔

حضُورِ اکرم نُورِ مجسّم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نصرتِ خداوندی اور حفاظتِ الٰہیہ کا روزِ اوّل سے یقین تھا اس حفاظت کا اظہار وقتاً فوقتاً مختلف آیات سے ہوتا رہا۔ ملاحظہ ہو۔

"فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ۔" تو (اے حبیب) عنقریب ان (کے شر) سے (بچانے میں) اللہ تعالیٰ آپ کے لئے کافی ہو گا۔ البقرہ۔ آیت: ۱۳۷

"اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ" اگر تُم نے رسُول کی مدد نہیں کی تو بے شک اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی۔ التوبہ۔ آیت: ۴۰

"اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ" کیا اللہ اپنے بندے کو کافی نہیں

"وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" اور اللہ! آپ کو لوگوں سے بچائے گا۔

مفسّرین کرام نے فرمایا حفاظت و نگہبانی کی آیات کا مفہوم یہ ہے کہ حضُور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کوئی شخص غالب نہ آسکے گا۔ یعنی قتل نہ کر سکے گا۔ رہا ایذاء

اور تکالیف کا پہنچنا، تو یہ ان آیات کے منافی نہیں۔

چونکہ آیتِ کریمہ "وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ" میں لفظ "اَلنَّاس" اپنے عموم پر ہے یعنی یہود و نصاریٰ کافر و مشرک وغیرہ تمام کے شر سے حفاظت کا ذمہ لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیتِ مذکورہ کے نزول کے بعد اپنے لئے حفاظتی انتظامات ختم کرنے کا حکم جاری فرما دیا۔ رہا یہ سوال کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب پہلے سے اللہ تعالیٰ کی نگہبانی کا یقین تھا تو پہرے داروں کی تقرری کیوں فرمائی گئی؟۔

اس بارے میں عرض ہے کہ جب تک صراحتاً فرمانِ الٰہی نہ آجائے اُس وقت تک تدابیر اختیار کرنا مصلحت کے خلاف نہیں اور اس میں یہ حکمت بھی تھی کہ قیامت تک قیادت کے منصب پر فائز ہونے والوں کے لئے بوقتِ ضرورت حفاظتی انتظام کرنا سُنّت قرار پا جائے

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ

صِبْغَةً ۖ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

(کہو ہم نے لیا) رنگ اللہ کا (اس کا دین) اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ بہتر ہے؟۔ اور ہم اُسی کی عبادت کرتے ہیں۔

شانِ نزول: نصرانی اپنے بچے کی پیدائش کے ساتویں دن اُسے ایسے پانی سے رنگتے جسے وُہ "معمودیہ" کہتے تھے۔ یہ اُن کے عقیدہ کے مطابق "اَب" یعنی اللہ تعالیٰ "ابن" یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور "روح القدس" یعنی جبرائیل علیہ السلام کے نام پر تیار کیا

جاتا تھا۔ یہ پانی دینِ مسیحی کے اوّلیں اسرار میں سے اور نصرانیت میں داخلہ کے لئے دروازہ کی حیثیت رکھتا ہے اُردو زبان میں اسے "بپتسمہ" کہتے ہیں۔ ان کا بچے کو رنگنا اس کے ختنہ کی بجائے ہوا کرتا تھا۔ اور گمان کرتے کہ اب بچے سے ناپاکی و آلائش دُور ہوگئی۔ اور یہ سچا نصرانی ہوگیا۔ تو اللہ نے آیت صِبْغَةَ اللّٰهِ الخ نازل فرما کر اس بات کا اظہار کیا کہ اِس رنگ کی کوئی حقیقت نہیں کیوں کہ رنگ تو دراصل اللہ کا رنگ ہے یعنی دینِ اسلام۔ اور اِس سے بہتر کوئی رنگ نہیں۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ : اگرچہ اس میں کئی اقوال ہیں مثلاً "دِینُ اللّٰہ" "فِطْرَةُ اللّٰہ" "مِلَّةُ اِبْرَاهِیْمَ" "تَطْهِیْرُ اللّٰہ" وغیرہ۔ مگر ان تمام معانی سے مُراد اللہ کا دین ہے۔ دین کو "صبغۃ" سے تعبیر فرما کر اس بات کا اظہار کیا گیا ہے کہ جس طرح کوئی چیز رنگے جانے کے بعد بھلی معلوم ہوتی ہے اِسی طرح جب انسان اللہ کے دین میں داخل ہو کر اُس کے احکام پر مکمل طور پر عمل پیرا ہوتا ہے اور اس پر اسلام کا رنگ چڑھ جاتا ہے تو اُس سے پاکیزگی اور طہارت کا اثر ظاہر ہونے لگتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ" سجدوں کے اثر سے ان کی نشانی اُن کے چہروں میں ہے اور حدیث شریف میں ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ اِنِّیْ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اُمَّتِیْ یُدْعَوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ غُرًّا مُّحَجَّلِیْنَ مِنْ اٰثَارِ الْوُضُوْءِ فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ اَنْ یُّطِیْلَ غُرَّتَهٗ فَلْیَفْعَلْ۔

ترجمہ: حضرت ابُو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے نبی معظّم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو فرماتے ہُوئے سُنا کہ قیامت کے روز میری اُمّت (کے اعضاء وضو) وضو کرنے کی وجہ سے روشن ہوں گے (اسی بنا پر) وہ "غُرًّا مُّحَجَّلِیْنَ" کہہ کر پکارے

جائیں گے۔ تُم میں سے جو شخص اپنی چمک کو (جتنا) زیادہ کر سکتا ہے۔ ضرور کرے۔
(بخاری۔ ص: ۲۵، ج: ۱ ، مُسلم۔ ص: ۱۲۶، ج: ۱)

صِبْغَتَ اللّٰهِ کا منصُوب ہونا بتقدیر امنا باللہ ہے یا بر بنائے "اغراء"
"اغراء" ترغیب دلانے کو کہتے ہیں۔ یعنی اللہ کے دین کی طرف ترغیب دلائی جا رہی ہے۔ جس طرح کہ جہاد اور نماز کی رغبت دلانے کے لئے منصوب پڑھتے ہُوئے کہا جاتا ہے۔ اَلْجِهَادَ، اَلْجِهَادَ ، اَلصَّلٰوةَ، اَلصَّلٰوةَ۔

"نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ": سے پہلے قُوْلُوْا مقدّر ہے یعنی تُم یہ کہہ دو کہ ہم تو اُس ربّ العٰلمین کے عبادت گزار رہیں گے جس کا رنگ ہم پر غالب ہے اور جس کے رنگ سے بہتر کوئی رنگ نہیں۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

فرما دیجئے کیا تُم جھگڑتے ہو ہم سے اللہ کے بارے میں۔ حالانکہ وہی ہے رب ہمارا اور رب تمہارا۔ اور ہمارے لئے ہمارے عمل ہیں اور تمہارے لئے تمہارے عمل۔ اور ہم اُسی کے لئے مُخلص ہیں۔

تشریح: جب یہُود و نصاریٰ نے حضُور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام سے کہا کہ ہم تو اللہ کے مقرب اور اُس کے محبُوب ہیں۔ ہماری کتاب پہلی اور ہمارا قبلہ قدیمی ہے۔ ہم

آپ کی نسبت اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہیں۔ انبیاء علیہم السلام ہم میں سے ہوئے وہ ہمارے ہی دین پر تھے۔ کوئی نبی عرب سے نہیں ہوا۔ اگر آپ نبی ہوتے تو ہم میں سے ہوتے۔ اور ہمارے دین کی ترویج کرتے۔ تو آیت کریمہ نازل ہوئی۔ کہ تم ہم سے اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے بارے میں جھگڑتے ہو۔ جب کہ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ انتہی۔ اور جب وہ سب کا پروردگار ہے تو اُس کی مرضی جسے چاہے نبوت کے لئے چُن لے۔ لہٰذا تمہارا نبوت کو اپنے لئے خاص کر لینا ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔

نیز یہود و نصاریٰ نے اپنے جھگڑے کو دلیل اور حجت کے رنگ میں پیش کیا۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ نے "اَتُحَاۤجُّوْنَنَا" کی بجائے "اَتُحَاۤجُّوْنَنَا" ارشاد فرمایا۔

وَلَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ : کیونکہ نبوت بنی اسرائیل کے ساتھ خاص نہیں اور نہ ہی اس میں کسی قبیلہ کی تخصیص ہے۔ بلکہ نبی کے ذریعے احکام الٰہی کی تبلیغ مقصود ہے۔ اِس لئے اے یہود و نصاریٰ اگر تم بحکم الٰہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لائے تو راہِ ہدایت پاؤ گے۔ لیکن اگر اپنی ہٹ دھرمی پر قائم اور کج بحثی میں پڑے رہے تو وَلَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ہمارے لئے ہمارے عمل اور تمہارے لئے تمہارے عمل۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ
اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا
اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ

ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام توحید کے علمبردار ایک ہی دین، دینِ اسلام پر تھے چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" بے شک اللہ کے نزدیک اسلام ہی دین ہے۔

تمام انبیاء کرام دینِ اسلام ہی لے کر آئے جو فی الحقیقت دینِ فطرت ہے۔ ہاں بعض انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اسے علیحدہ دین سے تعبیر کرنا قطعاً باطل ہوگا۔ احکامِ شرعیہ میں یہ اختلاف اِنسانی فکری تہذیبی ارتقاء اور زمانہ و ماحول کے تقاضوں اور بعض حکمتوں کی بنا پر تھا۔ جو دینِ فطرت یعنی اسلام کی رُوح کے عین مطابق ہے

قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰہُ" فرما دیجئے تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ" یہ فرمان یہود و نصاریٰ پر کس طرح حجت ہو سکتا ہے جب کہ وہ قرآن مجید کو کلامِ الٰہی نہیں مانتے۔ اِس بارے میں گزارش ہے کہ یہود و نصاریٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میں وہ تمام علامات دیکھ لیں تھیں جو آخری نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں درج تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی تصدیق بھی بعض راہبوں نے کی تھی۔ جیسا کہ بخاری میں ورقہ بن نوفل کی تصدیق موجود ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ارشاد فرمایا کہ "یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ" وہ اس نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ایسا پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہود و نصاریٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت سے آگاہ تھے مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بنی اسرائیل میں سے نہ ہونے کی بنا پر آپ سے بغض و عناد رکھتے ہوئے آپ پر ایمان نہ لائے۔ اِسی لیئے وہ قرآنِ مجید کو کلامِ الٰہی جاننے کے باوجود اس پر بھی ایمان نہ لائے۔ اِس بنا پر فرمانِ باری تعالیٰ "ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰہُ" ان پر حجت ہوا۔ قبول کرنا یا نہ کرنا اُن کا اپنا فعل ہے۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ
وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْـَٔلُونَ
عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤١﴾ ع

وہ ایک اُمت ہے جو گزر گئی اُس کے لیے وہ ہے جو اُس نے کیا اور تمہارے لیے وہ ہے جو تم نے کیا اور اُن کے کسی کام کے متعلق تم سے سوال نہ کیا جائے گا۔

اِس آیت کو تاکیداً مکرر لایا گیا۔ جس کی تفسیر ہو چکی ہے۔ مزید برآں اس بارے میں یہ ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے کوئی کسی کے عمل میں ماخوذ نہ ہوگا۔

عرب میں یہ دستور تھا کہ بیٹا باپ کے بجائے اور باپ بیٹے کے بجائے دیندار ہوا کرتا تھا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔ حضرت ابو رمثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں اپنے بیٹے کے ساتھ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا "یہ آپ کا بیٹا ہے؟" تو میں نے عرض کی جی ہاں! میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ یہ میرا بیٹا ہے (حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جان گئے کہ یہ گواہی جاہلیت کے دستور کے مطابق ہے کہ بیٹا باپ کے اور باپ بیٹے کے جرم میں ماخوذ ہوتا ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا اُس کے گناہ اور قصور کا آپ پر بدلہ نہیں اور نہ آپ کے جرم کا اس پر کچھ ہے (انتہیٰ) (شمائل ترمذی ص: ۵۸) (باب ماجاء فی خضاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اس بات کا بیان آیت کریمہ۔
لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى (کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا) میں ہوا۔

عمل کا فائدہ

قرآن وحدیث سے واضح ہو چکا کہ کسی کو دُوسرے کے عمل میں سے حصّہ نہیں دیا جائے گا۔ ہاں یہ بات ممکن ہے کہ ایک کے عمل سے دُوسرے کو فائدہ یا نقصان پہنچ جائے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ۔

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان میں ان کی پیروی کی اُن کی اولاد کو ہم اُن کے ساتھ تو ملا دیں گے اور اُن کے عمل میں سے کوئی کمی بھی نہیں کریں گے

مذکورہ آیت میں ایمان والوں کے عمل سے اُن کی مؤمن اولاد کو فائدہ پہنچنے کا بیان ہے۔ نیز "وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ" (اور ان کے عمل میں کوئی کمی نہیں کریں گے) سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مؤمن اولاد اپنے والدین کے عمل میں حصّہ دار نہیں ہو گی۔ ہاں اُسے اُن کے عمل کا فائدہ ضرور پہنچے گا جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام نے دو یتیم بچوں کے خزانے کی حفاظت اس بنا پر فرمائی کہ "كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا" ان دونوں کا باپ نیک تھا۔ یعنی باپ کی نیکی کا فائدہ اولاد کو ہوا۔ اور اسی طرح حدیث مبارک ہے۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ مَنْ سَنَّ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهٗ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْقُصَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْءٌ وَمَنْ سَنَّ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْقُصَ مِنْ اَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ نکالا اُسے اس کا اجر ملے گا۔ اور اس شخص کا اجر بھی اُسے ملے گا جس نے بعد میں اس پر عمل کیا بغیر اس کے کہ دُوسرے شخص کے اجر میں کمی کی جائے۔ اور جس نے اسلام میں

کوئی بُرا طریقہ نکالا تو اُس پر اس کا گناہ ہوگا اور اُس شخص کا گُناہ بھی اُسے ملیگا جس نے بعد میں وہ بُرا کام کیا۔ ہاں دُوسرے شخص کے گُناہ میں کُچھ کمی نہ آئے گی۔

اِس حدیث مُبارک میں بھی کسی کے عمل سے دُوسرے کو فائدہ یا نُقصان پہنچنے کا ذکر نہیں ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی شخص کسی کے عمل میں سے حصّہ پائے گا۔ اِسی لیئے ارشاد ہُوا کہ دُوسرے بندے کی نیکی یا بدی میں کمی واقع نہیں ہوگی۔ لیکن اِس کے باوجُود پہلے شخص کو دُوسرے کے مساوی اجر بھی ملے گا۔ شخص اوّل کے گناہ یا ثواب میں زیادتی کی وجہ یہ ہے کہ وُہ اس کا بانی مبانی اور اُسے رائج کرنے والا ہے۔ اگر اس شخص سے بناء اور رواج کی نسبت منقطع کر دی جائے تو وہ اس ضمن میں نہیں آئے گا۔